بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب ایک مکمل دوست کا درجہ رکھتی ہے
اس کے احترام کا خیال رکھیے

ISBN: 978 969 7430

زیرِ مطالعہ کتاب نقاد و شاعر شبیر ناقِدؔ کے ایما پر شائع کی گئی ہے اور اس کے جملہ حقوق اور متن کی تمام تر ذمہ داری انہی کو مستحسن ہے۔ پبلشر یا پرنٹر قطعاً ذمہ دار نہیں۔ ادارہ اردو سخن ڈاٹ کام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قارئین تک بہترین اور اغلاط سے پاک ادبی مواد پہنچایا جائے اور اس ضمن میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لایا جاتا ہے تاہم غلطی کی نشاندہی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی درستی کی جائے۔ (ادارہ)

(تنقید و تحقیق)

شاہدہ لطیف کا تخلیقی ارتقا

(تحقیقی و تنقیدی تجزیاتی مطالعہ)

شبیر ناقدؔ

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون:0302-7844094

www.urdusukhan.com

شاہدہ لطیف کا تخلیقی ارتقا

شبیر ناقدؔ
معرفت پروفیسر ظہور احمد فاتح، بزد تعمیرِ نو اکیڈمی
کالج روڈ، تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازیخان (پنجاب۔ پاکستان)
رابطہ فون: 0333-5066967 0303-9297131 0342-5237636

اُردو سخن

استحقاق: تمام تصرفات ''شبیر ناقِدؔ'' کی تحویل میں ہیں
ناشر: اردو سخن ڈاٹ کام، پاکستان
نمودِ اول: جنوری ۲۰۲۳ء

کمپوزنگ: محمد شہریار ناصر
سرورق: ناصر ملک
طباعت: شیرِ ربانی پریس، ملتان
قیمت: 1200 روپے (50 یورو، 55 ڈالر)

اردو سخن
آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094
www.urdusukhan.com

متاعِ حرف کو ارزاں نہیں کیا ہم نے
کوئی بھی حرف کبھی رائیگاں نہیں لائے

(شاہدہ لطیف)

انتساب

شاہدہ لطیف کے جذبہء حب الوطنی کے نام!

فہرست

شاہدہ لطیف کا سخن حمد نگاری کے تناظر میں	8
شاہدہ لطیف کے کلام کے نعتیہ آفاق و اعماق	23
شاہدہ لطیف کی ملی شاعری	38
شاہدہ لطیف کے منظوم سفر نامہ ''بیت اللہ پر دستک'' کا تجزیاتی مطالعہ	47
شاہدہ لطیف اور کشمیریات	56
شاہدہ لطیف کی شاعری کا رومانوی افق	76
شاہدہ لطیف کا سخن سماجی ادراکات کے آئینے میں	85
شاہدہ لطیف کا تصورِ غم	93
شاہدہ لطیف کے سخن میں استفہامیہ اشارات	101
شاہدہ لطیف کا دعائیہ طرزِ کلام	108
شاہدہ لطیف اور آشوبِ عصر	114
شاہدہ لطیف کا رجائیت آمیز سخن	121
شاہدہ لطیف کی حب الوطنی	129
''برف کی شہزادی'' ایک بھرپور عمرانی حوالہ	144
شاہدہ لطیف ایک انسان دوست شاعرہ	162

منظوم سفر نامہ ”اف یہ برطانیہ“ اور برطانوی معاشرت 167
شاہدؔہ لطیف کا نظریہ ادب برائے زندگی 180
شاہدؔہ لطیف اور عصری رویے 193
شاہدؔہ لطیف کا عمومیت آمیز سخن 202
شاہدؔہ لطیف دائیں بازو کی شاعرہ 213
شاہدؔہ لطیف اور نفسیاتی اثرات 221
شاہدؔہ لطیف اور جمالیاتی احساسات 231
شاہدؔہ لطیف کی قومی شاعری 242
شاہدؔہ لطیف احساسِ طرب کے آئینے میں 256
شاہدؔہ لطیف اور خارجی عوامل 266
شاہدؔہ لطیف کے سخن کا تعلیاتی تناظر 282
شاہدؔہ لطیف اور مزاحمتی افکار 299
شاہدؔہ لطیف اور تنقیدی رویے 310
شاہدؔہ لطیف، جواں جذبوں کی شاعرہ 325
شاہدؔہ لطیف کی زمانہ شناسی 333
شاہدؔہ لطیف کا ادراکِ ذات 343
شاہدؔہ لطیف اور داخلی کیفیات 355
شاہدؔہ لطیف کا فروغِ مقصدیت 369
شاہدؔہ لطیف کی غزل کے فکری امکانات 394
شاہدؔہ لطیف کا پندارِ انا 415
شاہدؔہ لطیف کا شعری بیانیہ 426

شاہدہ لطیف کا سخن حمد نگاری کے تناظر میں

خدائے بزرگ و برتر نے اس عالمِ آب و گل کی موجودات و معدومات کو خلق فرمایا اور حضرتِ انسان کو اشرف المخلوقات کے شرف سے نوازا جسے شہزادۂ کائنات ہونے کا افتخار حاصل ہے، جو اس کے مکرم ہونے کی دلیل بھی ہے۔ اس نے اپنی ہر مخلوق کو کچھ خصوصیات بھی ودیعت فرمائیں اور یہ خصائص اس کی مقصدیت سے مربوط ہیں جن میں انفرادیت بھی ہے اور قدرِ اشتراک کا پہلو بھی ہے جسے اس کی قدرتِ کاملہ کی کرشمہ کاری اور نادرہ کاری کی دلیل بھی کہا جاسکتا ہے۔ بنی نوع انسان کو عطا ہونے والا نطق و بیان بھی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ قرآن مجید میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے خلق فرمایا۔ اس فرمانِ حق سے مشیتِ ایزدی کا اظہار ہوتا ہے اور مقصدِ حیات بھی واضح ہوجاتا ہے۔ عبادات کی مختلف النوع اقسام ہیں۔ کچھ مالی ہیں، کچھ بدنی ہیں، کچھ ظاہری ہیں اور کچھ باطنی ہیں۔ لیکن فرمانِ خدا ہر نوع کی عبادات پر محیط ہے یعنی اس میں ایک طرح کی ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ عباداتِ ایزدی میں ذکر و فکر بھی شامل ہے اور تحمید و تمجید بھی ان کا حصہ ہے۔

اقلیمِ سخن میں مختلف قسم کی اصنافِ شعر پائی جاتی ہیں۔ ایسی صنفِ سخن جو خدائے بزرگ و برتر کی تعریف و توصیف کی حامل ہو، حمد کہلاتی ہے۔ اردو شعر و ادب میں حمد نگاری کی بسیط و عریض ایک عمدہ روایت موجود ہے جس میں روز بروز بتدریج اضافہ ہو رہا ہے جس کا ہیئتی کینوس بھی بہت وسیع ہے۔ یعنی حمد کسی بھی صنفِ سخن میں کہی جاسکتی ہے۔ گویا حمد نگاری ایک بابرکت صنفِ سخن ہے جو شعریات کے کلاسیکی دور اور نیو کلاسیکی دور نیز عہدِ موجود میں بھی شاندار روایت کی امین ہے۔

اس کے اسباب وعلل میں جہاں تقدس کے تلازمات شامل ہیں، وہاں اس کے فکری کینوس کی وسعت بھی ہے۔اس اعلیٰ وارفع روایت کو نہ صرف مسلم شعرانے آگے بڑھایا بلکہ غیر مسلم شعرانے بھی مقدور بھر کردار ادا کیا ہے۔اس کے فروغ میں فکری وفنی آفاق واعماق کا کلیدی حصہ ہے۔

حمد نگاری کی روایت کو استحکام بخشنے میں جہاں طبقہء ذکور نے اپنی کشیدِ جاں لٹائی، وہاں معشر اناث بھی کہیں پیچھے نہیں رہا۔شعرا کے ساتھ ساتھ شاعرات نے بھی شانہ بشانہ کام کیا۔بنتِ حوا کا یہ آفاقی وصف ہے کہ اس میں حساسیت زیادہ ہوتی ہے اور یہی حساسیت اس پر فکری امکانات کے ابواب وا کرتی ہے۔جس کی بدولت اس کی فکر میں گہرائی وگیرائی در آتی ہے۔اس کے ساتھ نفسیاتی عوامل بھی ہم آغوش ہوجاتے ہیں۔جس سے فکری ترفع کی نمو ہوتی ہے۔شذرہ ھذا میں ہم ایک نابغہء روزگار شاعرہ شاہدؔہ لطیف کی حمد نگاری کے تناظر میں رقم طراز ہیں جنھیں نظم ونثر دونوں میں کمال دسترس حاصل ہے جو ایک معروف علمی وادبی اور صحافتی شخصیت ہیں۔کھیلوں کی دنیا کا شوق وشغف بھی رکھتی ہیں۔حالاتِ حاضرہ کا درک بھی انہیں حاصل ہے۔جنہوں نے ناول بھی لکھے،منظوم سفر نامہ نگاری بھی کی ہے،جن کی صحافتی وتاریخی اور نصابی نوعیت کی تصانیف بھی ہیں۔ انہوں نے عالمی سطح پر پاکستانیت کے تشخص کو اجاگر کرنے کی سعیِ مندوب بھی کی ہے جو حب الوطنی کا ایک جیتا جاگتا استعارہ بھی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں جہاں کہیں بھی ان کی تصویر نظر آئی،اس کے پسِ منظر میں سبز ہلالی پرچم بھی نظر آیا۔وہ بجا طور پر دخترِ وطن ہونے کی قابلِ قدر حیثیت رکھتی ہیں۔جنہوں نے تاریخی حوالے سے بابائے قوم کی نسبت سے ایک تاریخی ودستاویزی تصنیف ''قائداعظم محمد علی جناح'' مطبوعہ 14 اگست 2019ء رقم کی ہے۔ہمیں یہ کہنے میں کسی نوع کا کوئی باک نہیں ہے کہ انہیں اپنے اسلاف سے بے انتہا محبت ہے۔یہی سبب ہے کہ تصنیف ھذا کا انتساب ان کے جذبہء حب الوطنی کے نام کیا گیا ہے۔جن کا اپنے اہلِ وطن سے محبت کا جذبہ بے پایاں ہے۔وہ پاکستان اور اہلِ پاکستان سے بے پناہ موانست رکھتی ہیں۔اوورسیز پاکستانیوں کے لیے ماہنامہ ''اوورسیز انٹرنیشنل'' (1992ء تا 2014ء) کی بائیس سالہ صحافتی خدمات بھی ہیں۔ان کے انہی کارہائے نمایاں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے حکومت اسلامی جمہوریہ

پاکستان نے انہیں 1913ء میں صدارتی اعزاز حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ اس لیے شاہدہ لطیف نہ صرف اسلام آباد میں مقیم ایک شاعرہ ہیں بلکہ حب الوطنی کی ایک پرجوش تحریک ہیں۔ ایسی ہی بناتِ قوم کا دم ہمیشہ غنیمت ہوا کرتا ہے۔

شاہدہ لطیف کی حمد نگاری کے حوالے سے ان کی دستیاب کردہ تصانیف سے استفادہ کیا جائے گا اور شعری استشہادات کو مکمل تجزیاتی حاشیہ آرائی کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ ان کی تصانیف بلحاظ زمانی ترتیب شامل کی جائیں گی۔ ان کا حمدیہ کینوس بہت وسیع ہے۔ مثلاً ان کا منظوم سفرنامہ ''بیت اللہ پر دستک'' مطبوعہ اکتوبر 2012ء سراپا حمد نگاری ہے لیکن شذرہ ھذا میں ان کی تصانیف میں شامل وہ حمدیات شاملِ شذرہ ہوں گی جو حمد کے سرنامہ کے تحت مندرجات کا حصہ ہیں۔ دیگر عنوانات کے تحت آنے والی حمدیات کسی اور فکری تناظر کا حصہ بنیں گی۔

اب ان کے اولین شعری مجموعہ ''معجزہ'' مطبوعہ ستمبر 2018ء میں موجود حمد نگاری کی نسبت سے بات چلاتے ہیں۔ مجموعہ ھذا کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک اس کے پانچ ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اس کی طباعت ماورا پبلی کیشنز لاہور کی کارکردگی کا عمدہ مظہر ہے۔ اس مجموعہء کلام پر پروفیسر فتح محمد ملک، شبنم شکیل، افتخار عارف، محسن بھوپالی اور ناصر زیدی کی آرا ثبت ہیں جس سے یہ اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں ہے کہ اربابِ نقد و شعر کی نظر میں فکری و فنی حوالوں سے شاہدہ لطیف کو کیا قدر و منزلت حاصل ہے۔ ان کے فکری ترفع اور بالیدگی کا تعین اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ کتاب ھذا میں سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ کو شامل کیا گیا ہے۔ بعد ازاں نعت کو جگہ دی گئی ہے۔ پھر منقبتِ حسین ابن علیؑ ہے۔ آخر میں پاکستانیت کے عنوان سے ایک آزاد نظم ہے۔ گویا ان کے ہاں مذہبی و ملی اور قومی تناظرات پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ یہی فکری تثلیث ان کے تمام فکر و فن پر محیط نظر آتی ہے۔ ان کی مذکورہ کتابِ شعر میں صرف ایک حمد شامل ہے جو ہدیہء قارئین کی جاتی ہے۔

تیرے سوا کچھ بھی نہیں
میرے خدا! کچھ بھی نہیں

مجھ کو نہیں اب چاہیے
ارض و سما کچھ بھی نہیں
تیرے سوا کچھ بھی نہیں

کیا دوستی کیا دشمنی؟
کیا زندگی کیا بندگی؟
کیا تیرگی کیا روشنی؟
جلوہ نما کچھ بھی نہیں
تیرے سوا کچھ بھی نہیں

یہ شاعری، فہم و ذکا
یہ رات دن کا فلسفہ
پڑھنا ہے کیا، لکھنا ہے کیا؟
یہ شاہدؔہ کچھ بھی نہیں
تیرے سوا کچھ بھی نہیں

(ص:19)

اگر ہیئتی حوالے سے بات کی جائے تو حمد ھذا مخمس ہے جس میں پانچویں مصرع کی حیثیت ٹیپ کے مصرع کی ہے۔ ایک فکری تسلسل کی عکاسی ہے۔ حمد کی فکریات کو باہم جوڑنے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ جس نے مختلف النوع فکری تلازمات کو باہم مربوط کر دیا ہے۔ حمد کے پہلے بند میں تصوف کا فلسفہ ''ہمہ اوست'' کارفرما ہے۔ اندازِ بیاں میں قطعیت کارگر ہے جس میں معروضیت بھی ہے اور معقولیت و منطقیت بھی ہے۔ اسلوب انتہائی شستہ، سہل اور رواں دواں ہے۔ گویا سہل نگاری کی روایت کو فروغ بخشا گیا ہے جو ہر نوع کے قاری کی ذہنی سطح کے قریب تر

ہے جس میں وسیع تر اکتسابِ فیض کیا گیا ہے۔ لایعنیت اور تصنع کی آلائشیں مفقود ہیں۔ جس سے ہیں ان کی مدعا نگاری کا قرینہ نکھر کر سامنے آیا ہے۔ علوئے فکر کے تلازمات جاذبیت اور اپنائیت سے ہم آغوش ہو رہے ہیں۔ ایجاز و اختصار کی عمدہ مثال ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی سعیِ مندوب کی گئی ہے۔

دوسرے بند میں دوستی، دشمنی، زندگی، بندگی، تیرگی اور روشنی جیسے شش پہلو پائے جاتے ہیں جو خود میں داخلی و خارجی تناظرات رکھتے ہیں۔ جنہیں فصاحت و بلاغت کی استعاراتی فضا میسر ہے۔ جو متضاد و متنوع اور ہمہ گیر نوعیت کے ہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو استفہامیہ اشارات کا استخدام زورِ بیان اور شدتِ احساس کا مظہر ہے۔ نیز داخلی قوافی نے ایک فنی چابک دستی کی فضا قائم کر دی ہے۔ تصوف کا فلسفہ ''ہمہ اوست'' اس پوری حمد کی روحِ رواں ہے جس کا تکراری پہلو اس کی اہمیت کو فزوں تر کر رہا ہے۔ اپنے مالکِ حقیقی سے بے انت عقیدت و محبت کا اظہار بھی ہے جس میں بندوں کو اپنے خالقِ ازلی و ابدی سے جوڑنے کی شعوری و لاشعوری اور فطری نوعت کی کوشش ہے۔ فطری رچاؤ جس کا خاصا ہے۔ ادراکِ باری تعالیٰ کو سہل و شستہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ گویا ان کے فحوائے بیان میں ترسیلِ ادراک کا عمل جاری و ساری ہے۔ وہ اپنے قارئین کی فکری تربیت کی خواہاں ہیں۔

تیسرا بند فکری حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کی اساس فکریات پر رکھی گئی ہے۔ جس میں وسیع تر فلسفیانہ اور نفسیاتی امکانات پائے جاتے ہیں۔ مقطع کی صورت میں اظہارِ عجز و انکسار بھی ہے۔ ''تیرے سوا کچھ بھی نہیں'' کا تکرای مصرع ہر نوع کے شرک کی نفی کرتا ہے۔ انتہائی سادہ الفاظ میں اور مختصر شبدوں میں بہت کچھ کہنا یقیناً یہ کمالِ فن کی علامت ہے۔ اگر عروضی حوالے سے بات کی جائے تو حمد ھذا بحر رجز مربع سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''مستفعلن مستفعلن'' ہیں۔

اب حمد نگاری کے تناظر میں ان کا مجموعہ ءکلام ''معرکہ ءکشمیر'' مطبوعہ مئی 2019ء ہمارے زیرِ نظر ہے۔ اس کتاب کو دوبار زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ یعنی

اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ان کا ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جہاں ملی وقومی تناظرات باہم مربوط نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ گویا ان کا فکری کینوس دوہری جہات کا حامل ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے سردار محمد عبدالقیوم، میجر جنرل سردار محمد انور خان، ڈاکٹر رشید نثار، جمیل یوسف، اعتبار ساجد اور سید عارف کی آراء مندرجات کا حصہ ہیں۔ اس کتاب میں بھی ان کی ایک حمد شامل ہے جسے نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔

اے مالکِ ارض وسما
یہ وقت کڑا ہے
ہاتھوں میں دعا تھام کے کشمیر کھڑا ہے
تو سب سے بڑا ہے
ہر سمت یہاں خون شہیدوں کا پڑا ہے
تو سب سے بڑا ہے
سب ماؤں کی آنکھوں میں لہو بول رہا ہے
دریاؤں کا پانی بھی جہاں کھول رہا ہے
یہ وادی جہاں پھول کھلا کرتے تھے پہلے
سب رشتے محبت سے ملا کرتے تھے پہلے
اب رات تشدد کی اتر آئی ہے وہاں پر
اندھیرا ہے اور ذلت ورسوائی ہے وہاں پر
اے مالکِ ارض وسما
یہ وقت کڑا ہے
ہاتھوں میں دعا تھام کے کشمیر کھڑا ہے
تو سب سے بڑا ہے
تو سب سے بڑا ہے

(ص:26)

شاہدہ لطیف کی اس حمد میں مذہبی وملی اور قومی افکار کی تثلیث کارگر ہے جو زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہے۔ یہ حمد اگرچہ آزاد نظم کی ہیئت میں ہے لیکن داخلی قوافی کے التزام نے پابند شاعری کا سا سماں پیدا کر دیا ہے۔ ان کے فکری کینوس میں مذہب و ملت اور قومیت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے جسے ان کے فکروفن کا طرۂ امتیاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس امر پر سختی سے کاربند ہیں کہ مشکل وقت میں اللہ سے ہی مدد طلب کرنی چاہیے۔ اسی سے ہی رجوع کرنا چاہیے۔ بندۂ مومن کا ہمیشہ سے یہی طریق رہا ہے کہ وہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے اور اسی سے ہی مدد طلب کرتا ہے۔ حمد ھذا مقبوضہ کشمیر کا خونچکاں منظر نامہ بھی پیش کرتی ہے۔ جو نہ صرف امتِ مسلمہ کے اجتماعی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے بلکہ عالمی ضمیر کو بھی دعوتِ تحریک دیتی ہے۔ ان کی یہ حمد نہ صرف ایک قلمی جہاد کا درجہ رکھتی ہے بلکہ اس میں غور وفکر کے التزامات بھی پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی اس حمد اور تصنیف کی بدولت نظری انقلاب کی راہیں ہموار کرنے کی کوشش کی ہے جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی ملی ہے۔ اسلوب کی سادگی وسلاست اس کے ابلاغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

اب شاہدہ لطیف کے ایک اور شعری مجموعہ ''بیت اللہ پر دستک'' مطبوعہ اکتوبر 2012ء کے پس منظر میں ان کی حمد نگاری کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ ایک منظوم سفر نامہ ہے جو انکی عمدہ تخلیقی اور فنی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ اس میں ہر نوع کی آراء اور تاثرات معدوم ہیں جو اعتماد کی فضا کی علامت ہے۔ ان کی اولین حمد شاملِ شذرہ کی جاتی ہے۔

وہ آسماں کی وسعتوں میں ہے نہاں

مگر زمیں کے ذرے ذرے کا امین و پاسباں

سمندروں میں رہنے والی اڑنے والی مچھلیاں

ہر ایک جسم سانس لینے والی ساری بستیاں

یہاں وہاں جہاں تہاں

سبھی ہیں اس کے حمد خواں
جو خالقِ حیات ہے
جو ربِ کائنات ہے
اگر جلال میں ہو وہ
تو زلزلوں سے کانپ اٹھے یہ زمیں
سمندروں کو بستیوں میں شہروں میں اچھال دے
زمیں کا رکھ دے ہر طبق پلٹ کے وہ
دکھائے ایسی بارشیں کہ آب ہو زمیں
مگر نہیں
رحیم بھی کریم بھی شفیق بھی ہے ذاتِ رب
کرم کی اک نگاہ ڈال دے جو برسرِ زمیں
تو چار سو بہار کا سماں بندھے
ہر ایک تشنہ لب کو آبِ ابر سے نوازے
ہر ایک سوکھی فصل کو ہرا کرے
زمیں جہاں بھی خشک ہے تری میں اس کو ڈھال دے
شفیق اس قدر کہ حادثات کو بھی ٹال دے
رحم بے پنہ کی رحمتوں کے بارے میں زباں
کہاں سے ڈھونڈ کر کوئی مثال دے
ہر اک قدم اسی کی جلوہ گاہِ ذوالجلال ہے
کہ خالقِ جہاں کے علم میں
ہے ہر دھڑکتے دل کی عرضِ حال
اسی کے فیضِ لطف سے

غریب و بے نوا بھی مالا مال ہے
تمام حسنِ کائنات میں وہی مثال ہے
جو صاحبِ جلال ہے، جو صاحبِ جمال ہے
میں اس کی حمد کیا لکھوں؟
میں اس کا ذکر کیا کروں؟
کہاں مراد ماغ ہے؟ کہاں مری مجال ہے؟

(ص: 35 تا 37)

یہ حمد آزاد نظم کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔ اس کے لیے بحر ہزج مقبوض کو بروئے کار لایا گیا ہے جس کا عروضی رکن ''مفاعلن'' ہے۔ آزاد نظم کی ہئیت میں ہونے کے باعث اس کے ارکان میں تعددی مغائرت پائی جاتی ہے۔ آغازِ حمد میں وجودِ باری تعالیٰ کا ادراک پایا جاتا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ آسماں کی وسعتوں میں پوشیدہ ہے مگر زمیں کے ذرے ذرے کا آمین و پاسبان بھی وہی ہے۔ وہ آبی مخلوقات ہوں یا زمینی سبھی اس کی حمد و ثنا کرتی ہیں۔ وہی سب کا خالق اور کائنات کا رب ہے۔ اگر کبھی وہ ذاتِ باری تعالیٰ جلال میں آ جائے تو زلزلوں سے یہ زمین لرز اٹھے، سمندروں کو بستیوں اور شہروں میں اچھال دے اور زمین کے ہر طبق کو پلٹ کر رکھ دے۔ اگر وہ بارشیں برسانے پر آ جائے تو کرۂ ارضی کو آب آب کر دے۔ رب کی ذات رحیم و کریم بھی ہے اور شفیق و مہربان بھی ہے۔ خیر شر کی تمام طاقتیں اسی سے منسوب ہیں۔ ان کی اس حمد میں صفاتِ باری تعالیٰ اور اسمائے حسنیٰ کا مذکور ہے۔ اس کی قدرتِ کاملہ کا فصیح و بلیغ اور برملا اظہار ہے۔ عاجزی و انکساری کے فکری تلازمات موجود ہیں۔ اگر اسلوبیاتی حوالے سے بات کی جائے تو اس میں تین طرح کے مرکبات وارد ہوئے ہیں جن میں اضافی و توصیفی اور عطفی مرکبات پائے جاتے ہیں۔ جس سے ان کی لسانی دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ فطری رچاؤ اس حمد کا وصفِ خاص ہے اور زنجیر کی کڑیوں کا سا تسلسل بھی کارفرما ہے۔ داخلی قوافی کے التزام نے پابند شاعری کی چاشنی پیدا کر دی ہے۔ چونکہ شاہدہ لطیف نے زیادہ تر عروسِ غزل کی تزئین اور خدمت کی ہے، اس لیے

فطری طور پر ان کی آزاد نظم میں بھی داخلی قوافی در آتے ہیں اور یہی امر ان کی فنی چابکدستی کی بین دلیل ہے۔ اس حمد میں عروضی تلازمات کا التزام بطریقِ احسن کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا مجموعہ ء کلام بطریقِ احسن کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا مجموعہ ء کلام سے ایک اور حمد زیبِ قرطاس ہے۔

اعلیٰ ہے ہے شان تیری
بالا ہے آن تیری
کرتا ہے حمد ہر دم
سارا جہان تیری
اے ہر جہاں کے والی
سب ہیں ترے سوالی

جو کچھ مجھے ملا ہے
تو نے عطا کیا ہے
بابِ قبول وا کر
تو واقفِ دعا کر
اے ہر جہاں کے والی
ہر رنگ و بو کے مالی

رحمت ہے تیری سب پر
ہر صبح اور شب پر
ہر دم ہیں شاداں فرحاں
ایماں ہے جن کا رب پر
اے ہر جہاں کے والی

دامن رہے نہ خالی

ہر سجدہ شکر تیرا

ہر لمحہ شکر تیرا

ہر لحظہ شکر تیرا

اے ہر جہاں کے والی

ہر شئے تری سوالی

(ص:135-134)

حمد ھذا مسدس کی ہیئت میں کہی گئی ہے مگراس کے آخری بند میں ایک مصرع کی کمی روا رکھی گئی ہے۔عروضی اعتبار سے بحر رجز مربع مخذوف میں کہی گئی ہے جس کے ارکان ''مستفعلن فعولن'' ہیں۔مربع وزن میں ایسے عمدہ اشعار نکالنا یقیناً شاہدہ لطیف کا کمالِ فن ہے۔اس حمد کے فکری کینوس میں ادراک و اعترافِ باری تعالیٰ کے فکری تلازمات پائے جاتے ہیں۔ دوسرے بند میں اس کے ختم ہونے کی دلیل ہے۔اسے علیم وخبیر گردانا گیا ہے اوراس سے مدد طلب کی گئی ہے۔تیسرے بند میں اس کے اکرام والطاف کا مذکور ہےاور ایمان کوتسکینِ خاطر کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔چوتھے بند میں صرف اسے ہی عبادت کے لائق گردانا گیا ہے۔ہر نوع کے شرک کی نفی کردی گئی ہے۔ایک اظہارِ سپاس گزاری کارفرما ہے۔اسلوبیاتی اعتبار سے یہ حمد سہلِ ممتنع کے رنگ کی حامل ہے جسے ایجاز واختصار کا شاہکار بھی کہا جا سکتا ہے۔

''بیت اللہ پر دستک'' سے شاہدہ لطیف کی ایک اور حمد قابلِ ذکر ہے۔

اے خدائے مہرباں

تجھ سے ہے سارا جہاں

ذرے ذرے میں عیاں

تو ہے ذاتِ بے کراں

اے خدائے مہرباں

پھول اور خوشبو میں ہے
لفظ کے جادو میں ہے
شہر و دشتِ ہو میں ہے
تو ہے ذاتِ بے کراں
اے خدائے مہرباں

کوہ و صحرا کے لیے
چشمِ بینا کے لیے
ساری دنیا کے لیے
تو ہے ذاتِ بے کراں
اے خدائے مہرباں

ہر سفر کی ابتدا
ہر دعا کی انتہا
ہر دکھی دل کی شفا
تو ہے ذاتِ بے کراں
اے خدائے مہرباں

(ص:139-140)

شاہدہ لطیف کی یہ حمد ہیئتی اعتبار سے ثلاثی بند ہے۔ ہر تین مصرعوں کے بعد ایک ٹیپ کا شعر رکھا گیا ہے جس کے لیے بحر رمل مربع محذوف کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ جس کا وزن "فاعلاتن

فاعلن'' ہے۔ ''فاعلاتن'' کی محذوفی شکل ''فاعلن'' ہے۔ اس میں بہت سے فکری تلازمات کو برتا گیا ہے۔ سہلِ ممتنع کا سا انداز ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اس کے حواس کو مکمل طور پر مستعد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بین الحمد تصوف کا فلسفہ ''ہمہ از اوست'' بھی کارگر ہے جس کا مطلب ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے کو اپنے خالقِ حقیقی سے نسبت ہے۔ ''ہمہ اوست'' اور ''ہمہ از اوست'' کا بنیادی فکری فرق یہ ہے کہ ''ہمہ اوست'' کا مطلب یہ ہے کہ سب کچھ وہی ہے، اور ''ہمہ از اوست'' کا مطلب ہے کہ ہر چیز کو اسی سے نسبت ہے۔ شاہدہ لطیف نے اپنی اس حمد میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی گواہی کے لیے مظاہرِ فطرت کا استعمال فزوں تر کیا ہے جو نہایت فطری نوعیت کا ہے۔ اس کے لیے اس نے جزوی اور کلی تلازمات کا اہتمام کیا ہے۔ ان کی ہر حمد کی طرح اس حمد میں بھی آمد کا سماں پایا جاتا ہے۔

اب ان کے نعتیہ شعری مجموعہ ''نگاہِ مصطفیؐ'' مطبوعہ اگست 2017ء کی اولین حمد پیشِ خدمت ہے۔ ان کی اس کتابِ نعت کو دوبار اشاعت کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اس کے تاثرات نگاروں میں ریاض مجید، افتخار عارف اور قمر وارثی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مرے لباس کے ہر تار کا محافظ ہے
جو کائنات کے اسرار کا محافظ ہے
وہی خدائے بزرگ و جلیل ہے میرا
محافظوں کی جو دستار کا محافظ ہے
اسی سے نطق و سخن میں ہے لذتِ الفاظ
جو میرے لہجۂ اظہار کا محافظ ہے
یہ کائناتِ سخن اس کے دم سے ہے قائم
وہ حرف حرف کے معیار کا محافظ ہے
وہی خدا جو محافظ ہے میری نیندوں کا
وہ میرے دیدۂ بیدار کا محافظ ہے

مجال کیا کہ بغیر اس کے حکم کے بولوں
مری زباں، مری گفتار کا محافظ ہے

(ص:23)

شاہدہ لطیف کی چھ اشعار پر مشتمل یہ حمد غزل کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔عصرِ حاضر میں حمد و نعت اور دیگر موضوعاتی نظمیات کے لیے غزل کی ہیئت کو مقبول ترین سمجھا جا رہا ہے اور یہ امر قرینِ حقیقت بھی ہے کہ اس حمد میں فلسفیانہ اور نفسیاتی آفاق و اعماق کے نئے ابواب وا ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں جس سے ان کے علوئے فکر کا گراف بلند ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔تمام اسرار و رموز اور اختیارات کا سر چشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے،تمام تحفظات اسی سے وابستہ قرار دیے گئے ہیں۔نطق و سخن کی لذت اور لہجہء اظہار کا تحفظ بھی اسی سے منسوب ہے۔اقلیمِ سخن اسی کے ہی دم قدم سے قائم ہے اور حرف حرف کا معیار بھی اسی سے ہے۔نیندوں اور رتجگوں کا محافظ بھی وہی ہے۔اس کے حکم کے بغیر اذنِ گویائی نہیں ملتا۔زبان و گفتار کی نگہبانی و سرپرستی اسی کی بدولت ہے۔ان کی یہ حمد فکری ترفع کی عمدہ نظیر ہے۔اس حمد میں قدرے مشکل قوافی اور ردیف کو نبھایا گیا ہے جو شاہدہ لطیف کی کہنہ مشقی کی بین دلیل ہے۔

اب ان کے فراہم کردہ مجموعہ ہائے کلام میں سے آخری کتابِ شعر ''خواب سونے نہیں دیتے'' مطبوعہ فروری 2022ء میں سے اولین مگر شذرہ ھذا کی آخری حمد لائقِ التفات ہے۔اس مجموعہء کلام کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس میں صرف خالد شریف کے تاثرات شامل ہیں جو انہوں نے ''انا کی شاعرہ'' کے عنوان کے تحت لکھے ہیں۔کتاب ھذا کا نام بھی فکری بیداری کا ایک بھرپور حوالہ ہے۔

شکستگی میں مجھے حوصلہ بھی دیتا ہے
خدا مجھے کسی غم سے بچا بھی دیتا ہے
شکستہ پا سہی میں، پھر بھی پالنے والا
مسافتوں میں نیا راستہ بھی دیتا ہے

جو اس کو چاہتے ہیں اور فیض مانگتے ہیں
از امتحان انہیں ابتلا بھی دیتا ہے
خلوصِ دل سے اگر سجدے میں دعا مانگو
قبولیت یہ تو اب دعا بھی دیتا ہے
بگاڑتا بھی ہے اپنے زلزلوں سے جہاں
وہ دین و دنیا کسی کی بنا بھی دیتا ہے
صفاتِ حق سے ہے ظاہر کہ عجزِ سجدہ گزار
پسند آئے تو اس کو جزا بھی دیتا ہے
سوال شاہدہ کرتی ہوں صرف خالق سے
قدم قدم پہ جو مجھے آسرا بھی دیتا ہے

(ص:15)

شاہدہ لطیف کی حمد نگاری کا کینوس بہت وسیع ہے جس میں بسیط وعریض فکری امکانات پائے جاتے ہیں۔ ہیئتی حوالے سے بھی انہوں نے انتہائی کامیابی سے مختلف النوع تجارب کیے ہیں۔ ان کے ہاں تجربات ومشاہدات کا ایک جہاں آباد ہے۔ وہ ہر ذوق کے قاری کے مختلف اسالیب بروئے کار لاتی ہیں۔ ان کے ہاں ایک ہمہ گیری ہے۔ ان کے جذبات واحساسات بے لوث اور ریا سے ماورا ہیں۔ ان کی حمد میں عقیدت ومحبت اور خلوص کی روح پرور فضا ہے۔ وسیع تر امکانات ان کے حمدیہ کینوس کا حصہ ہیں۔ عروضی حوالے سے بھی ان کے ہاں بحور واوزان میں ایک تنوع وتلون کی رنگینی ہے۔ انہوں نے مفرد ومحذوف اور مرکب بحور کو انتہائی قادرالکلامی سے برتا ہے۔ اگر حمد نگاری میں ان کی ریاضت اسی تواتر سے جاری وساری رہی تو وہ اپنے عہد کے حمد نگاروں میں ایک نمایاں مقام کی مستحق ٹھہریں گی۔

شاہدہ لطیف کے کلام کے نعتیہ آفاق و اعماق

نعت نگاری ایک ایسی سعادت ہے جو ہر کسی کو میسر نہیں آتی۔ جسے یہ نصیب ہو جائے، اس کی فرخندہ نصیبی قابلِ بیاں نہیں ہوتی۔ گویا یہ خوش نصیبی خدائے بزرگ و برتر اپنے پیارے بندوں کو عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے ۔۔۔ وَرفعنا لک ذکرک ۔۔۔ اور ہم نے آپ کے ذکر کو رفعت بخشی ۔۔۔ جس ذاتِ ستودہ صفات کا ذکر خدا کی ذات کرنا چاہے، تو پھر مخلوقِ خدا اس ذاتِ بابرکات کی والا و شیفتہ کیوں نہ ہو۔ جو انسان ذکرِ نبیؐ سے روحانیت کی روشنی حاصل کرتا ہے تو پھر دنیا کی تاریکیاں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ امتِ مسلمہ میں مخلوقِ خدا کا مقصدِ حیات یہی ہے کہ ان کا مالکِ حقیقی راضی ہو جائے اور خالقِ عالم کی رضا یہی ہے کہ اس کے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ یہی فلسفہء اسلام ہے جسے صرف اہلِ عشق سمجھ سکتے ہیں۔

اگر مذہبی عبادات و تلازمات کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکرِ خیر انتہائی ناگزیر ہے۔ اگر قرآنی تعلیمات کو مدنظر رکھا جائے تو قرآن مجید فرقانِ حمید میں جہاں کہیں بھی ذکرِ خدا آیا ہے تو وہاں ذکرِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ کلمہ طیبہ ملاحظہ کریں۔ اذان و نماز پر غور کریں تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف و توصیف کے بعد مدحتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ضروری خیال کیا ہے اور ہمیں ان پر درود و سلام بھیجنے کی تاکید فرمائی ہے۔ جس پر عمل کرنے میں دنیا و عقبیٰ میں فلاحِ انسانی کا راز ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نعت نگاری ذکرِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذریعہ ہے اور حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی یادِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقِ حسنہ بھی ہے۔ نیز خدا کی رضا حاصل

کرنے کا ایک سبب بھی ہے۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ نعت نگاری کی ایک شاندار روایت ہر دور میں مضبوط و مستحکم رہی ہے، وہ کلاسیکی دور ہو یا نیو کلاسیکی دور یا پھر عہدِ موجود ہو، نعت نگاری کو فروغ مستقل طور پر میسر رہا ہے۔ مسلم و غیر مسلم شعرا اس روایت کی پاسداری میں پیش پیش رہے ہیں۔ مرد شعرا کے شانہ بشانہ شاعرات نے بھی نعت نگاری کی روایت کو تقویت بخشی ہے اور نعت نگاری کے حوالے سے انتقادی کام بھی جاری و ساری رہا۔ شذرہ ھذا میں ہم اسلام آباد میں مقیم شاعرہ شاہدہ لطیف کی نعت نگاری کے حوالے سے خامہ فرسا ہیں جن کی اب تک سترہ مختلف النوع تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں نو تصانیف کی نوعیت تخلیقی ہے۔ علاوہ ازیں دو ناول ہیں اور مزید برآں کچھ صحافتی و علمی نوعیت کی ہیں۔ نیز کچھ حالاتِ حاضرہ سے متعلق بھی ہیں۔ اس وقت ان کا نعتیہ مجموعہ ''نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' مطبوعہ اگست 2017ء ہمارے روبرو ہے جس کی طباعت ماورا پبلی کیشنز لاہور نے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ اس وقت کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے تاثرات نگاروں میں ریاض مجید، افتخار عارف اور قمر وارثی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ شذرہ ھذا میں تنقیدی اکائی کے طور پر صرف ان کا بلاعنوان نعتیہ کلام جو پابند شاعری سے تعلق رکھتا ہے، زیرِ تجزیہ لایا جائے گا۔ علاوہ ازیں کلام کسی اور فکری یا ہیئتی تناظر کا حصہ بنے گا۔

ان کے مذکورہ مجموعہء کلام سے ابتدائی نعتوں میں سے ایک نعت شاملِ شذرہ ہے۔

خدا ظاہر ہوا سب پر محمد مصطفیٰؐ آئے
جہاں کو مل گئے سرور محمد مصطفیٰؐ آئے
زمیں تا عرش ہر جانب ہوئی انوار کی بارش
منور ہو گیا ہر در محمد مصطفیٰؐ آئے
خدا سے لے کے وعدہ امتِ عاصی کی بخشش کا
مکمل مطمئن ہو کر محمد مصطفیٰؐ آئے
زمانے بھر میں وہ انسانِ کامل، رحمت العالمیں

سراپا نور کا پیکر محمد مصطفیٰؐ آئے
اٹھو اب شاہدہؔ تعمیلِ احمد میں کرو سر خم
فضا بدلی ہے اب یکسر محمد مصطفیٰؐ آئے

(ص:27)

مذکورہ نعت غزل کی ہیئت میں کہی گئی ہے جو عہدِ موجود میں نعت و نظم کی مقبول ترین ہیئت ہے۔اس کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں نظم کی ہیئت کی بجائے غزل کی ہیئت پر زیادہ کام ہو رہا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے قارئین کی پسندیدگی حاصل ہے۔ویسے بھی عصرِ حاضر میں نظم کی بجائے غزل زیادہ لکھی جا رہی ہے۔کیونکہ یہ مقبولِ خاص و عام ہے۔مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ نظم کی دیگر کلاسیکی ہیئتیں مثلاً مثنوی،ثلاثی،مسدس،مخمس،ترکیب بند اور ترجیع بند پردۂ اخفا میں جا رہی ہیں۔غزل کی ہیئت دیگر تمام شعری ہیئتوں پر غالب ہوتی جا رہی ہے اور یہ رجحان وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔اگر عروضی حوالے سے بات کی جائے تو یہ نعت بحر ہزج مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔اس کا شمار قدیم بحور میں ہوتا ہے جسے خلیل نے ایجاد کیا تھا اور یہ ایک رواں دواں بحر ہے۔مفرد بحر ہونے کے باعث آہنگ و غنائیت سے مالا مال ہے۔اس نعت کے قوافی کی نوعیت اگرچہ عمومی ہے مگر یہاں کچھ نادر قوافی کا استعمال بھی ہوا ہے۔اس کی ردیف ''محمد مصطفیٰؐ آئے'' بعثتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مشیر ہے۔

جہاں تک شاہدہؔ لطیف کی اس نعت کی فکریات کا تعلق ہے تو اس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے برکات و فیوض کا تذکرہ ہے۔محروم طبقہ جس کا کوئی ولی وارث نہیں تھا،جن کی کسمپرسی کی حالت میں کوئی پرسانِ حال نہیں تھا،انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں ایک سردار اور مالک و آقا میسر آیا۔جس سے عالمِ ظلم و جبر میں کمزور عوام کو طاقت کا سرچشمہ ملا۔روحانی طور پر ایک رہنما اور ہادی ملا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے کرۂ ارضی بقعۂ نور میں تبدیل ہو گئی۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ سے اپنی گناہ گار امت کی بخشش کا عہد لے کر دنیا میں آئے۔اس لیے آپ کی ذات سراپا اطمینان تھی۔

تاریخِ بشریات نے گواہی دی ہے کہ وہ ایک انسان کامل تھے۔ایک رحمت اللعالمین تھے۔آپ ﷺ نور کا پیکر بن کر دنیا میں آئے۔اس نعت کے مقطع کا پہلا مصرع فعل امر کا درجہ رکھتا ہے۔ اگرچہ اسے شاعرہ نے ذاتی حوالے سے پیش کیا مگر اس کا اجتماعی حوالہ پوری امتِ مسلمہ ہے۔اس میں اطاعتِ رسول ﷺ کا درسِ زریں بھی موجود ہے کیونکہ قرآن مجید میں واضح انداز میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی گویا اطاعت نبی ﷺ اطاعتِ ایزدی سے مربوط ہے۔دوسرے مصرع میں حضور ﷺ کی آمد کے باعث تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے جو ہمہ گیر نوعیت کے ہیں۔اس نعت میں انتہائی سادہ مگر جامع اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس سے شاہدہ لطیف کی لسانی چابکدستی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ایسے تمام معاملات و واقعات جن کا تعلق حضور نبی اکرم ﷺ سے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ہے، وہ کسی نہ کسی رنگ میں نعت نگاری کے فکری کینوس کا حصہ بنتے ہیں۔ایسی تمام تعلیمات وصفات جو حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے منسوب ہیں، نعت کی فکریات میں شامل ہیں۔اسی تناظر میں شاہدہ لطیف کی ایک اور نعت ملاحظہ کیجئے:

انوار و تجلی کا سماں غارِ حرا میں
ہے اور ہی خوشبو کا جہاں غارِ حرا میں
ہے منحصر اس پر کہ نگہ کس کی ہے کیسی
اسرارِ عیاں اور نہاں غارِ حرا میں
پائی جو بزرگی تو اچانک بھی نہ پائی
ہوتا ہے مقام ان کا جواں غارِ حرا میں
خلوت کی ہے تقدیس نگاہوں میں تو دیکھیں
ہے آج بھی اک کیفِ رواں غارِ حرا میں
ممکن نہیں کر پائیں قیاس اہلِ تمنا
اک حسن کا تھا حسنِ بیاں غارِ حرا میں

(ص:32)

شاہدہ لطیف کی مذکورہ بالا نعت غزل کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔''غارِ حرا میں'' کی ردیف فکری تسلسل کی عمدہ غمازی سے مربوط ہے۔فطری رچاؤ اس نعت کا وصفِ خاص ہے۔اس نعت میں فزوں تر فلسفیانہ اور نفسیاتی امکانات پائے جاتے ہیں۔فکری ترفع کا گراف بلند ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جس میں شدتِ احساس اور زورِ بیاں کے تلازمات کے پہلو بہ پہلو فکری نادرہ کاری بھی موجود ہے۔مندرجہ بالا نعت بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن'' ہیں۔اس بحر کا سالم رکن ''مفاعیلن'' ہے۔ مفاعیل مکفوفی رکن ہے اور فعولن ''مفاعیلن'' کی محذوفی صورت ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی آمد کے حوالے سے ان کے ہاں ایک وفورِ شعر کا سماں پایا جاتا ہے۔ان کے نعتیہ کینوس میں خلوص و عقیدت اور ایک احتیاط کا پہلو نمایاں ہے۔عام طور پر نعت نگاروں کے ہاں غلو کی کیفیت پائی جاتی ہے لیکن شاہدہ لطیف کے ہاں مبالغہ مفقود ہے۔ان کے ہاں باریک بینی اور عرق ریزی کا عنصر پورے جوبن پر نظر آتا ہے۔اسی پس منظر میں ان کی ایک اور نعت ملاحظہ فرمائیں۔

اے وقارِ صبح نو اے نورِ ایماں آیئے
زندگی ہے منتظر اے ماہِ تاباں آیئے
ٹہنیوں کے ہاتھ پھیلے ہیں دعا کے واسطے
گل بہ داماں آیئے گلشن بہ داماں جایئے
چاہیے شمعِ عمل اس عہدِ بے تنویر کو
بجھ رہی ہے مشعلِ احساسِ انساں، آیئے
کب سے حسنِ آدمیت مل رہا ہے خاک میں
کب سے گیسوئے دو عالم ہیں پریشاں آیئے
روح کو، دل کو، نظر کو روشنی درکار ہے

لے کے دستِ پاک میں خورشیدِ ایماں آیئے
آپ کا مسکن سہی حدِ یقیں کے عرش پر
بندگی روشن کرے گی شمعِ امکاں آیئے

(ص:35)

شاہدہ لطیف کی اس نعت میں رجائی امکانات کی کارفرمائی ہے۔ کلاسیکی عہد کی بہاریہ شاعری کی خصائص ہیں۔ ترغیبِ عمل کی دعوت ہے۔ عصری بے حسی کا حوالہ ہے۔ مکارمِ اخلاق کی پامالی کی عکاسی ہے۔ عہدِ جہالت کی ہولناکیاں ہیں۔ روحانیت کی روشنی ہے۔ مستقبل کے حوالے سے رجائی نکتہ نظر بھی ہے۔

اس نعت میں سہ زمانی تثلیث یعنی ماضی، حال اور مستقبل کی ترجمانی ہے۔ اگر اسلوبیاتی اعتبار سے بات کی جائے تو اس میں مرکبات کا ایک جہان آباد ہے جن میں مرکبِ اضافی بھی ہیں اور مرکبِ توصیفی بھی ہیں۔ دوہرے مرکب بھی بروائے کار لائے گئے ہیں۔ جس سے ان کا لسانی تبحر اظہر من الشّمس ہو جاتا ہے۔ نعت ھذا فکر وفن کی عمدگی سے عبارت ہے۔ اگر عروضی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ نعت بحر رمل مثمن محذوف میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے اور فاعلن ''فاعلاتن'' کی محذوفی صورت ہے۔

ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے فلسفیانہ اور نفسیاتی معاملات کو انتہائی سہل اسالیب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کی پیش کش کا انداز خاصا اپنائیت آمیز اور جاذبیت خیز ہے۔ مرکبات کے استعمال میں انہیں ملکہ حاصل ہے جس سے ان کے فکر وفن کی بالیدگی کی غمازی ہوتی ہے۔ اسی حوالے سے ان کی ایک اور نعت ملاحظہ کریں:

جدا سب سے دیکھی ہے شانِ محمدؐ
زمینِ محمدؐ زمانِ محمد
کلامِ الٰہی عطا ہو رہا ہے
زبانِ خدا ہے زبانِ محمدؐ

زمیں لمس پا کر ہے مدہوش اب تک
ہے زیرِ قدم آسمانِ محمدؐ
کوئی تذکرہ ان سے بڑھ کر کہاں
بیانوں میں افضل ہے بیانِ محمدؐ
رسولوں نے تسلیم اس کو کیا ہے
کہ شانِ رسالت ہے شانِ محمدؐ

(ص:36)

حمد کی طرح نعت بھی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو خود میں کشف و کرامات کے پہلو بھی سموئے ہوئے ہے۔ اگر نعتِ مبارکہ کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس کے فکری تانے بانے حمد سے جا کر ملتے ہیں اور یہ معاملہ بآسانی سمجھ میں آجانے والا بھی ہے کیونکہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف و توصیف جو نعت سے موسوم ہے، دراصل وہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اعترافِ اوصاف بھی ہے۔ یہی باریک نکتہ اس نعت میں پورے طور پر کارگر ہے۔ یہ نعت اسلوبیاتی حوالے سے بھی ایک عمدہ فن پارہ ہے جس میں قافیہ ردیف کا اشتراک ایک مرکب کی صورت میں دیکھا گیا ہے۔ یہ مرکب اضافی ہے مگر کہیں کہیں مرکب توصیفی کا روپ بھی دھار لیتا ہے۔ یہاں شاہدہ لطیف کی قوتِ اختراع قابلِ داد ہے۔ یہ نعت بحر متقارب مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہیں۔ اس بحر کا شمار بھی خلیل کی بحروں میں ہوتا ہے۔

شاہدہ لطیف کی نعت نگاری کا نکتۂ کمال یہ ہے کہ ان کے فکر و فن میں ایک وسعت کا پہلو کارفرما ہے۔ ان کے اظہاری پیمانوں میں ندرت کی نمو پذیری ہے۔ ان کے ہاں جزوی و کلی اور داخلی و خارجی تمام تر تناظرات پائے جاتے ہیں۔ عروضی تلازمات کا استخدام بھی قرینہ کاری کا مظہر ہے۔ اس حوالے سے ان کی یہ نعت قابلِ ذکر ہے۔

محبت کا منبع ہے ذاتِ آپؐ کی
جہاں آپؐ کا ، کائنات آپؐ کی

محبت سے دل سارے جیتے گئے
نصابِ محبت ہے بات آپؐ کی
محبت سے زیرِ نگیں ساعتیں
یہ دن آپؐ کے ہیں، یہ رات آپؐ کی
محبت سے دونوں جہاں بھر دیے
محبت کی قاسم صفات آپؐ کی
سراپا محبت مجسم کرم
محبت ہے ساری حیات آپؐ کی

(ص:37)

شاہدہ لطیف کے فحوائے نعت میں فطری رچاؤ کی روح پورے طور پر کارفرما ہے جس میں ان کے راسخ العقیدہ ہونے کا عمل دخل بھی ہے۔ عمدہ نعت نگاری کے لیے فنی ادراک کے ساتھ ساتھ حبِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلوص بھی انتہائی ناگزیر ہے۔ زبان و بیان پر دسترس ہونے کے باعث انہیں یہ کمال حاصل ہے۔ یہ نعت بحر متقارب مثمن محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعل'' ہیں۔

کیوں نہ ذرے ذرے میں چمکے قصیدہ آپؐ کا
جس قدر بھی ہیں جہاں سب کچھ ہے صدقہ آپؐ کا
سب سے پہلے کس نے دکھلایا اجالا آپؐ کا
آ گیا قرآن میں پورا حوالہ آپؐ کا
سنگِ اسود نصب کرنے پر تنازع روکنا
واقعہ مشہور ہے انصاف والا آپؐ کا

فصاحت و بلاغت اور اندازِ بیاں کی ندرت ان کی نعت نگاری کے اوصافِ حمیدہ ہیں۔ بسا اوقات ان کی نعت قرآنی ماخذات کا ماحصل محسوس ہوتی ہے اور تاریخی میلانات بھی در آتے ہیں۔

جیسے اس نعت میں حجرِ اسود نصب کرنے کے حوالے سے تاریخی تلمیح کو بروئے کار لایا گیا ہے۔

شاہدہ لطیف کی نعت نگاری سیرت النبیؐ، احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اسلامی تعلیمات اور تاریخی ادراکات کا ایک حوالہ ہے۔ نعت گوئی کے حوالے سے ان کے اخلاص نے ان کے سخن میں ایک چاشنی پیدا کردی ہے جو قاری کو بلا تامل مائلِ قرات رکھتی ہے۔ ان کے نعتیہ کینوس میں آہنگ وغنائیت عمدگی کے پیرائے میں ملتا ہے۔ ان کی ایک اور نعت قابلِ ذکر ہے۔

مدینہ چشمِ تر کی آرزو ہے
مجھے خیر البشر کی آرزو ہے
بنوں ذرہ میں انؐ کے نقشِ پا کا
یہی شمس و قمر کی آرزو ہے
زیارت ہو، زیارت ہو، زیارت
مرے قلب و نظر کی آرزو ہے
کلام اک آپ سے رکھنا ہے بس
تکلم کو اثر کی آرزو ہے
ملے اعزاز مجھ کو نعت گو کا
یہی اہلِ ہنر کی آرزو ہے
کھلے گی روضہء اقدس پہ جا کر
جو میری عمر بھر کی آرزو ہے
وطن میں شاہدہ بے بس مجسم
عطا ہو بال و پر کی آرزو ہے

شاہدہ لطیف کی نعت گوئی حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بحرِ بے کراں ہے جس میں لمحہ بہ لمحہ امواج وتلاطم کی فضا پائی جاتی ہے۔ خواہشِ وصلِ مدینہ شدید تر ہے۔ عالمِ گریہ کا سماں ہے۔ ان کے نزدیک مقامِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعلیٰ وارفع ہے۔ ان کے مقابلے میں تمام مظاہرِ فطرت انہیں ہیچ نظر

آتے ہیں۔ شدتِ احساس اور زور بیاں کے تلازمات اپنی پوری آن بان کے ساتھ کارفرما ہیں۔ لسانی اعتبار سے مرکبات کے استخدام کے پہلو بہ پہلو رعایتِ لفظی اور تکرارِ لفظی کے عمدہ شواہد ملتے ہیں۔ مذکورہ نعت بحر ہزج مسدس محذوف میں کہی گئی ہے۔ اس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

ان کا اسلوب اس قدر سادہ اور پر خلوص ہے کہ جس سے ہر ذہنی سطح کا قاری استفادہ کر سکتا ہے۔ مشکل قوافی کا التزام بھی ان کے ہاں پورے وثوق سے ملتا ہے۔ اسی نسبت سے ان کی ایک اور نعت دیکھیے جو بحرِ ہزج مربع سالم میں کہی گئی ہے جس کا وزن ''مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔ ان کے ہاں مختلف النوع عروضی تجارب ان کی فنی چابکدستی کا مظہر ہیں۔

مدینے کا ارادہ ہے
مقدر سے افادہ ہے
میں آنکھیں بند کر لوں تو
سفر سمجھو کہ آدھا ہے
تمنا کو چھپاؤں کیا
تمنا خود لبادہ ہے
کرے شک، ہے خرد کو حق
جنوں سے استفادہ ہے
یہ خوش فہمی نہ ہو میری
مرا دامن کشادہ ہے
اڑا لے جائے گی طیبہ
ہوا کا مجھ سے وعدہ ہے
مدینے کا ہر اک ذرہ
زمیں کا شاہزادہ ہے

(ص:100)

قربتِ مدینہ ان کا خواب ہے جس کی تعبیر انہیں بہ سرعت مطلوب ہے۔شوقِ زیارت میں ان کے ہاں گھنٹوں کی مسافت لمحوں میں سمٹ جاتی ہے۔قلبی واردات کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں خرد آموزی کے بھی وسیع تر امکانات موجود ہیں۔ان کے اظہاری پیمانوں میں بے پناہ وسعت ہے جن میں علوئے فکر اور رفعتِ احساس نمایاں ہے۔

شاہدؔہ لطیف کے ہاں مشکل قوافی اور ردیفوں کا چلن ان کے لیے نئے فکری آفاق و اعماق کے ابواب وا کرتا ہے جس کے باعث ان کا نعتیہ تناظر وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ایسے قوافی اور ردیفیں جن کے نزدیک عمومی طور پر شعرا و شاعرات بہت ہی کم جاتے ہیں، کا استعمال ان کے ہاں خالص فطری انداز میں ملتا ہے۔آمدہ نعت جس میں لفظ ''تمام'' بطور قافیہ اور لفظ ''آئینہ'' بطور ردیف برتا گیا ہے، جو دونوں مشکل نوعیت کے ہیں، جن سے نعت کے فکری پیمانے کے تقاضے پورا کرنا خاصا دشوار رہا ہے۔

ہے مدینہ تمام آئینہ
ہیں جہاں صبح و شام آئینہ
ایک اک چیز صاف اور واضح
تھا نبیؐ کا نظام آئینہ
دین و دنیا سنوارنے کے لیے
ذکرِ خیر الانامؐ آئینہ
نسبت اس کو ہے خاکِ طیبہ سے
آنکھ جس کا ہے نام آئینہ
راہِ طیبہ سفر کی جنت ہے
جس میں ہے گام گام آئینہ
کی مدینے کے ذروں کی تقلید

ہو گیا خوش خرام آئینہ
دور سے ان کی کیا جھلک دیکھی
ہو گیا خوش کلام آئینہ
ساری کی ساری کائنات ہے عکس
اور ان کا مقام آئینہ

(ص:105-106)

شاہدہ لطیف کی ایک اور نعت مشکل ردیف کے حوالے سے ملاحظہ کریں جس میں لفظ ''مستعار'' کو بطور ردیف باندھا گیا ہے جو بحر رمل مسدس مقصور میں کہی گئی ہے۔ اس کا وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلان'' ہے۔

چاند سورج کہکشائیں مستعار
آپؐ سے لی ہیں شعائیں مستعار
آپؐ کا ہو سایہء دامن نصیب
ساری دنیا کی پناہیں مستعار
کچھ براہِ راست کر دیجئے کرم
لوں کہاں تک میں دعائیں مستعار
آپ کے صدقے خوشی دل کو ملے
ہونٹ کب تک مسکرائیں مستعار
آپؐ کی چشمِ کرم میرا بھرم
باقی ہیں ساری نگاہیں مستعار

(ص:107)

شاہدہ لطیف کی ایک اور نعت دیکھیے جس میں طویل ردیف ''دیکھی مدینے کے افق پر'' برتی گئی ہے اور مصرع کا غالب حصہ ردیف پر مشتمل ہے جو بحر ہزج مثمن محذوف میں کہی گئی ہے۔

اس کا وزن ’’مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن‘‘ ہے۔

عجب اک روشنی دیکھی مدینے کے افق پر
چمکتی دلکشی دیکھی مدینے کے افق پر

تھے جتنے ابر پارے جانے پہچانے مکاں تھے
مدینے کی گلی دیکھی مدینے کے افق پر

چراغوں کی جگہ پھیلا تھا نورِ ذات جس پر
منڈیر اس عرش کی دیکھی مدینے کے افق پر

تھے اس میں روشنی ہی روشنی کے پھول سارے
وہ کیاری سی کھلی دیکھی مدینے کے افق پر

پڑے سایہ بھی جس کا کھیت سارے لہلہائیں
کچھ ایسی زندگی دیکھی مدینے کے افق پر

ہوا کے جو قلم سے بن رہے تھے نقش کیا کیا
عجب اک دل کشی دیکھی مدینے کے افق پر

قطار اونٹوں کی تھی اے شاہدہ بادل کی صورت
کسی نے کیا کبھی دیکھی مدینے کے افق پر

(ص:126)

اب ان کی ایک غیر مردف نعت نذرِ قارئین ہے۔ غیر مردف نعت اصل میں فنی پختگی سے عبارت ہوتی ہے جس میں سخن ور ردیف سے بے نیاز دکھائی دیتا ہے۔ واضح رہے کہ ردیف شعرائے عجم کی اختراع ہے۔ شعرائے عرب کے ہاں رباعی اور تخلص کی طرف ردیف کو بھی استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ بعد از اں شعرائے عرب نے اہلِ عجم کی تقلید کی ردیف اس لفظ کا نام ہے جو قافیہ کے بعد میں لایا جاتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں۔ جنہیں مستقل اور غیر مستقل کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے اس کا مفہوم پیچھے آنے والا کا ہے۔ اہلِ عرب میں گھڑ سوار کے پیچھے بیٹھنے والے شخص کو

ردیف کہا جاتا تھا۔

مظہر ذوالجلال و الاکرام
میرا انعام صرف آپؐ کا نام
موم کیوں کر نہ ہوتا آہنی وقت
ریشمی لہجہ اور حسنِ کلام
لمس کیا، محض اشارۂ انگشت
ٹکڑے ہو کر بھی خوش تھا ماہِ تمام
سنگ باری سے بھی نہ ٹوٹ سکا
لیا ہر بار آئینہ سے کام
پیش امام انبیا تھے سارے ہی
اور ان سب کے آپؐ پیش امام
کرۂ ارض کو شرف بخشا
تھے سراپا ہی آپ عرش مقام
کیوں مدینہ کو ناز و فخر نہ ہو
مل گیا آپ کا جو قربِ دوام

(ص:138)

شاہدہ لطیف کی نعت نگاری کے فکری وفنی گوشوں کی سیر حاصل سیر کے بعد ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کے ہاں فکر وفن کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے اور ہر نوع کے تجارب موجود ہیں۔ جملہ بیانی نزاکتوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ان کی نعت گوئی عمدہ اسالیب کی حامل ہے جس سے ان کے لسانی تبحر کا اندازہ بحسن وخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ قرآن وحدیث کے ماخذات اور تاریخِ اسلامی کے ادراکات ان کے ہاں وفور کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ان کی نعت میں داخلی و خارجی، سماجی ونفسیاتی، ملی و مذہبی اور تاریخی وتہذیبی ہر طرح کے تناظرات ملتے ہیں۔ مذکورہ بالا

استشہادات وتجزیات ان کی نعت گوئی کے حوالے سے عکسِ خفیف کا درجہ رکھتے ہیں۔ان کی نعت نگاری کے حوالے سے لکھنے کے لیےتو دفتروں کے دفتر درکار ہیں مگر کیا کریں کہ طولِ بیاں کا خوف مانع ہے کہ کہیں قاری کی طبعِ نازک پر گراں نہ گزرے۔

ے صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اگران کی نعت نگاری کا سفراسی ذوق وشوق اورانہماک سے جاری رہاتو وہ نعت نگاری کی تاریخ کے نئے ابواب واکرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

شاہدہ لطیف کی ملی شاعری

ملی شاعری کسی قوم کے دینی کوائف، جملہ تعلیمات وعبادات، جذبات واحساسات اور معاملات وعقائد سے عبارت ہوا کرتی ہے۔ اگر وسیع زاویہ سے دیکھا جائے تو قومی آہنگ سے بھی مملو نظر آتی ہے جس کی وضاحت علامہ اقبالؒ نے بڑے فصیح وبلیغ انداز میں کچھ یوں کی ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ویسے تو شاہدہ لطیف کی شعری جہات بسیط وعریض ہیں، کسی بھی محقق ونقاد کے لیے میزانِ عدل پر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر حمد نگار ہیں یا نعت گو شاعرہ ہیں، ان کا ملی افق مضبوط ومستحکم ہے یا قومی تناظر قوی تر ہے۔ وہ منظوم سفرنامہ نگاری میں مہارت رکھتی ہیں یا عمومی شاعری ان کا میدان ہے۔ وہ غزل کی شاعرہ ہیں یا نظم کی شاعرہ ہیں۔ معاملہ ھذا ان کی غیر تخلیقی صلاحیتوں پر بھی محیط ہے۔ کیونکہ انہوں نے صحافت، ناول نگاری، حالاتِ حاضرہ اور نصابی حوالے سے بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ یوں وہ ہر فن مولا محسوس ہوتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر شعبہ میں اس کے مخصوص ماحول اور مزاج کے مطابق کام کیا ہے۔ اس لیے ان کا کام تسلیم کیا گیا ہے اور وسیع پیمانے پر اس کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ اس لیے جو شہرت ومقبولیت ان شعبوں میں ان کے حصے میں آئی، وہ وطنِ عزیز کی کسی دختر کے حصے میں نہیں آئی۔

شاہدہ لطیف سے قبل علامہ اقبالؒ نے بھی ملی شاعری کی خوب خدمت کی ہے جس کا تعین ان

کے اس شعر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

شذرہ ھذا شاہدہ لطیف کی شاعری کے ملی تناظر میں ہے۔اس سلسلے میں ان کے دو شعری مجموعوں سے استفادہ کیا جائے گا جن میں منظوم سفر نامہ ''بیت اللہ پر دستک'' مطبوعہ اکتوبر 2012ء اور نعتیہ مجموعہ کلام ''نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' مطبوعہ اگست 2017ء شامل ہیں۔زمانی ترتیب کا تقاضا ہے کہ ان کے اول الذکر مجموعہ شعر کے حوالے سے بات کی جائے۔

شاہدہ لطیف کی شعری کائنات میں وسیع تر ملی امکانات پائے جاتے ہیں جو ان کے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں وفور سے پائے جاتے ہیں مگر ہم نے تنقیدی اکائی کے طور پر صرف دو کتابوں کا ہی انتخاب کیا ہے۔ملی حوالے سے تخلیقِ کائنات کی نسبت سے اسلامی نظریہ اور اسلامی تصور کو اہمیت حاصل ہے جو مسلمہ و مصدقہ ہے۔اس سلسلے میں ان کی ایک آزاد نظم ''کن فیکون'' قابلِ ذکر ہے۔

ظلمتوں میں گم تھی ساری کائنات
ہر طرف تھی صرف رات
رات اور پر ہول سناٹا محیطِ شش جہات
ناشناسائی تھی نورِ حق سے اس ظلمات کو
آشنائی تھی اگر تو رات سے ہی رات کو
اک تحیر اور ہمہ گیر ایک استعجاب تھا
اور ہر سو گہری خاموشی میں گہرا اضطراب
دفعتاً کڑکی فضا
دھڑکا دلِ ظلمات بھی
ٹھٹکی وہ گہری رات بھی

اس کڑک میں روشنی کا دائرہ ظاہر ہوا
بارِ اول ظلمتوں نے روشنی کی دید کی
یعنی نورِ حق نے اب ظلمات کی تردید کی
آئی خالق کی صدا ''کن''
ہو گیا ''فیکون'' یک
دوزخ و جنت، فرشتے، آسماں، کوہ و دمن
پیدا ہوئے
نہر، دریا، پیڑ، پھل، پودے نمود افزا ہوئے
خالقِ باری نے مٹی سے کیا تخلیق آدم کا وجود
اور فرشتوں کو دیا حکمِ سجود
سب فرشتوں نے کہا اللہ اکبر، سر بہ خم
منکرِ تخلیقِ آدم نے نہیں سجدہ کیا
پھر وہ مردودِ خلائق راندۂ درگاہ تھا
صورتِ ابلیس نفرت کی علامت ہو گئی
بند اس پر خالقِ برحق کی جنت ہو گئی
پھر بھی وہ مردود اپنی ضد سے باز آیا نہیں
سانپ کی صورت بدل کر داخلِ جنت ہوا
حق نے جو ممنوع فرمایا تھا اس پھل کی طرف
حضرتِ آدمؑ و حواؑ کو بیک للچا دیا
اس قدر ترغیب دی دونوں نے وہ پھل کھا لیا
اس طرح ابلیس نے انسان سے بدلہ لیا
حضرت آدمؑ بھی حواؑ کی رفاقت میں بہشتِ خاص سے

اس زمیں پر عرش سے بھیجے گئے
ساتھ ہی شیطان بھی نکلا دیارِنور سے
حشر تک انساں کو بہکانے کی خاطر
اس میں خالق کو نا منظور تھی توہینِ آدم
اس نے جو تعظیمِ آدم پر سبھی
جن و ملک کو کر دیا تھا یک سجود
پھر زمیں پر کیسے وہ تکلیفِ آدم دیکھتا
نسلِ آدم کی نمودِ انسانیت کے حق میں تھی
در حقیقت زندگی حقانیت کے حق میں تھی
اک سفر جب طے ہوا آدم سے ابراہیم تک
تب ہوا اک فیصلہ صادر خدا کی سمت سے
"اپنے اسماعیل کو قربان کر میرے لیے"
اپنے رب کے حکم پر "لبیک" ابراہیم کی
موجبِ رحمت ہوئی
ذبح دنبہ ہو گیا صدقے میں اسماعیل کے
چھا گئے ہر سو اجالے نور کی قندیل کے
پھر بہ صد اعزاز و رحمت حکم تھا اللہ کا
"میرا گھر تعمیر کر"
وادیِ مکہ میں ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے
پتھروں کو توڑ کر ڈالی بنائے خانۂ حق الیقیں
پھر چنیں کعبہ کی دیواریں
کہا آقائے ما ربِ کریم

دیکھ اسماعیلؑ وابراہیمؑ کی سعی واطاعت

ہم نے تیرا گھر بنایا گر قبول افتد زہے عز وشرف

تاابد قائم رہے گا خانہءکعبہ کا جلال

کیونکہ ہے وحدانیت کی اک یہی روشن مثال

(ص: 11 تا 14)

اس آزاد نظم کی بدولت شاہدہ لطیف کے ملی ادراکات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے جہاں تخلیقِ کائنات کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کو اجمالی انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یہی ان کے ایجاز واختصار کا کرشمہ ہے کہ انہوں نے ایک آزاد نظم کے مختصر پیمانے میں تاریخ انسان کو سمو دیا ہے جس میں علم البشریات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے استفادہ کی فزوں تر گنجائش موجود ہے۔ تخلیقِ کائنات، تخلیقِ آدم، آدم کا سجدۂ تعظیمی پھر آدم وحوا کو شیطان کا بہکانا پھر حضرت آدمؑ کا بہشت سے خروج پھر حشر تک انسان کو شیطان کا بہکانا حضرت ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو راہِ خدا میں قربان کرنا، پھر جنتی دنبے کا ذبح ہوجانا اور مکہ معظّمہ کی تعمیر، یہ سب امور اس نظم کے فحوائے بیاں میں شامل ہیں۔ یہ کہنے کو تو ایک آزاد نظم ہے لیکن ملی تاریخ پر محیط ہے۔ یہ نظم بحر رمل محذوف/مقصور میں کہی گئی ہے جس کا وزن "فاعلاتن فاعلن / فاعلان" ہے۔ آزاد نظم ہونے کے باعث اس کے عروضی ارکان میں تعددی مغائرت کا عنصر پایا جاتا ہے۔

حضورص کی آمد کے پسِ منظر میں ان کی کہی گئی ایک آزاد نظم بعنوان "حضرت آمنہؑ کا لعل" نذرِ قارئین ہے۔ ان کی آمد کے تاثیراتی کوائف کو مختصراً یوں پیش کیا ہے۔ یہ نظم بحر ہزج میں کہی گئی ہے۔

حضورؐ آئے ، حضورؐ آئے، حضورؐ آئے

حضورؐ آئے تو یوں آئے

کہ نابیناؤں کی آنکھوں میں نور آیا

کہ جیسے خستہ جاں اور مضطرب دل کو سرور آیا

حضورؐ آئے تو صحرا نے کہا لبیک آقائی
سرِ تسلیم خم ہے ملجا و ماویٰ و مولائی
چمک اٹھا مقدر خامشی گفتار میں بدلی
قدم رنجہ جو فرمایا زمیں گلزار میں بدلی

(ص:18)

شاہدہ لطیف نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی غارِ حرا سے نسبت کو ''مکتبِ غارِ حرا میں'' کے سرنامے کے تحت یوں پیش کیا ہے۔

ہوئے چالیس سالہ آپؐ جب
دل کو رجوعِ جانبِ غارِ حرا پایا
خدیجہ سے یہ فرمایا کہ دل بے چین ہے
غارِ حرا کی سمت جاتا ہوں
وہاں پہنچے کہا آ کر یہاں تسکین پاتا ہوں
یہی معمول رکھا دیر تک کتنے دنوں تک

(ص:23)

اب کچھ استشہادات ان کے ملی تناظر میں ان کے نعتیہ مجموعۂ کلام ''نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' سے لاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حسنِ سلوک کے حوالے سے ایک بوڑھی یہودی عورت کا واقعہ مشہور ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر معمول کے مطابق کوڑا کرکٹ پھینکتی تھی۔ آپؐ وہ کوڑا سر سے مسکرا کر ہٹا دیتے تھے۔ جب ایک دن وہ اپنا یہ عمل نہ دہرا سکی تو پتہ چلا کہ وہ بوڑھی عورت بیمار ہے۔ آپؐ نے نہ صرف اس کی عیادت کی بلکہ اسے مشرف بہ اسلام بھی کیا۔ شاہدہ لطیف نے بڑی عمدگی سے اس واقعہ کو مثنوی کے انداز میں بعنوان ''یہودی عورت'' منظوم کیا۔ ملاحظہ کیجئے۔ یہ نظم بحرِ متقارب مثمن محذوف میں کہی گئی ہے جس کا وزن ''فعولن فعولن فعولن فعل'' ہے۔

مدینے میں رہنے لگے جب نبیؐ

یہودی تھی اکثر ہی ناراض بھی
یہ ناراضی بڑھ کر عداوت بنی
عداوت سے بڑھ کر شقاوت بنی
نبیؐ کا گزر جس گلی سے تھا روز
کوئی منتظر بے کلی سے تھا روز
نہیں کوئی اور اک یہودن تھی وہ
اگرچہ بڑی عمر کی زن تھی وہ
گراتی تھی چھت پر سے کوڑا سبھی
گزرتے تھے کوچے سے جس دم نبیؐ
نبیؐ تو برا مانتے ہی نہ تھے
برا کہنا وہ جانتے ہی نہ تھے
یہ معمول تھا مسکرا دیتے تھے
گرا کوڑا سر سے ہٹا دیتے تھے
مگر ایک دن جب نہ کوڑا گرا
نبیؐ کچھ ہوئے فکر میں مبتلا
دی دستک کہ پوچھیں ذرا خیریت
کہ مطلوب بڑھیا کی تھی عافیت
صدا آئی آ جاؤ در ہے کھلا
مجھے دیکھنے کون آیا بھلا
نبیؐ گھر میں آہستہ داخل ہوئے
نہیں شک فرشتے بھی نازل ہوئے
پڑی پیر زن چارپائی پہ تھی

نڈھال ایسے اٹھنے کی کوشش نہ کی
نبیؐ نے قریب آ کے ماتھا چھوا
بکار اس کو تھا تیز چڑھا ہوا
کوئی دیکھنے والا اس کا نہ تھا
جو ہوتا ہے گھر کا وہ نقشہ نہ تھا
گھڑے خالی سے نصف پیالہ بھرا
سرہانے سے بڑھیا کو اونچا کیا
لگا کر لبوں سے پیالہ کہا
میں لاتا ہوں کچھ کھانے کو اور دوا
نبیؐ لے کے آئے کھجور اور دودھ
دوا بھی کہ قائم ہو جس سے وجود
نبیؐ صبح و شام اس کی خدمت میں تھے
وہ رحمت بنے جو حقارت میں تھے
بحالِ صحت کے بعد ایک دن
کہا پیرزن نے ، تھی خدمت کٹھن
مگر اپ نے حق ادا کر دیا
مرا ساتھ اپنوں سے بڑھ کر دیا
میں ایمان لاتی ہوں اسلام پر
مجھے فخر ہے اپنے انجام پر
کہ دامانِ رحمت مجھے مل گیا
اب اللہ سے چاہیے اور کیا

(ص: 76 تا 79)

مثنوی ھذا سے شاہدہ لطیف کی مدعا نگاری کا قرینہ آشکار ہوتا ہے۔ واقعے کی مکمل جزئیات کو پیش کر دیا۔ کہیں بھی تشنگی کا احساس نہیں۔ کہیں بھی تکنیکی معاملات نے راستہ مسدود کرنے کی ناکام کوشش نہیں کی جس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فکر وفن پر کس قدر دسترس رکھتی ہیں۔ عروضی تلازمات کا التزام قرینہ کاری کا مظہر ہے۔ جملہ بیانی نزاکتوں کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ کوئی بھی پہلو فروگزاشت نہیں ہوا جوان کے قادرالکلام ہونے کی بین دلیل ہے۔

شاہدہ لطیف کا ملی تناظر بہت وسیع ہے۔ ان کا فکری کینوس ملی ادراکات سے مالا مال ہے۔ ان کی حمد نگاری، نعت گوئی اور منظوم سفر نامہ ''بیت اللہ پر دستک'' ان کے ملی تناظرات کے شعبے ہیں جس سے اس حقیقت کو تقویت ملتی ہے کہ وہ ایک دائیں بازو کی شاعرہ ہیں۔ مذہب وملت ان کی اولین ترجیح ہے جس سے قومی شعور بھی ہم آہنگ ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

شاہدہ لطیف کے منظوم سفر نامہ ''بیت اللہ پر دستک'' کا تجزیاتی مطالعہ

سفر نامہ عام طور پر سہل صنفِ ادب شمار کی جاتی ہے مگر اس کے تمام تر فنی اور تکنیکی امور سے عہدہ برآ ہونا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ تمام معیارات کی بازیافت جوئے شیر لانے سے مترادف ہے۔ پھر منظوم سفر نامہ نگاری اس سے بھی زیادہ دقت طلب عمل ہے۔ سفر نامہ کی تمام تر جزئیات کو موزونیت کے سانچے میں ڈھالنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر جواں جذبے ہوں، عزم بالجزم ہو، خلوص وعقیدت کا بحرِ بے کراں تلاطم خیز ہو تو کوئی بھی دشواری سنگِ راہ نہیں ٹھہرتی۔ راہیں خود بخود ہموار ہونا شروع ہو جاتی ہیں کیونکہ ذوق وشوق ایک طوفان کا نام ہے جو اپنے راستے خود بناتا ہے اور راستے کی تمام تر رکاوٹوں کو خس وخاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

خدا معلوم کتنے شعراو شاعرات کو حج وعمرہ کی سعادت نصیب ہوئی ہوگی لیکن منظوم سفر نامہ لکھنے کا اعزاز صرف شاہدہ لطیف کو ہی میسر آیا ہے۔ البتہ ادبا حضرات کے منثور سفر نامے اس سلسلے میں موجود ہیں۔ شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے منظوم سفر نامہ ''بیت اللہ پر دستک'' مطبوعہ 2012ء کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ کتاب ھذا ہر نوع کے تاثرات سے مبرا و ماورا ہے البتہ کتابی سلسلہ ''رنگِ ادب کراچی'' مطبوعہ نومبر 2019ء شمارہ نمبر 50 میں موجود اس حوالے سے کچھ اربابِ نقد ونظر کی آراء ملاحظہ کریں۔

> ''حج وعمرہ کے دوران جو عمل ہر ایک انسان سب سے زیادہ کرتا ہے، وہ اپنے خالقِ حقیقی سے دعا مانگنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسان خالق کا محتاجِ کرم ہے اور وہی پوری دنیا کو دینے والا ہے۔ اس لیے بیت اللہ اور روضہء

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دعاؤں کی مقبولیت کی سند ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان دعا کو بھی عبادت کا ہی ایک درجہ اور رکن سمجھ کر ادا کرتا ہے۔ پھر یہ اس کی ضرورت بھی ہے اور خواہش بھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہدہ لطیف نے بھی اپنے رب کریم سے دل ہی دل میں بہت کچھ مانگا ہوگا۔ یہ ان کے رب کے درمیان کا معاملہ ہے۔ مگر جو انہوں نے ''بیت اللہ پر دستک'' منظوم سفر نامے میں ظاہر کر دیا ہے، وہ ملاحظہ ہو جس سے ان کی کچھ دلی خواہشات، ارمان، امنگوں، چاہتوں، ضرورتوں اور حسرتوں کی آگاہی ملتی ہے۔''

(''تین منظوم سفر نامے'' از ڈاکٹر جاوید منظر۔ ص: 195)

''شاہدہ لطیف اردو میں سفر نامہ نگاری کی موجد ہیں یا نہیں، میرے نزدیک اس سوال سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ان کے منظوم سفر نامے موضوعات و اسالیب کے اعتبار سے معیاری ہیں یا نہیں۔ جمیل الدین عالی نے شاہدہ لطیف کو اچھی نظر اور حسس دل کی مالکہ قرار دے کر ان کے منظوم سفر ناموں کو ایک نئی معنویت عطا کی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے ان منظوم سفر ناموں میں شاہدہ لطیف کی شعری قادر الکلامی کی مدح سرائی کی ہے۔ انہیں دلچسپ اور قارئین کے لیے ذہنی آسودگی کا باعث قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں شاہدہ لطیف کے یہ منظوم سفر نامے کسی آوارہ گرد کی ڈائری کے پارینہ اوراق نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہوش منداور زیرک شاعرہ کا تخلیقی سفر نامہ ہے جس نے انتہائی ہنرمندی اور دانشوری سے اپنے سفری واقعات و جذبات کو انتہائی طریقے اور سلیقے سے شعری پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔ محمد حسین آزاد، حالی اور اقبال نے اردو شاعری میں جس موضوعاتی تنوع کا احساس دلایا تھا، یہ منظوم سفر نامے اس

کی توسیع معلوم ہوتے ہیں۔''

(''شاہدہ لطیف کے منظوم سفرنامے''از ڈاکٹر سید شبیہ الحسن۔ص:315-316)

''زبان نہایت صاف اور شستہ استعمال کی گئی ہے۔کلام میں اثر خلوص اور خیالات میں تنوع، باطنی کیفیت کا وہ اظہار ہے جسے ہم احساسات کی شدت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عقیدت کی فراوانی کے باوجود عقیدت میں غلو کا شائبہ تک نہیں۔اثر آفرینی کیا ہے؟حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کعبۃ اللہ سے والہانہ محبت و وارفتگی کا کرشمہ ہے۔روحانی مسرت کا ایسا صحیفہ ہے جو دلوں میں زندہ رہے گا۔''

(''بیت اللہ پر دستک''ایک مطالعہ۔از ڈاکٹر مظہر حامد۔ص:468)

مذکورہ بالا آرائے سے شاہدہ لطیف کے منظوم سفرنامہ ''بیت اللہ پر دستک'' سے ان کے اس سفرنامہ کی فکری و فنی قدر و منزلت کا تعین بہ حسن و خوبی کیا جا سکتا ہے۔ان کے اس فن پارے کی بدولت فکر و فن کے اس بحرِ تلاطم خیز میں غواصی کی جا سکتی ہے۔ان کے خلوص و مروت اور عقیدت و ریاضت کی نقاب کشائی کی جا سکتی ہے۔ان کے تکنیکی امور کو سمجھا جا سکتا ہے۔ان کا یہ منظوم سفرنامہ بھی ان کے ملی تناظر کا ایک حوالہ ہے جس میں حب الوطنی کے شواہد بھی موجود ہیں۔امت مسلمہ کے حوالے سے ایک دردِ دل کا پہلو بھی ہے۔یوں ان کا ملی احساس قومی شعور سے ہم آغوش ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ایک بندۂ مومن جب کسی کام کا آغاز کرتا ہے تو وہ دعا کے مرحلوں سے گزرتا ہے کیونکہ وہ صرف خدا کی ہی عبادت کرتا ہے اور اس سے ہی مدد مانگتا ہے۔اس سفرنامے میں مختلف شعری ہیئتوں کو بروئے کار لایا گیا ہے۔انہوں نے غزل کی ہیئت کو بکثرت برتا ہے۔علاوہ ازیں مثنوی کو بھی زیرِ استعمال لائی ہیں اور دیگر کلاسیکی اصنافِ نظم کی ہیئتوں کا بھی التزام کیا ہے۔اپنے مدعا کو آزادانہ انداز میں بیان کرنے کے لیے آزاد نظم سے بھی استفادہ کیا ہے۔

ذیل میں ان کی سفر کی دعا ملاحظہ کریں جس کا عنوان ''سفر کی دعا'' ہے جو غزل کی ہیئت میں ہے۔غزل کی ہیئت میں انہوں نے مطلع و مقطع کی روایت کو بھی نبھایا ہے۔یوں اس ہیئت کو کسی

نوع کی تشنگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

مرے پسینے کو بھی تو گلاب کر دینا
مرے خدا یہ سفر کامیاب کر دینا
میں دشمنوں کے لیے بھی دعائیں کرتی ہوں
بس ان کی سازشیں تو بے نقاب کر دینا
ستارہ جو مرا گردش میں ہے سرِ افلاک
سفر میں ہوں تو اسے ماہتاب کر دینا
اس احترام کے لائق تو میں نہیں تھی مگر
ترا کرم ہے مرا انتخاب کر دینا

(ص:32)

ان کی ایک اور نظم ''پہلی نظر پہلی دعا'' قابلِ ذکر ہے جس میں ان کے ملی تناظر کے پہلو بہ پہلو قومی حوالہ بھی موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مملکتِ خداداد پاکستان سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں نسائی احساسات کی جھلکیاں بھی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہیں۔ خداخوفی کا ایک ہمہ گیر پہلو ہے جو بین السطور محسوس ہوتا ہے جو ان کی مقبولیت و پذیرائی کی اساس ہے۔ مثنوی کی ہیئت میں یہ نظم پیشِ خدمت ہے جو بحر رمل مثمن محذوف میں کہی گئی ہے۔ اس کا وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

کہتے ہیں تم جوں ہی دیکھو خانہ کعبہ کی جبیں
جو بھی مانگو گے دعا مقبول وہ ہو گی وہیں
یہ روایت اس لیے ہے انتہائی معتبر
کیونکہ ہے اک سلسلہ رب الیقیں سے تابشر
دوست اور احباب کہتے تھے فلاں مانگو دعا
جو بھی دل میں آرزو ہو تم وہاں مانگو دعا

میرے دل میں تھیں دعائیں ملک و ملت کے لیے
اس کے استحکام کی خاطر، اخوت کے لیے
پر مرے لب پر اچانک آ گئی ایسی دعا
خود ہوئی حیران میں مانگی ہے یہ کیسی دعا
مجھ کو شہزادی بنا دے میرے ہونٹوں نے کہا
ہے یقیں مجھ کو کہ اس کو میرے رب نے سن لیا
میں دلوں پر اج کرتی ہوں خدا کے ذکر سے
میری ہوتی ہے پذیرائی خدا کے فکر سے

(ص:38-39)

حج وعمرہ کی روداِدِ سفر ہو اور آبِ زم زم جیسی نعمتِ بے بدل کا ذکر نہ ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔شاہدؔہ لطیف نے جس انداز میں آبِ زم زم کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہ قابلِ داد ہے۔اسی حوالے سے ان کی ایک نظم بعنوان ''آبِ زم زم'' لائقِ ذکر ہے جو مثنوی کی ہیئت میں ہے اور مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہی گئی ہے۔

آبِ زم زم پائے اسماعیلؑ کی تفسیر ہے
یہ خدائی معجزے کی عالمی تصویر ہے
ماورائے عقلِ انساں جاری ہونا آب کا
پائے اسماعیلؑ پر صد واری ہونا آپ کا
اور''زم زم'' کی صدا ''تھم جا'' پہ جا کر رک گئی
چادرِ آبِ رواں صحرا میں آ کر رک گئی
مقصدِ ربِ کریم و مالکِ مخلوق تھا
کوئی اسماعیل سا پیاسا نہ ہو ماں سے جدا
تب سے اب تک جاری و ساری ہے یہ آبِ حیات

جس کو پی کر مومنوں کی ہے بدلتی کائنات
''آب زم زم'' جس کو ایسا نام رحمانی ملا
آپ ہے بے رنگ اس میں رحمتوں کا رنگ ہے

(ص: 51-52)

اشاہدہ لطیف کی مذکورہ بالا نظم ان کے علوئے فکر کا شہکار ہے۔اندازِ بیاں انتہائی عمدہ ہے۔ اس نظم میں آبِ زم زم کا تاریخی پس منظر بھی پیش کر دیا گیا ہے۔اسلامی حوالے سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔آخری شعر کے آخری مصرع میں صنعتِ تضاد کا استخدام ان کی قرینہ کاری کا مظہر ہے۔

خدائے بزرگ و برتر کے حضور شاہدہ لطیف کے احساسات قابلِ قدر ہیں جو غزلیہ ہیئت میں ہیں اور بحر متدارک مثمن سالم میں ہیں جس کا عروضی وزن ''فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن'' ہے۔ان کی فکریات میں گہرائی و گیرائی کے تلازمات پائے جاتے ہیں جس میں فکری ترفع بھی ہے اور وسیع تر نفسیاتی امکانات بھی ہیں جس سے ان کے کلام کی فلسفیانہ سطح بلند ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے،قابلِ ذکر ہے۔

تیری عظمت جہاں اے خدا اے خدا
میرا سجدہ وہاں اے خدا اے خدا
تو نے پگھلا دی ہے برف کہسار سے
میں ہوں آبِ رواں اے خدا اے خدا
نام لینے کو لیتی رہوں گی ترا
میں کہاں تو کہاں اے خدا اے خدا
غم بڑی دیر تھا ساتھ جاتا رہا
شاد ہوں ناگہاں اے خدا اے خدا
اپنے محبوب کی پھر کہانی سنا

کیوں بجھی کہکشاں اے خدا اے خدا
کب سے اک اک دعا کرتی جاتی تھی میں
بن گیا کارواں اے خدا اے خدا
کہہ فرشتوں سے عنوان لے جائیں بس
کیا مری داستاں اے خدا اے خدا
مہربانی جہاں بھر سے جھوٹی ملی
سچا تو مہرباں اے خدا اے خدا

(ص:67)

شاہدہ لطیف کے ہاں حب حبیبِ کبریا ﷺ ملاحظہ کیجئے۔ آزاد نظم کی ہیئت میں نظم ''حبیبِ کبریاؐ'' پیش نظر ہے جو بحر ہزج مقبوض میں کہی گئی ہے۔ جس کا عروضی وزن ''مفاعلن مفاعلن'' ہے۔ آزاد نظم ہونے کے باعث عروضی ارکان میں تعدد مغائرت کا پہلو پایا جاتا ہے۔

کنیز خوش نصیب ہے
کہ وہ حبیبِ کبریاؐ کے روضے کے قریب ہے
ہوتے ہیں لاکھوں سجدہ ریز بندگانِ حق یہاں
ملک فلک سے آرہے ہیں آج تک درود کو
یہ ہر سو ملک ملک سے اُمڈ رہے ہیں قافلے
زباں پہ صرف ایک نام
یا حبیبِ کبریاؐ
یا حبیبِ کبریاؐ

(ص:70)

شاہدہ لطیف کا وصفِ خاص یہ ہے کہ وہ پاکستان سے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محبت کرتی ہیں اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان سے محبت کرنے والوں کو ہر جگہ عزت و تکریم سے نوازا

جاتا ہے۔ان کے ملی تناظر کے پہلو بہ پہلو ان کی شاعری کا قومی افق بھی قابلِ داد ہے۔اس حوالے سے ان کا شعری مجموعہ ''میں پاکستانی ہوں'' مطبوعہ اگست 2000ء خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شخصیت میں پاکستانیت اور پاکستانیات کی جولہر ہے، وہ جنوں خیز بھی ہے اور قابلِ رشک بھی ہے۔ ہم نے جو کچھ اپنی عسکری زندگی میں سیکھا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جسے دیس کی محبت عطا ہو گئی، اسے بہت کچھ عطا ہو گیا۔ یہی معاملہ کچھ شاہدہ لطیف کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ حج وعمرہ کے اس مقدس سفر میں بھی کبھی پاکستان کو نہیں بھولیں۔ یہی پاکستان سے ان کی بے پایاں محبت کا اظہار بھی ہے۔ گویا شاہدہ لطیف اور پاکستانیات لازم وملزوم ہیں۔ ان کی غزل کا ایک مطلع ان کی اسی فکر کی عکاسی سے مربوط ہے جو بحر ہزج مثمن محذوف میں کہا گیا ہے۔ اس کا وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

میں پاکستان کے حق میں دعا کرتی رہوں گی
فرائض جو بھی ہیں میرے، ادا کرتی رہوں گی

(ص:89)

ان کی ایک اور غزل میں ان کا استدعائی انداز قابلِ داد ہے جس میں سوز وگداز ہے اور خدا خوفی بھی ہے۔ اعمالِ حسنہ سے والہانہ محبت کا اظہار ہے۔ ایک احساسِ سپاس گزاری ہے جو کشف وکرامات کا متقاضی ہے جس میں جامِ جم جیسا تلمیحاتی تاثر بھی ہے۔ وہ خدا کی رحمتوں کی طلب گار ہیں۔ یہ غزل بحر سریع مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن'' ہیں۔

میری زندگی کے مالک مجھے چشمِ نم عطا کر
جو ترے قریب لائے وہی سوزِ غم عطا کر
جو مجھے بھی لے کے جائے ترے برگزیدگاں میں
وہی راستہ دکھا دے وہی پیچ وخم عطا کر
جو ہوئیں عنایتیں وہ نہیں کم کسی طرح بھی

رہے کچھ بھرم اسی کا مجھے اب نہ کم عطا کر
یہ جو آئینے ملے ہیں مجھے چہرہ دیکھنے کو
مجھے کم طلب تھی ان کی کوئی جامِ جم عطا کر
نہ رہے کوئی بھی حسرت نہ سماج کی سماجت
مجھے رحمتوں کے تحفے تو قدم قدم عطا کر

(ص:97)

مذکورہ بالا استشہادات سے یہ امر پایہء تیقن کو پہنچتا ہے کہ شاہدہ لطیف نے اپنے منظوم سفر نامہ ''بیت اللہ پر دستک'' میں فکروفن کے معیارات کی بازیافت کو سہل تر کر دیا ہے جسے ان کی تکنیکی مہارت کا منہ بولتا ثبوت گردانا جا سکتا ہے۔ ہم نے اپنے اس تجزیاتی مطالعہ میں ان کے سفرنامہ کو جزوی طور پر زیرِ بحث رکھا تاکہ قارئین اور محققین و ناقدین کی دلچسپی اس کے انتقادی امکانات کے حوالے سے برقرار رہے۔ البتہ یہ امر طے ہے کہ وہ خلوص و ریاضت اور عرق ریزی کے عناصرِ ثلاثہ پر یقین رکھتی ہیں۔ اسی میں ہی ان کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔

شاہدہ لطیف اور کشمیریات

دو قومی نظریے کے تحت پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ تقسیمِ ہند کے منصوبے میں یہ امر طے شدہ تھا کہ مسلم اکثریتی علاقوں کو پاکستان میں شامل کیا جائے گا لیکن افسوس صد افسوس ہندو ذہنیت کی ریشہ دوانیوں اور انگریزوں کی مسلم دشمنی نے تقسیمِ ہند کے عمل کو متنازع بنا دیا۔ جہاں فیروز پور، گورداس پور اور دیگر مسلم اکثریتی ریاستوں کو جبراً فوج کشی کر کے بھارت کے ساتھ الحاق کر دیا گیا۔ کشمیر کے ہندو ڈوگرہ راجہ نے کشمیری عوام کے استصوابِ رائے کے حق کو نظر انداز کر دیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت ہی بھارت نے کشمیر پر چڑھائی کر دی۔ جسے معمول کی عسکری نقل و حرکت کا نام دیا گیا۔ یوں پاکستان اور بھارت کے درمیان سنسنی خیز جنگ ہوئی۔ افواج پاکستان نے کشمیر کے ایک تہائی حصے کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرا لیا جسے آزاد جموں و کشمیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب بھارت کو اپنی ہار نظر آئی اور کشمیر ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہوا تو اس نے اقوامِ متحدہ میں جا کر جنگ بندی کی اپیل کر دی۔ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کے استصوابِ رائے سے ہونا قرار پایا مگر پون صدی کا خطیر عرصہ گزرنے کے بعد بھارت اب بھی کشمیر پر غاصبانہ جمائے ہوئے ہے۔ اقوامِ عالم کا ضمیر خاموش تماشائی بنا ہوا ہے مگر اہلِ کشمیر اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور تاریخ اپنے خون سے رقم کر رہے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بھارت نے اگست 2021ء میں کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم کر دیا ہے۔ نام نہاد سرچ آپریشن کی آڑ میں انہیں روز ہراساں کیا جاتا ہے۔ بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور نو جوانوں کو روز شہید کیا جاتا ہے۔ بھارت اپنی ریاستی دہشت گردی کے بل بوتے پر اپنی طاقت سے کشمیر کی جنگِ آزادی کو

دبانا چاہتا ہے لیکن تاریخِ عالم شاہد ہے کہ آزادی کی تحریکوں کو نہ طاقت سے نہ اور کسی حیلے بہانے سے روکا جا سکتا ہے۔ بھارت جو سیکولر ریاست ہونے کا نام نہاد دعویٰ کرتا ہے، جو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت سمجھتا ہے، جہاں اقلیتوں کی نسل کشی کی جاتی ہے، جہاں انہیں ہر تعصب کا نشانہ بنایا جاتا ہے، جہاں مذہبی انتہا پسند ہندوؤں کو بالادستی حاصل ہے، نوشتہ دیوار پڑھنے سے قاصر ہے۔ اگر تاریخِ عالم کی ورق گردانی کریں تو یہ امر اظہر من الشّمس ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت جس کی نوآبادیات میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، جو اتنی وسعت کی حامل تھی، اس کی نوآبادیات قائم نہ رہ سکیں۔ یہ معاملہ فرانس اور جرمنی کا بھی ہے۔ اگر برِاعظم ایشیا کے حوالے سے بات کی جائے تو نہ روس افغانستان پر قابض رہ سکا، نیو ورلڈ آرڈر کا حامل امریکہ جو دنیا میں سپر پاور بننے کا خواب دیکھ رہا ہے، اسے بھی افغانستان میں پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اللہ کے فضل و کرم سے ایک دن بھارت کو بھی منہ کی کھانی پڑے گی۔

اس وقت کشمیری مجاہدین اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دو ایٹمی طاقتوں پاکستان اور بھارت میں کشیدگی کی فضا پائی جاتی ہے جس کا اہم محرک مسئلہء کشمیر ہے۔ جب تک کشمیر کو آزادی نہیں ملتی، دنیا میں پائیدار امن کا حصول کسی دیوانے کے خواب سے کم نہیں اور ہمارے سروں پر عالمی جنگ کے خطرات منڈلاتے رہیں گے۔ پاکستان ہمیشہ اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں کی اخلاقی اور سفارتی امداد جاری رکھے گا اور کشمیر کے شانہ بشانہ ہماری پوری قوم کھڑی رہے گی۔ نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں پر اس جنگ کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ نظریاتی انقلاب عملی انقلاب کی راہیں ہموار کرتا ہے اور اس سلسلے میں دعوت و تحریک کا تاثر بھی رکھتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان تین جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔ ہنوز کشیدگی کی فضا پائی جاتی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ مسئلہء کشمیر ہے۔ دونوں ممالک کے سفارتی تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے مسئلہء کشمیر کا حل اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق ناگزیر ہے۔ کاش بھارتی مقتدر طبقے کو اس حقیقت کی سمجھ آ جائے تو دونوں ممالک کے لیے معاشی خوشحالی کی منزل کا حصول سہل تر ہو جائے گا۔ معیشت مضبوط سے مضبوط تر ہو جائے گی اور عوام کا معیارِ زندگی بھی بلند ہوگا۔

دفاع پر صرف ہونے والا خطیر بجٹ عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوگا۔

پاکستانی شعر و ادب میں کشمیریات کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس حوالے سے مزید بہت کچھ لکھنے کی ضرورت بھی ہے۔ کشمیر کے نظریہء انقلاب کے حوالے سے لکھنے والوں میں ایک اہم اور معتبر نام شاہدہ لطیف کا بھی ہے۔ اس دخترِ پاکستان نے اپنی شعریات میں کشمیریات کے حوالے سے تمام تر شعری ہیئتوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظمیات کے شعبے میں تو اس حوالے سے 1947ء سے لکھا جا رہا ہے مگر شاہدہ لطیف ایک ایسی شاعرہ ہیں جنہوں نے کشمیری غزل کو بھی متعارف کرایا ہے۔ ایسی ہی بناتِ ملت ہماری قوم کا سرمایہء افتخار ہیں۔ وہ ملک و ملت کے لیے فزوں تر دردِ دل رکھتی ہیں۔ ان کا دل ابنائے ملت کے دکھ درد میں کڑھتا رہتا ہے۔ ہمیں شاہدہ لطیف کی شخصیت کا جو پہلو سب سے زیادہ پسند آیا ہے، وہ ان کا ملی و قومی شعور ہے۔ کاش ایسی ہی حب الوطنی اور اپنی ملت سے خلوص ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد میں پیدا ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ملتِ اسلامیہ کو جادۂ ارتقا پر گامزن ہونے سے نہیں روک سکتی۔ شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے شعری مجموعہ ''معرکہء کشمیر'' مطبوعہ جولائی 2001ء کے حوالے سے تجزیاتی حاشیہ آرائی کر رہے ہیں جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی یہ کتاب دو بار زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔ شعری حوالے سے اس میں تمام تر ہیئتی تجارب موجود ہیں۔ جس میں غزل بھی ہے اور نظم بھی ہے۔ نظم کی ہیئتوں میں مثنوی، ثلاثی، قطعات اور آزاد نظم شامل ہیں اور انہوں نے فکری و فنی حوالے سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ملک و ملت سے محبت بھی ایک قومی تقاضا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ہم ابھی تک نہ سچے مسلمان ثابت ہو سکے ہیں اور نہ صحیح معنوں میں محب وطن پاکستانی بن سکے ہیں۔ سچے مسلمان ہونا اور سچے پاکستان ہونا بھی ایمانیات کی مقتضیات میں شامل ہے۔ اگر ہم سچے پاکستانی ہی بن جائیں تو ہمارا ملی تشخص بھی محفوظ رہ سکتا ہے۔ خدائے لم یزل سے استدعا ہے کہ وہ ہمیں شاہدہ لطیف کی طرح راسخ العقیدہ سچا مسلمان اور صحیح معنوں میں محبِ وطن پاکستانی بنائے۔ ملک و ملت سے محبت کا جذبہ بھی اساسیاتِ عبادت میں شامل ہے۔

اس سے قبل کہ ہم شاہدہ لطیف کے مجموعہء مذکور کے تجزیاتی عمل سے گزریں، اس حوالے

سے یہ دیکھنا بھی ناگزیر ہے کہ اربابِ نقد و شعر کے ہاں ان کے اس مجموعہ ءکام کے حوالے سے کیا تاثرات پائے جاتے ہیں کیونکہ جمہوری تنقیدی تناظر میں کسی نقادِ واحد کے تاثرات کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہوتے جب تک انہیں اجتماعی پس منظر میں نہ دیکھا جائے۔ سب سے پہلے اس مجموعہ ءکلام میں موجود تاثرات نذرِ قارئین کیے جاتے ہیں کیونکہ طباعتی حوالے سے زمانی ترتیب کا تقاضا بھی یہی ہے۔

''شاہدہ لطیف علمی و ادبی حلقوں میں معروف شخصیت ہیں۔ مشہور ادیبہ اور شاعرہ ہونے کے علاوہ متعدد کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ انہوں نے معرکہ ء کشمیر میں رونما ہونے والے واقعات کا تجزیہ کیا ہے۔ ممکن ہے اور بھی لوگوں نے اس پر طبع آزمائی کی ہو، لیکن شاہدہ لطیف کی یہ کتاب بالکل اچھوتے انداز میں معرکہ ءکشمیر کو اجاگر کرتی ہے۔''

(''اچھوتے انداز میں معرکہ ءکشمیر'' از سردار محمد عبدالقیوم خان، چیئرمین نیشنل کشمیر کمیٹی، ص:12)

''شاہدہ لطیف کا شعری مجموعہ ''معرکہ ءکشمیر'' جہاں مقبوضہ کشمیر میں برسرِ پیکار مجاہدین کی جدوجہدِ آزادی میں ان کی لازوال قربانیوں کا اعتراف ہے، وہیں جہادِ کشمیر کی صحیح تناظر میں عکاسی بھی ہے۔ شاہدہ لطیف نے تحریکِ آزادیء کشمیر کو شاعری کے سانچے میں ڈھال کر دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اندازِ بیاں سلیس اور دلچسپ ہے۔ احساسات و جذبات قابلِ ستائش ہیں۔ انہوں نے جس لگن اور محنت سے جہادِ کشمیر کو قلم بند کیا ہے، یہ انہی کا حصہ ہے۔''

(''لازوال قربانیوں کا اعتراف'' از میجر جنرل سردار محمد انور، صدر آزاد جموں و کشمیر، ص:13)

''تاریخی ملزومات کی روشنی میں شاہدہ لطیف زندہ رہنے کی تحریک پیش کرتی ہیں۔ لہٰذا اس کا پیغام یونیورسل ہے، کسی تاریخی منصب کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ شاہدہ لطیف نے عورت ہونے کے ناطے

ایک خاص تہذیب کی نمائندگی کی ہے۔ اس نے اپنے شعر کو تھیوری پریکٹس پر فوقیت دی ہے۔اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کے سربستہ راز کی روشنی میں کشمیر کی غلامی کے قفل کو کھولنا چاہتی ہے۔ کشمیر چونکہ ''پروہت اور سانست کال'' کی گرفت میں ہےاور شاہدہؔ لطیف کواس امر کا ادراک ہے کہ یہ مردہ سماج جو بذاتِ بدذائقہ زوال آمادہ ہے، لہٰذا کشمیر پر اس کا قبضہ تاریخی بصیرت کے خلاف اور خود شکستگی کی علامت ہے۔اس لیے اس کشمیر سے لگن اس فہم سے تعلق رکھتی ہے جسے ہم سچی نمائندگی کہہ سکتے ہیں۔''

(''شاہدہؔ لطیف کا یونیورسل پیغام''از ڈاکٹر رشید نثار،ص:14)

''شاہدہؔ لطیف کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ محض خواتین کے حقوق کی بات ہی نہیں کرتیں بلکہ جہاں بھی انسانوں پر ظلم ہو رہا ہے، وہ ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب ''معرکہء کشمیر'' ہے۔ان کے لیے اہلِ کشمیر کا مسئلہ محض انسانی برادری کے گروہ کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ یہ مسئلہ ان کے ہم مذہب مسلمان بہنوں اور بھائیوں کا مسئلہ ہے۔ اس لیے شاہدہؔ لطیف نے بطورِ خاص کشمیری مسلمانوں کی جد وجہدِ آزادی پر اپنی شاعری کی پوری کتاب رقم کی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا آزادی کی جنگ لڑنے والے ہر مجاہد اوراس کے معرکے میں ظلم وستم کا نشانہ بننے والے ہر مردوزن کا دل ان کے سینے میں دھڑک رہا ہے۔''

(''کچھ محترمہ کے بارے میں''،از جمیل یوسف،ص:16)

''شاہدہؔ لطیف کا نام اربابِ علم و ہنر کے نزدیک محتاجِ تعارف نہیں۔ انہوں نے اس سے قبل دنیائے غزل ونظم میں اپنی تخلیقات کے فانوس

روشن کیے ہیں جن میں ''معجزہ''، ''پاکستان میں فوج کا کردار''، ''میں پاکستانی ہوں''، ''حکایات کا انسائیکلو پیڈیا'' اور حالیہ کتاب ''معرکہء کشمیر'' شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کا منظوم سفرنامہ ''برف کی شہزادی'' خاصے کی چیز ہے۔''معرکہء کشمیر'' اس لحاظ سے ایک اہم کتاب ہے کہ یہ کشمیر کے موضوع پر رسمی اور روایتی بے رس اور بے روح شاعری مجموعہ نہیں ہے بلکہ خالصتاً ایک تخلیقی اور فکری شہ پارہ ہے۔''

(''انقلاب آفریں معرکہ'' از اعتبار ساجد، ص:22)

''حال ہی میں کشمیر کے موضوع پر ان کا شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے جس میں بڑی توانا اور شدت جذبہ و احساس سے بھرپور شاعری موجود ہے۔ اس کتاب میں شامل نظموں اور غزلوں کا ایک ایک موضوع کشمیریوں کے ساتھ شاعرہ کی محبت اور جبر سے نفرت کی گواہی دے رہا ہے۔ یہ شعری مجموعہ کشمیر کے حوالے سے شائع ہونے والی بہت سی کتابوں سے زیادہ بہتر اور خوبصورت ہے۔ وہ تخلیق ہمیشہ زندگی رہتی ہے جو انسانیت کے اجتماعی دکھوں کی ترجمان ہو۔ شاہدہ لطیف کی یہ کتاب بھارتی استبداد کے ساتھ ساتھ سوئے ہوئے عالمی ضمیر پر ایک طمانچہ ہے۔ کشمیر کے موضوع پر شاہدہ لطیف نے بہت اچھی اور پر تاثیر شاعری کی ہے۔''

(''عالمی ضمیر پر طمانچہ'' از سید عارف، ص:25)

''شاہدہ لطیف کی شاعری کا سب سے اہم حصہ ان کی انقلابی غزلیں اور نظمیں ہیں جن میں وہ ہمیں امن کا پیغام دیتے ہوئے آزادی کا گیت سناتی ہیں تو کہیں کشمیر پر جان لٹانے تو کہیں پاکستان سے رشتہ جوڑنے کا سبق دیتی ہیں۔ہمیں ایک ایسے محاذِ جنگ پر کھڑا کر دیتی ہیں، جہاں ایک

روشنی کا مسافر، ایک ماں کی فریاد تو کہیں سری نگر سے خط کو پڑھتے ہوئے ''اب تو سوچو'' کا خیال آنے لگتا ہے۔ ایسی ہی نظمیں ''معرکہء کشمیر'' میں شامل ہیں جنہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ شاہدہ لطیف نے اپنے دور کے خلفشار کی ترجمانی کی ہے۔

(''کشمیر کی بیٹی، شاہدہ لطیف''، از صدام ساگر، رنگِ ادب، شمارہ نمبر 50 ص:368)

اب ہم شاہدہ لطیف کی کتاب ''معرکہء کشمیر'' کے نصف اول کا تجزیاتی مطالعہ پیش کر رہے ہیں۔ نصف اول کو ہم نے انتقادی اکائی کے طور پر لیا ہے تاکہ قارئین و محققین و ناقدین کی دلچسپی ان کی اس تخلیق سے برقرار رہے۔ اس میں سے منتخب غزلیات و منظومات شامل کی جائیں گی اور ان کا مکمل تجزیاتی تناظر پیش کیا جائے گا۔

کرۂ ارضی پر سب سے بڑی عدالت خدائے بزرگ و برتر کی ہے اور وہی سب سے بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ بندۂ مومن کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کرتا ہے اور اسی سے ہی مدد طلب کرتا ہے۔ شاہدہ لطیف نے اس لیے سب سے پہلے کشمیری عوام کا مقدمہ خالقِ کائنات کی عدالت میں پیش کیا ہے کیونکہ وہ اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرنے والا ہے۔ ان کی نظم ''الاؤ'' زیرِ نظر ہے جو اسی اندازِ بیاں کا مظہر ہے۔

اے مرے ربِ کریم و خالقِ ارض و سما
تیری دنیا کے یہ مفلس اور بے مایہ عوام
جن کی قسمت میں مصائب اور تکلیفیں تمام
صبحِ افسردہ ہے جن کی شام بے نیلِ مرام

اس میں کیا شک حسنِ وادی زینتِ گلشن ہیں یہ
لیکن اک جلتے الاؤ کی طرح روشن ہیں یہ

ان کی محنت سے چمکتے ہیں کئی چہروں کے پھول
زندگی میں ہے صداقت جن کا اک زریں اصول

ان گلابوں کے مقدر میں فقط تاریک دھول

عالمِ انسانیت کے ذہن کی الجھن ہیں یہ

لیکن اک جلتے الاؤ کی طرح روشن ہیں یہ

ان کی قسمت کو بدلنے کی ضرورت ہے بہت

ان کو اپنے عزم و ہمت سے محبت ہے بہت

ان میں دنیا کو بدل دینے کی طاقت ہے بہت

ساری دنیا مانتی ہے جوہرِ آہن ہیں یہ

لیکن اک جلتے الاؤ کی طرح روشن ہیں یہ

نظم ھذا کا عنوان موضوعاتی مطابقت کا حامل ہے۔ ہیئتی حوالے سے یہ نظم ثلاثی بند ہے۔ نظم کا پہلا مصرع ہیئت سے ماورا ہے مگر برائے تخاطب استعمال ہوا ہے۔ ہر تین مصرعوں کے بعد ایک شعر لایا گیا ہے۔ شعر میں دوسرا مصرع ٹیپ کا ہے جو خود میں ایک تکراری پہلو رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم قافیہ و ردیف مصرع لگا کر شعر مکمل کیا گیا ہے۔ نظم کی یہ ہیئت کلاسیکی ہیئتوں میں شمار ہوتی ہے۔

یہ نظم بحر رمل مثمن محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔ بحر ھذا ایک رواں دواں بحر ہے جو آہنگ اور غنائیت سے معمور ہے۔ اس بحر کو شعرائے عرب نے مثمن استعمال نہیں کیا مگر فصحائے عجم و ریختہ نے مثمن اور مسدس دونوں طرح استعمال کیا ہے۔ عروض وضرب میں اس بحر کے اشعار ع میں سالم رکن نہیں آتا۔ اس لیے کہ اردو میں سالم ہونے سے شعر بے لطف ہو جاتا ہے۔ شاہدہ لطیف نے بھی اسی عروضی منطق کو زیرِ نظر رکھا ہے۔

اس نظم کے پہلے بند میں اللہ تعالیٰ سے تخاطب ہے۔ اہلِ کشمیر کی معاشی و معاشرتی زبوں حالی کو پیش کیا گیا ہے، جن کی قسمت میں ہر نوع کے مصائب و آلام لکھ دیے گئے ہیں، جن کی صبح افسردگی کا مظہر تو شام ناکامی و نامرادی کی علامت ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ وادیء

کشمیر کا حسن ہیں اور اس کے گلشن کی زینت بھی ہیں۔لیکن یہاں ہونے والے ظلم و جبر کے باعث ان کی حیثیت ایک جلتے ہوئے الاؤ سے مشابہ ہے۔اس بند میں شاہدؔہ لطیف نے ایک خاص اور پرتاثیر استدعائی انداز اختیار کیا ہے جس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے بے مائیگی اور عاجزی و انکساری کا اظہار کیا جاتا ہے جو اہلِ کشمیر کی صورتِ حال کا تقاضا بھی ہے۔ یہ ان کے سخن کا ایک نفسیاتی اور امکانی پہلو ہے۔اس بند میں مرکبات کے استعمال کو بھی بروئے کار لایا گیا ہے جو عمدہ اسلوب کی عکاسی کرتا ہے۔لسانی حوالے سے ایک ترفع کی فضا کا مظہر ہے۔مصرع ''اے مرے ربِ کریم و خالقِ ارض و سما'' میں پہلے مرکب اضافی پھر مرکب عطفی پھر اس کے بعد مرکب اضافی اور پھر مرکب عطفی لایا گیا ہے۔ یوں ایک تہرے مرکب کا سماں بن جاتا ہے۔ یہاں لسانی حوالے سے شاہدؔہ لطیف کی قوتِ اختراع بھی قابلِ داد ہے جس سے ان کے لسانی تبحر کی دلیل ملتی ہے۔ بعد ازاں بے نیلِ مرام جیسا ایک کلاسیکل مرکب لایا گیا ہے جس میں اضافی اور توصیفی دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ناکامی و نامرادی کی علامت ہے۔

دوسرے بند میں اہلِ کشمیر کی محنت و ریاضت کی عکاسی کی گئی ہے اور صداقت کو ان کی زندگی کا زریں اصول بتایا گیا ہے مگر ان گلابوں کے مندر میں ابھی تک تاریک دھول ہے۔ان کی حالت زار دیکھ کر انسانی ذہن الجھن کا شکار ہو جاتا ہے لیکن یہ ایک الاؤ کی طرح ہیں جو کسی انقلاب کی علامت ہے۔

تیسرے بند میں اہلِ کشمیر کی قسمت بدلنے کی بات کی گئی ہے جو بھارتی ظلم و بربریت کا شکار ہے۔انہیں اپنے عزم و ہمت سے محبت ہے۔ان میں دنیا کو بدلنے کی صلاحیت ہے۔ بقول راقم:

جو طوفانوں میں پلتے ہیں
وہ دنیا کو بدلتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ اہلِ عالم ان کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ایک آہنی جوہر ہیں۔نظم ھذا انقلابی و مزاحمتی ادب کا شاہکار ہے اور شاہدؔہ لطیف کو اس حوالے سے جتنی بھی داد دی جائے، کم ہے۔آگے

ان کی ایک اور غزل دیکھیے جسے وادیءکشمیر کا پرسوز نوحہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

یہ ویران سے اجڑے اجڑے رستے دیکھتی جاتی ہوں
راکھ اور مٹی ہوتے پھول اور پتے دیکھتی جاتی ہوں
کیسی ہیں کشمیر کی گلیاں کوچے اور بازار سبھی
جنت کو میں لمحہ لمحہ مٹتے دیکھتی جاتی ہوں
بستی کا چپا چپا کیوں شہرِ خموشاں لگتا ہے
غم ناک آنکھیں اور پریشان چہرے دیکھتی جاتی ہوں
ہر منظر کے پیچھے جانے کتنے منظر ڈوب گئے
جانے کیوں خوش فہمی کے میں سپنے دیکھتی جاتی ہوں
کبھی یہ سالم نقشہ تھا دشمن نے چاک کیا اس کو
الٹ پلٹ کر کاغذ کے یہ پرزے دیکھتی جاتی ہوں
ہر چہرے کے پس منظر میں ایک کہانی ملتی ہے
درپن درپن شاہدہ کتنے حصے دیکھتی جاتی ہوں؟

(ص:31)

شاہدہ لطیف کے شعری مجموعہ ''معرکہءکشمیر'' میں تمام تر غزلیات مسلسل نوعیت کی ہیں جو موضوعاتی وحدت کی غماز ہیں۔ اس غزل میں انہوں نے بھارتی استبداد کی ایک اجمالی تصویر پیش کی ہے اور اہلِ کشمیر پر بھارتی ظلم وستم کو واضح کیا ہے۔ عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے اور ملت اسلامیہ کو بھی دعوتِ غور وفکر دی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ملی تناظر کس قدر بسیط و عریض ہے۔ یہ غزل بحرِ اوفر مثمن محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن مفعولن'' ہیں۔ یہ بحر زیادہ تر مربع سالم اور مسدس سالم استعمال ہوتی ہے جس میں سخن ور کے لیے ایک آسانی کا پہلو بھی ہے مگر شاہدہ لطیف نے اسے مثمن محذوف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ بحر عہدِ امیر خسرو میں عاشق صادق نامی ایک عروضی نے ایجاد کی تھی جو رسالہ

''جامع الصنائع'' میں مذکور ہے۔

ان کی ایک اور غزل قابلِ ذکر ہے جس میں اہلِ کشمیر کی تصویرِ مظلومیت کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

غم سے پتھر ہو جاتے ہیں
چہرے بنجر ہو جاتے ہیں
خون سے دریا بھر جائیں تو
آگ سمندر ہو جاتے ہیں
کرب و بلا درپیش ہو جب جب
نیزے خود سر ہو جاتے ہیں
معصوموں کے خوں میں اتر کر
عنواں خنجر ہو جاتے ہیں
سر سے اک چادر چھن جائے
سونے سب گھر ہو جاتے ہیں
ظلم کے ابر کا رنگ ہو کوئی
کالے منظر ہو جاتے ہیں

(ص:32)

اس غزل میں بھارت کی ریاستی دہشت گردی کا عکس بطریقِ احسن سیکھا جا سکتا ہے۔ یہ وہ خونچکاں مناظر ہیں جنہیں مقبوضہ وادی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بھارتی نام نہاد جمہوریت کو بے نقاب کیا گیا ہے اور ان کے نام نہاد سیکولر ہونے کے دعوے کو مسترد کیا گیا ہے۔ یہ غزل بحرِ اوفر مربع میں کہی گئی ہے جس کا وزن ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہے۔

ایک اور غزل دیکھیے جس میں ایک نادر قافیہ اور ردیف کو نبھایا گیا ہے جو شاہدہ لطیف کے فن و فکر کی عمدگی کی دلیل ہے۔ جس سے معیارات کے نئے ابواب وا ہوتے ہیں۔ یہ غزل بحر رمل مثمن

محذوف میں کہی گئی ہے جس کا وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

رات تیرے کس قدر ہیں پیچ و خم مٹتے نہیں
زخم بھر جاتے ہیں لیکن درد و غم مٹتے نہیں
وادیوں میں گونجتی ہے آہ و بکا کشمیر کی
گمشدہ آواز ہے نقشِ قدم مٹتے نہیں
یہ زمیں لمحہ بہ لمحہ خود بہ خود مٹ جائے گی
آسماں کا رنگ اور لوح و قلم مٹتے نہیں
کھوج ہر معصوم کے اپنے کی سب پر قرض ہے
ان کے رخساروں پہ تہہ در تہہ الم مٹتے نہیں
بدنصیبی ہے یہ عالم کی اک کشمیر کی
جبر و استبداد کے کیوں کیف و کم مٹتے نہیں
شاہدؔہ منظوم تاریخیں بھی رکھتی ہیں اثر
لفظ جو آ جاتے ہیں زیرِ قلم مٹتے نہیں

(ص:35)

کشمیریات کے حوالے سے شاہدؔہ لطیف کے ہاں مختلف ہیئتی تجارب موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ہیئتی کینوس کس قدر بسیط و عریض ہے۔ ان کا ایک قطعہ دیکھیے جو کشمیر پر ہونے والے ظلم وستم کی روداد پیش کر رہا ہے جو ایجاز و اختصار کی عمدہ مثال ہے۔ قطعہ ھذا بحر متقارب مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کا وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔ اس بحر کا شمار خلیل کی بحور میں ہوتا ہے۔

نہاں خاک میں ہیں جواں کیسے کیسے ؟
ہیں ظلم و ستم کے سماں کیسے کیسے ؟
نہتے جوانوں پہ جبر و ستم کے

گراتے ہو کوہِ گراں کیسے؟

(ص:36)

ان کی ایک اور غزل دیکھیے جو کشمیر کے نظریاتی انقلاب کے حوالے سے صدائے جرس کا درجہ رکھتی ہے۔جس میں عملی انقلاب کی دعوت وتحریک بھی ہے۔ یہ غزل بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں کہی گئی ہےجس کے عروضی ارکان ''مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن'' ہیں۔

لگتا ہے کہ شعلوں کی چمک اور بڑھے گی
یہ آگ ابھی دور تلک اور بڑھے گی
جب پھول کھلیں گے کسی کہسار کے پیچھے
سینوں میں خزاؤں کی کسک اور بڑھے گی
جب ہوں گے اجاگر کہیں مانوس خدوخال
آنکھوں میں رفاقت کی چمک اور بڑھے گی
یہ خون کا قطرہ جو چمکتا ہے زمیں پر
اس قیمتی موتی کی دمک اور بڑھے گی
گونجے گی ابھی اور صداؤں سے یہ وادی
اٹھتے ہوئے قدموں کی دھمک اور بڑھے گی

(ص:39)

شاہدہ لطیف کی ایک اور غزل کشمیریات کے تناظر میں دیکھیے جس میں فزوں تر نفسیاتی امکانات بھی پائے جاتے ہیں۔جس میں کتھارسز کا حوالہ بھی ہےجس میں بیم ویاس کا پہلو بھی ہے، جذبات کی شدت وحدت کا ذکر بھی ہے، جس میں مزاحمتی اورانقلابی رویہ بھی کارفرما ہے، اقداراور سچائی کے مٹتے ہوئے نقوش کی نوحہ گری بھی ہے۔ یہ غزل مذکورہ بالا بحروو زن میں کہی گئی ہے۔

آنکھوں سے عیاں حالِ دلِ زار بھی ہو گا
دکھ ہو گا تو جذبات کا اظہار بھی ہو گا

دن آئیں گے اس طور سے راہِ طلب میں
دل وسعتِ افلاک سے بیزار بھی ہو گا
الفاظ میں تلخی کا بھلا ذکر ہی کیسا
لہجہ کبھی خنجر، کبھی تلوار بھی ہو گا
مہندی مرے ہاتھوں کی افق پر بھی سجے گی
سر میرا کبھی زیبِ سرِ دار بھی ہو گا
گر یوں ہی رہی وادیء گلزار کی صورت
سچائی کا کیا کوئی پرستار بھی ہو گا

(ص:43)

کشمیریات کے حوالے سے شاہدہ لطیف کی ہر غزل ایک تسلسل کا سماں رکھتی ہے۔خیالات وافکار زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جن کا مرکزی نکتہ انقلابِ کشمیر ہے۔انہوں نے اپنے شعری منشور کو تاثیراتی کوائف کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کی پیش کش کا انداز بھرپور نوعیت کا ہے۔مذکورہ بالا غزل میں قدرے مشکل قوافی اور ردیف کو بروئے کار لایا گیا ہے۔''ہوگا'' کی ردیف میں ایک تکراری پہلو موجود ہے جس میں امروز وفردا باہم مربوط ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔خیالات وافکار میں ایک یقین اور اعتماد کی فضا پائی جاتی ہے جو بہت ہی کم سخن وروں کے ہاں مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔''معرکہء کشمیر'' میں شامل تمام غزلیات و منظومات خود میں کشمیری آشوب کا سماں رکھتی ہیں جنہیں نہ جھٹلایا جاسکتا ہے نہ مسترد کیا جاسکتا ہے او نہ فراموش کیا جاسکتا ہے۔ان کا سخن قاری کے حواس کو مکمل مستعد رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور قاری اس کے دوش بدوش سفر کرتا ہے جو شاہدہ لطیف کی فکری وفنی کامیابی وکامرانی کی نویدِ سعید ہے جو جاں فزا بھی ہے اور روح افزا بھی ہے۔

شاہدہ لطیف کے ہاں غزل کی ہیئت کے تمام تر تجربات موجود ہیں جن میں مسلسل غزل بھی ہے اور غیر مسلسل غزل بھی ہے۔ان کے ہاں مردف غزل بھی ہے اور غیر مردف غزل بھی ہے۔غیر

مردف غزل میں سخنور ردیف کے تکلف سے بے نیاز دکھائی دیتا ہے جو اس کی فنی چابکدستی سے عبارت ہے اگرچہ غیر مردف غزل میں تغزل کی چاشنی کچھ ماند ضرور پڑ جاتی ہے کیونکہ ردیف خود میں صوری، صوتی اور سماعتی حسن بھی رکھتی ہے لیکن فنی حوالے سے تمام تر تجربات ناگزیر ہیں۔ اب ان کی ایک غیر مردف غزل محلِ نظر ہے۔

ختم ہوتا ہی نہیں کشمیر سے کرب و بلا
کب تلک چلتا رہے گا جبر کا یہ سلسلہ
آگ کے دریا کی ساری تشنگی مر جائے گی
برلبِ دریا رکے گا عشق کا جب قافلہ
ہیں وفا کے نام لیوا خیمہ زن کشمیر میں
ہے جنہیں کرب و بلا سے رات دن کا واسطہ
ان نہتے قافلوں پہ آہنی یلغار ہے
اور شہادت کا ہوا ہر موڑ پر ہے فیصلہ
شاہدؔہ کرب و بلا سے جاوداں شبیر ہے
اور ہے کرب و بلا سے زندگی میں حوصلہ

شاہدؔہ لطیف کے فحوائے بیاں میں ایک شدتِ احساس پائی جاتی ہے۔ اس کا ایک سبب ان کا عمدہ تلمیحاتی استخدام ہے۔ انہوں نے آشوبِ کشمیر کو آشوبِ کرب و بلا سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر کشمیری مجاہدین اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور بھارتی استبداد کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہیں تو اصل میں یہ معرکہء حق و باطل ہے اور اہلِ کشمیر حق کے نمائندے ہیں۔ ان کے ہاں صرف غم و یاس نہیں ہے بلکہ رجائی امکانات کی چکاچوند بھی پائی جاتی ہے جو ان کی بلند حوصلگی کی علامت ہے۔ مذکورہ بالا بحر رمل مثمن محذوف میں کہی گئی ہے۔

ان کی شعریات میں اسلوبیاتی اعماق و آفاق انتہائی وسعت کے حامل ہیں۔ وہ اپنے موقف کو مدلل انداز میں باور کرانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ ان کے پیرائیہ اظہار میں مرکبات

کا التزام عمدگی سے کیا گیا ہے۔ ان کے فکر وفن اور اسلوب میں لایعنیت کے عناصر عنقا ہیں۔ مرکب اضافی، مرکب عطفی اور مرکب توصیفی کا استعمال ان کے ہاں وفور سے ملتا ہے جو خالص فطری رچاؤ کا حامل ہے۔ آمدہ غزل میں ان کا مدعا نگاری کا قرینہ ملاحظہ کریں۔ یہ غزل بحر ہزج مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

سرِ مقتل ستارے حریت کے جگمگاتے ہیں
درو دیوارِ زنداں کے بہت قصے سناتے ہیں
جہاں بھی پھول کھلتے تھے وہاں اب خون بہتا ہے
جوان بیٹوں کو کندھوں پر جو بوڑھے باپ لاتے ہیں
زمیں کو چپ لگی ہے اور فلک خاموش رہتا ہے
مگر وای کی چیخوں میں سویرے ڈوب جاتے ہیں
ہوائیں بھی مقفل ہیں صداؤں پر کڑے پہرے
گھروں میں اور گلیوں میں درندے دندناتے ہیں
چلے جتنی بھی لو گلشن سے ہم کو لو لگانا ہے
خزاں کے بعد موسم پھر بہاروں کے بھی آتے ہیں
یقیناً شاہدہ یہ کیفیت خود رنگ لائے گی
لہو اشکوں میں ملتا ہے تو چہرے مسکراتے ہیں

(ص:51)

شاہدہ لطیف اپنے موقف کے ابلاغ کے لیے مظاہرِ فطرت کا استعمال بڑی عمدگی سے کرتی ہیں جن کی نشاندہی ان کے سخن میں نفسیاتی امکانات کی دلیل بھی ہے۔ آمدہ آزاد نظم جو بعنوان ''ہوا'' ہے۔ یہ بحر ہزج میں کہی گئی ہے۔ اس نظم کے تاثراتی کیفیات ملاحظہ کرنے کے بعد یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بیانیہ کس قدر تقویت کا حامل ہے؟

ہوا خاموش سنتی ہے

نہ اس کے ہاتھ پاؤں ہیں

نہ اس کا جسم ہے کوئی

یہی رازِ سماعت ہے

کہ ہر آوازِ، ہر لہجے کو

خود میں جذب کر لیتی ہے چپکے سے

کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کرتی

ہوا خاموش سنتی ہے

ڈرو اس وقت سے

جب اس ہوا کے ہونٹ وا ہو جائیں

(ص:64)

بھارتی ظلم و تشدد نے نہ صرف کشمیر میں زندگی اجیرن کر دی ہے بلکہ یہاں کی آب و ہوا کو بھی زہر آلود کر دیا ہے اور مظاہرِ فطرت کی رعنائی کو بھی ماند کر دیا ہے۔اسی تناظر میں ان کی آزاد نظم ''اندھی گلی'' قابلِ ذکر ہے جو بحر متقارب میں کہی گئی ہے۔

ہواؤں میں بارود کا کڑواپن ہے

یہ زہریلا موسم چمن در چمن ہے

محبت کہاں ہے

محبت کے سارے فسانے

کہیں تیغوں نیزوں کے

سائے میں چپ ہیں

جہاں تک نظر ہے

نظارہ لہو ہے

بڑے اسماں کا ستارہ لہو ہے

پہاڑوں کی آغوش جنت نشاں میں
جو بھڑکیلئے شعوں نے مسکن بنایا
خدایا
یہ کیا ہے؟
یہ کیسی ہوا ہے؟
چمن در چمن کیسی آندھی چلی ہے؟
ہراک موڑ پر ایک اندھی گلی ہے

(ص:66)

ان کی ایک اور غزل دیکھیے جو وادیءِ کشمیر کا پرآشوب منظر نامہ پیش کررہی ہے۔جس میں ظلم و جبر کے اثرات کو واضح انداز میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بھارتی ریاستی دہشت گردی کے عوامل کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ غزل بحر متقارب مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔قوافی اور ردیف کا استعمال نادرہ کاری کا مظہر ہے۔

اندھیرے بھی اپنی سحر ڈھونڈتے ہیں
نظارے بھی ہر سو نظر ڈھونڈتے ہیں
جلائے گئے ہیں جو بازار گلیاں
وہ اپنے ہی دیوار و در ڈھونڈتے ہیں
چناروں کے شعلے فلک چھو رہے ہیں
یہ برفیلے موسم شرر ڈھونڈتے ہیں
جنہیں اپنے کندھوں پہ جھولے دیے تھے
وہ باپ اپنے لختِ جگر ڈھونڈتے ہیں
بلکتے ہوئے راکھ کے ڈھیر مابین
یہ معصوم بچے بھی گھر ڈھونڈتے ہیں

اڑانیں جنہیں شاہدہ مل نہ پائیں
پرندے وہی بال و پر ڈھونڈتے ہیں

شذرہ ھذا کے آخر میں ان کی نظم ''بڑھے چلو مجاہدو'' قابلِ ذکر ہے جو نعرۂ انقلاب کا درجہ رکھتی ہے۔ بحر ہزج مربع مقبوض میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعلن مفاعلن'' ہیں۔

بڑھے چلو مجاہدو
قدم قدم ہیں منزلیں
یہ راستے بھی کچھ نہیں
یہ فاصلے بھی کچھ نہیں
بڑھے چلو مجاہدو

زمیں سے آسمان تک
مکاں سے لامکان تک
تمہارے دم سے روشنی
تمہارے دم سے زندگی
ہر اک قدم ہیں نصرتیں
دعائیں اور محبتیں
یقیں کے ساتھ حوصلے
یہ جراتیں ، یہ ولولے
شہادتوں کی منزلیں
بڑھے چلو بڑھے چلو
بڑھے چلو مجاہدو

(ص:90)

اس نظم میں ’’بڑھے چلو مجاہدو‘‘ ایک ٹیپ کا مصرع ہے جس کا اعادہ تسلسل کی علامت ہے اور نظم میں روح رواں کا درجہ رکھتا ہے۔ عزم و حوصلے کی دلیل ہے جو درسِ حریت دے رہا ہے۔ جس میں جہاد جاری رکھنے کی تلقین ہے۔

شذرہ ھذا کے استخراجات و استشہادات سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شاہدہ لطیف کا کشمیریات کے حوالے سے بے پناہ کام ہے جس میں فکری و فنی اور اسلوبیاتی ہر نوع کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مختلف النوع ہیئتی تجربات ہیں جو اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ انہوں نے عروضی تلازمات کا اہتمام عمدگی سے کیا ہے اور ہر نوع کی مفرد و مرکب اور محذوف بحور کو بطریقِ احسن بروئے کار لائی ہیں۔ ایسی ہی منظم و منضبط کاوشوں کی بدولت مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی فورم پر محسوس کرایا جا سکتا ہے جس سے مسئلہ کشمیر کے حل کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں شاہدہ لطیف نے اپنے حصے کی شمع جلا دی ہے۔ امتِ مسلمہ اور بین الاقوامی برادری بھی اس سلسلے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔

شاہدہ لطیف کی شاعری کا رومانوی افق

کائناتِ سخن کی اقلیمِ فکر بسیط وعریض ہے جس میں انواع واقسام کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ کسی بھی سخنور کی فکریات اس کے نوع بہ نوع موضوعات کی بدولت رنگین ہوا کرتی ہے۔ کچھ احساسات ایسے ہوتے ہیں جو ہر عہد میں تروتازہ رہتے ہیں جن کی دلکشی و دلپذیری اور رعنائی وتوانائی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ جو خود میں جاذبیت اور اپنائیت کا ایک جہان آباد رکھتے ہیں۔ ایسے ہی موضوعات میں ایک موضوع رومان بھی ہے جو شعری تاریخ کے ہر دور میں تندرست وتوانا رہا ہے۔ جو صوتی، صوری اور سماعتی اعتبار سے ایک ناقابلِ زوال حسن رکھتا ہے۔ اس کے لغوی و فکری کینوس میں مہر ومحبت، عشق وخلوص، لطف وزیبائی، حسن و رعنائی، جنون وتفریح، دلکشی و دلآویزی، پسندیدگی، شائستگی، وارفتگی، خودسپردگی اور ازخودرفتگی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایک جامع شبد بھی ہے اور اصطلاح بھی ہے۔ اس کے حدود و قیود کے دائرے کا تعین اتنا سہل تر نہیں ہے جتنا عام طور پر سمجھا جتا ہے۔ مرورِایام کے ساتھ ساتھ اس میں بھی بہت وسعت آ گئی ہے۔ اب یہ صرف تعیّشات کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ضروریات واساسیاتِ حیات بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کا دائرۂ کار صرف مجاز تک محدود نہیں بلکہ یہ آفاقی اقدار وروایات کا حامل بھی ہے۔ ہر عہد کے نام نہاد جدت پسندوں کی مخالفت کے باوجود کوئی بھی اس کا بال بیکا نہیں کر سکا۔ بلکہ اس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوا ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے سخن کے رومانوی پہلوؤں کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ اس حوالے سے ہم ان کے اولین شعری مجموعہ ''معجزہ'' مطبوعہ فروری 1999ء زیرِ تجزیہ

لائیں گے۔ مجموعہ ھذا کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہنوز سلسلہ جاری و ساری ہے۔ مذکورہ مجموعۂ شعر کے نصف اول کا تجزیاتی مطالعہ رومانوی تناظر میں پیش کیا جائے گا۔ منتخب غزلیات کے منتخت اشعار کو کلی زاویۂ تنقید کے پس منظر میں پیش کیا جائے گا جس میں فکری پہلوؤں کے پہلو بہ پہلو اسلو بیاتی ولسانیاتی اور عروضی حوالے بھی شامل ہوں گے۔ علاوہ ازیں تمام تر نفسیاتی و فلسفیانہ اور سماجی نقطۂ نظر کو بھی واضح کیا جائے گا۔

شاہدؔہ لطیف کا رومانوی افق عمومی اور اختصاصی زاویہ کا حامل ہے جس میں تہذیب و شائستگی بھی ہے، انا اور وضع داری بھی ہے۔ ان کا رومان مجاز کے دائرے تک محدود نہیں رہتا بلکہ آفاقیت سے ہم آغوش ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس میں نہ سوقیانہ پن ہے اور نہ لایعنیت کی فضا ہے بلکہ جس میں معروضیت ومعقولیت اور مقصدیت ومنطقیت پائی جاتی ہے۔ دیگر ہم عصر شاعرات کی طرح ان کے ہاں صرف عمومی داخلی احساسات نہیں ہیں بلکہ ان کے ہاں داخلی و خارجی عوامل کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کا رومان اختر شیرانی کی طرح غیر رازدارانہ نہیں ہے اور نہ سنجیدگی کی سطح سے گرنے پاتا ہے۔ رومان نگار سخنوروں کو انہوں نے راہنما خطوط فراہم کیے ہیں۔ ہمیں جوان کا وصف سب سے زیادہ پسند آیا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ کسی صورت انا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتیں جوان کی وضع داری کی دلیل ہے۔

ان کے ہاں محبوب کا تصور مقدس اور مثالی نوعیت کا ہے مگر مافوق الفطرت نہیں ہے۔ جس کی کلاسیکی اور نیو کلاسیکی شعریات میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ گویا ان کے رومان میں خرد آموزی بھی شامل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہوتا ہے کہ وہ خرد کی بالا دستی کی بھی قائل ہیں مگر وہ دل کی آواز بھی سنتی ہیں اور اسے فراموش نہیں کرتیں۔ وہ راہِ وفا میں ہر زخم ہنس کر کھانے کی قائل ہیں۔ اپنی وفا کو باور کرانے کا یہی ان کا منطقی انداز ہے۔ ان کا رومان مظاہرِ فطرت سے ہم آغوش ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کی بدولت ان کے سخن میں کلاسیکی بہار یہ شاعری کے خصائص بھی آشکار ہوتے ہیں جن کا جواز یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی اساتذۂ فن سے بھی اکتسابِ فیض کیا ہے۔ اسی تناظر میں ان کی غزل کے تین اشعار ملاحظہ کریں جن کا اسلوب سہلِ ممتنع کے رنگ کا حامل ہے۔

جسے مدعا نگاری کا حسین قرینہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہے گئے ہیں جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہیں۔ اس بحر کا شمار مرکب بحور میں ہوتا ہے۔

ہم زمانے کو چھان بیٹھے ہیں
تجھ سا اک بھی نظر نہیں آیا

داستانِ وفا تو پوچھ ذرا
زخم ہنس کر کہاں نہیں کھایا

پوچھتی ہے کلی کلی ہم سے
کس نے ہستی کو آ کے مہکایا

(ص:26)

شاہدہ لطیف کی رومانویت میں ایک بہار افشانی ہے۔ ان کا رومانوی کینوس ایک چمنستان کا درجہ رکھتا ہے جس میں گل اور خوشبوؤں کے چرچے ہیں۔ ایک امید افزا فضا ہے جہاں بیم و یاس کا کوئی گزر نہیں ہے۔ یاسیت اور بیزاری گریز پا ہے۔ مقصدیت اور منطقیت ہے۔ وفا اپنے بامِ عروج پر ہے۔ ایک مستقل مزاجی کا پہلو ہے۔ ایک باضابطہ شخصیت کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔ ایک مضبوط و مستحکم کردار کی عکاسی ہے۔ ان کی ایک اور غزل کا ایک اور شعر پیشِ نظر ہے جو مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہا گیا ہے۔

گل سے الفت ہو سانس کا حصہ
خوشبوؤں کے جہاں بھی ملتے ہیں

(ص:27)

ان کے رومان کا ادراکاتی کینوس وسیع و عریض ہے جس میں ایک انا ہے۔ ایک وضع داری ہے۔ ایک تہذیبی رکھ رکھاؤ ہے جو کارگر نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے وہ اہلِ دنیا کو بھی ہدفِ تنقید بناتی ہیں۔ ان کے شعوری اور لاشعوری زاویے باہم مربوط نظر آتے ہیں۔ وہ سماج کی لایعنیت

کے عوامل کو ناپسند کرتی ہیں۔ وہ اپنے موقف کو باور کرانے کے لیے الہامی نکتۂ نظر کو بروئے کار لاتی ہیں جس سے ان کی فکری گہرائی و گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں ان کی ایک اور غزل کے دو اشعار ملاحظہ کریں جو بحر ہزج مثمن محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

وفا اپنی جگہ ہے اور انا اپنی جگہ ہے
پڑھا سارے جہاں نے اور لکھا اپنی جگہ ہے
مجھے اک ناخدا کی ضد نے بتلایا ہے لوگو
خدائی ہر طرف ہے اور خدا اپنی جگہ ہے

(ص:35)

ان کی ایک اور غزل بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین ہے جس کا تجزیہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ غزل بحر ہزج مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کا وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

کبھی جو شوخ آنچل سے تمنا جگمگاتی ہے
تصور میں تجھے پا کر یہ دنیا بھول جاتی ہے
محبت کے سنہرے خواب دیکھے جب کوئی راہی
یہ کھلتی چاندنی اکثر ترے قصے سناتی ہے
تو آئے تو مقدر جاگ جاتا ہے فضاؤں کا
نظارے جھوم اٹھتے ہیں ہوا بھی گنگناتی ہے
اگر دل میں ہو سچائی تو رستے کھل ہی جاتے ہیں
اگر سانسوں میں چاہت ہو تو خوشبو پاس آتی ہے
اسے اے کاش اب یہ شاہدہؔ کوئی بتا آئے
کہ آدابِ محبت تو محبت ہی سکھاتی ہے

(ص:44)

شاہدہ لطیف کے ہاں معرفت ومجاز کے تلازمات باہم ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ان کے فحوائے سخن میں تمثیلاتی انداز خالص فطری رچاؤ کا حامل ہے۔ان کی فکری منطق ان کے شعری موقف کو باور کرانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ذرا ان کا یہ شعر دیکھیے جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے۔

ہوا ہے کوئی میرے ہم رکاب آہستہ آہستہ
کہ جیسے وقت کرتا ہے حساب آہستہ آہستہ

(ص:45)

ان کے ہاں فکری ولسانی ہر نوع کی دقیقہ سنجی سے گریز کا پہلو پایا جاتا ہے۔انہوں نے سہلِ ممتنع کے اسلوب کو ترجیح دی ہے اور سہل نگاری کی روایت کو فروغ بخشا ہے۔وہ جمہوری تنقیدی نکتۂ نظر کی قائل ہیں کہ دنیا میں اکثریت عام انسانوں کی ہے جو عام انداز میں سوچتے ہیں۔عام انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں اور عمومی اظہارِ خیال کو پسند کرتے ہیں۔وہ شوکتِ الفاظ کے لایعنی زعم میں مبتلا نہیں ہوتیں۔شاہدہ لطیف کا رومان حیا داری سے مملو ہے جو نفس کے بہکاوے میں نہیں آتا۔ان کا بندِ ضبط مضبوط و مستحکم ہے حالانکہ نفس کی بہت سی مقتضیات بھی ہوتی ہیں جنہیں وہ خاطر میں نہیں لاتیں۔اس حوالے سے ان کی غزل کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

نظر بھر کے کبھی دیکھا نہیں ہے
وگرنہ دل تمہیں بھولا نہیں ہے
حیا سے یہ نظر نیچی ہے اب تک
تقاضا دل کا ورنہ کیا نہیں ہے

(ص:47)

شاہدہ لطیف کے بیان میں ایک منطقیت کا پہلو پایا جاتا ہے جس سے ان کے موقف کو

تقویت ملتی ہے۔گویا وہ اپنے نکتہ ءنظر کو باور کرانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ان کا کلام قاری کے حواس کو مکمل مستعد رکھتا ہے۔وہ پیمانہ ءشعر میں ترسیلِ ادراک کا کام کرتی ہیں۔مثبت شاعری کے فروغ میں ایسی کاوشیں مستحسن ہوا کرتی ہیں اوران کی بدولت شاعری کا وقار قائم رہتا ہے۔انہوں نے جنوں جیسے بے باک موضوع کو بھی انتہائی شائستگی سے نبھایا ہے جس کی مثال جہانِ شعر میں شذوذ کا درجہ رکھتی ہے۔ان کی غزل کا ایک شعر اسی تناظر میں ہے جو مذکورہ بالا بحرو وزن میں کہا گیا ہے۔

محبت میں دکھائے معجزہ وہ
جنوں میں اس قدر سچا اگر ہے

(ص:48)

شاہدہ لطیف کے سخن کی استعاراتی فضا بھی بہت پر کشش ہے اور خالص فطری رچاؤ کی حامل ہے۔ان کے ہاں محبوب کا تصور انتہائی شائستگی سے عبارت ہے جس کی نسبت کسی نوع کی آلائشوں سے نہیں ہے۔رومان کا ایسا شستہ تصور بہت ہی کم سخنوروں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ان کی غزل کا ایک شعر دیکھیے جو بحرِ اوفر مربع سالم میں کہا گیا ہے جس کا وزن ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہے۔ یہ بحر عہدِ امیر خسرو میں عاشق صادق نامی ایک عروضی نے ایجاد کی تھی۔رسالہ'' جامع الصنائع ؛ میں مذکور ہے۔

ہم اپنے دل کے آنگن میں
اک چاند اُتارے رکھتے ہیں

(ص:50)

ان کے رومانوی کینوس میں غم والم کی فضا بھی پائی جاتی ہے مگر ہمہ گیر نوعیت ہے جسے صرف محبت سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔یہی ان کی فکر کی شائستگی کی علامت ہے۔وہ بے پناہ قوتِ ضبط رکھتی ہیں۔وہ ایک مضبوط و مستحکم اور شستہ کردار کی حامل ہیں اور یہی ان کی شخصیت کا معجزانہ پہلو ہے۔ان کی غزل کے دو اشعار دیکھیے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی

وزن ’’مفاعیلن مفاعیلن فعولن‘‘ ہے۔

دکھوں کی فصل بڑھتی جا رہی ہے
غموں کا بیج کوئی بو گیا ہے
مرا کردار میرا معجزہ ہے
کہ یہ سب داغ دل کے دھو گیا ہے

(ص:51)

ان کے ہاں اخلاقی اقدار کا نوحہ بھی ہے، سماجی بے راہ روی کا تذکرہ ہے، اقدار کے احیا کی بالواسطہ طور پر اور براہِ راست کوشش کی گئی ہے۔ یہ ان کی رومانویت کا ایک وسیع تر پہلو ہے۔ ان کے نزدیک ہم لوگ اخلاص تلاش کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر خود مخلص نہیں ہوتے۔ گویا ہم تمام عمر ایک سعیِ لاحاصل میں رہتے ہیں۔ یہی لاحاصلیت ہمیں لایعنیت سے دوچار کر دیتی ہے۔ گویا ہمارا عمل ہماری حماقت سے مملو ہے۔ اگر دل کی دنیا کا نظارہ کریں تو اس میں سب کچھ ہمارے حوالے سے ملے گا۔ اگر ہمارے اندر خلوص ہوگا تو ہمیں خارجی طور پر بھی خلوص کا مشاہدہ ہوگا۔ شاہدہ لطیف انسانی حماقتوں کا ادراک رکھتی ہیں اور ان کی نقاب کشائی کر کے ترسیلِ شعور کا کام کرتی ہیں۔ ان کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جو بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ’’فعولن فعولن فعولن فعولن‘‘ ہیں۔

گھٹن ہے کچھ ایسی ہوا ڈھونڈتے ہیں
جو ہیں بے وفا وہ وفا ڈھونڈتے ہیں
ذرا دل میں جھانکیں تو سب کچھ ملے گا
یہ پاگل کہاں پہ جفا ڈھونڈتے ہیں

(ص:52)

شاہدہ لطیف کے رومان میں کہیں کہیں تمثیلاتی انداز بھی کارفرما نظر آتا ہے جس سے ان کے سخن میں استدلالیت کی نمو پذیری ہوتی ہے اور منطقیت کو فروغ میسر آتا ہے۔ وہ محبت میں بڑے

ادق و دقیق اور گنجلک موضوع کو بھی بڑے لطیف انداز میں بیان کر جاتی ہیں۔ان کے اظہاری پیمانوں میں ایک فکری نوعیت کی جدت کارگر نظر آتی ہے۔ وہ محبوب کے ستم کیش رویوں کو بھی بڑے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ کہیں بھی ان کے لہجے میں تکان کا احساس نہیں ہوتا۔ان کے ہاں ایک اصول پسندی ہے اور اصولوں پر سمجھوتہ کسی صورت کرنے کی قائل نہیں ہیں۔وہ جانتی ہیں کہ عصری رویے اگر چہ میرے برعکس ہیں مگر وہ اس امر سے بھی واقف ہیں کہ:

تندیء بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

(علامہ اقبال)

اصولوں کی دنیا میں وہ احساسِ سود و زیاں سے ماوراد کھائی دیتی ہیں۔اسی نسبت سے ان کی غزل کے دو اشعار ہدیہء قارئین ہیں جو بحر ہزج مثمن محذوف میں ہیں۔

ہے جانے کس قدر لذت اسے نفرت سے حاصل
زباں پہ رکھ کے وحشت کا شرارا دیکھتا ہو گا
ہمیں تو شاہدؔہ اپنے اصولوں سے ہے الفت
وہ تاجر ہے محبت میں خسارہ دیکھتا ہو گا

(ص:54)

رومان جو بہت سے موضوعات کا مخزن ہے،مگر شاہدؔہ لطیف نے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو خود میں نادرہ کاری کا پہلو رکھتے ہیں۔جن میں اختصاصی زاویے بھی ہیں۔ وہ فکر کے بنے بنائے راستوں پر چلنا پسند نہیں کرتیں بلکہ فکر کے نئے زاویے تلاش کرتی ہیں۔اس لیے ان کا فحوائے سخن جدتِ فکر کا حامل ہے۔ وہ عمومی ڈگر سے گریزاں رہتی ہیں۔یہی ان کے سخن کا نکتہء اختصاص ہے۔وہ اپنی غزل میں متضاد و متنوع موضوعات کو بھی پیش کرتی ہیں۔ان کی غزل کے دو شعر دیکھیے جو بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ہیں۔

مری موت کی وہ دعا مانگتے ہیں

سزائیں سنا کر وفا مانگتے ہیں

جسے دیکھیے وہ چلا آ رہا ہے

محبت کو سب ہی گدا مانگتے ہیں

مذکورہ بالا استشہادات واستخراجات سے یہ امر پایہ تیقن کو پہنچتا ہے کہ شاہدہ لطیف کی رومان نگاری خصوصی اہمیت کی حامل ہے جس میں نوع بہ نوع موضوعات ہیں جو اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ اسلوب سہل نگاری کی روایت کا حامل ہے۔فکری حوالے سے ہر قسمی لایعنیت سے گریز کی فضا پائی جاتی ہے۔وہ اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتیں کیونکہ وہ وقت کی اہمیت سے بخوبی آشنا ہیں۔ان کے ہاں مدعا نگاری کا حسین قرینہ ہے جو ان کے سخن کے فکری، فنی، اسلوبیاتی و نفسیاتی اور سماجی تناظر کو رومانوی حاشیہ آرائی کے ذریعے پیش کرتا ہے۔اگر اس موضوع میں ان کی عرق ریزی اسی تواتر سے جاری وساری رہی تو فکری وفنی حوالے سے نئے معیارات کی بازیافت کا عمل ان کے لیے سہل تر ہو جائے گا۔

شاہدہ لطیف کا سخن سماجی ادراکات کے آئینے میں

سماجیات، معاشریات یا عمرانیات کو سوشل سائنس یا سوشیالوجی بھی کہا جاتا ہے۔اس کا موضوعاتی تطابق علم البشریات سے بھی ہے۔لہٰذا یہ ایک وسیع موضوع ہے۔اس کے فکری کینوس میں ہمارا رہن سہن، تہذیب و ثقافت، رسوم و رواج، اخلاقیات و عادات، عقائد و اعمال اور ہمارے تمدنی عناصر بھی شامل ہیں۔ عام طور پر اسے ایک خشک موضوع تصور کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا ہرگز نہیں ہے کیونکہ اس میں پذیرائی کے فزوں تر امکانات پائے جاتے ہیں۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر عمرانی تنقید نے اک باضابطہ دبستان کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ جس کے حوالے سے تقریباً نصف صدی سے لکھا جا رہا ہے۔ عام طور پر دنیائے ادب میں زیادہ تر دو نظریوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ایک ادب برائے ادب اور دوسرا ادب برائے زندگی ہے مگر عصرِ حاضر میں ادب برائے زندگی کو فوقیت حاصل ہے۔اصل میں یہ سماجیات کا ہی دوسرا نام ہے جس میں سماجی ادراکات کو کلیدی مقام دیا گیا ہے جسے زندگی کے ہر شعبے میں خصوصی اہمیت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔کسی بھی سخنور کی فکری بالیدگی کا تعین سماجی ادراکات سے ہی کیا جاتا ہے۔ جسے وفور حاصل ہوتا ہے، اسے عبور حاصل ہوتا ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم عصرِ حاضر کی نابغہء روزگار شاعرہ شاہدہ لطیف کے سماجی تناظرات کے پسِ منظر میں رقم طراز ہیں۔ان کے متعدد مجموعہ ہائے کلام منظر عام پر آ چکے ہیں۔انہیں ادبی و صحافتی حوالے سے صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی سے بھی نوازا جا چکا ہے۔اس وقت ہم ان کے سماجی ادراکات کا جائزہ ان کے شعری مجموعہ ''خواب سونے نہیں دیتے'' مطبوعہ ستمبر 2017ء

کے نصف اول کی منتخب غزلیات اور اشعارِ منتخبہ کے تناظر میں لے رہے ہیں۔ مذکورہ مجموعہء کلام میں زیادہ تر غزلیات شامل ہیں۔ اس مجموعہ کی پسندیدگی کا یہ عالم ہے کہ اس کے اب تک پانچ ایڈیشن منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ اس کتابِ شعر کا نام بھی ذہنی وفکری بیداری کا مظہر ہے۔ تاریخِ شعریات شاہد ہے کہ اس سخنور کو زیادہ مقامِ اعتبار میسر آتا ہے جس کے ہاں سماجی ادراکات زیادہ وقیع نوعیت کے ہوں۔ شاہدؔہ لطیف کے ہاں بھی یہی معاملہ ہے۔

اگر فنی حوالے سے بات کی جائے تو انھوں نے مشکل قوافی و ردیف کو بطریقِ احسن برتا ہے۔ فکری حوالے سے وہ ایک قناعت پسند شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ ہر قسم کے لالچ اور لوبھ سے مبرا و ماورا ہیں۔ ان کے فحوائے بیاں میں ایجاز واختصار کے تقاضے بہ حسن وخوبی پورے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے شعری اظہار میں ایک معجزانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی معجزانہ کیفیت ان کے فکر وفن کا نکتہء کمال بھی ہے۔ ان کی ایک غزل کے تین اشعار اسی پس منظر میں دیکھیے جو بحر رمل مثمن محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

تیرا گھر ہے تیرگی میں میرے گھر ہے چاندنی
اس تفاوت پر نگر میں در بہ در ہے چاندنی

خواہشیں محدود میری دستِ حسرت بے طلب
مختصر آنگن ہے میرا مختصر ہے چاندنی

تیرگی میں یوں چمک اٹھے ہیں میرے بام و در
گویا میرے عکس کے زیرِ اثر ہے چاندنی

(ص:27)

شاہدؔہ لطیف کے ہاں ایک سماجی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو فکر کی بلندیوں پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دراکاتی کینوس کس قدر وسعتوں کا حامل ہے۔ ان کا بیانیہ خود میں تاریخی حقائق کا درجہ رکھتا ہے۔ گویا ان کے پیمانہء شعر میں ان کے تاریخی

ادراک کی ترسیل ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ایک خوبصورت طرزِ آموزش پایا جاتا ہے جو کسی معلمِ صادق کی علامت ہوا کرتا ہے۔ ان کی غزل کا ایک شعر اسی حسین آدرش کا مظہر ہے جو بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے۔

ستارے ان کی منزل کا کبھی عنواں نہیں بنتے
جنہیں پرخار تنہا راستے اچھے نہیں لگتے

(ص:39)

وہ مفلوک الحال طبقے کا دل میں فزوں تر احساس رکھتی ہیں۔ وہ غریب لوگ جن کے لیے سانس لینا بھی محال ہوتا ہے، جو صرف زندہ رہنے کی جنگ لڑ رہے ہیں، جن کی بقا کا انحصار خدائے بزرگ و برتر کے لطف و کرم اور نوازشات وعنایات پر ہے، برسرِ اقتدار اور سرمایہ دار استحصال کرنے والا گروہ جس نے دانش مندی کے زعم میں شہروں کے شہر برباد کر کر دیے، اب وہی گروہ مضافات پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ یعنی اب وہ مضافات کی معیشت کو تہ و بالا کرنے کے درپے ہے۔ شاہدہ لطیف کے ہاں ترقی پسند فکر کے خصائص بھی ہیں اور انسان دوستی کے مظاہر بھی ہیں۔ یہی ان کے تخلیقی ارتقا کی معراج ہے۔ اسی حوالے سے ان کی غزل کے دو اشعار شاملِ شذرہ ہیں جو بحر رمل مثمن محذوف مخبون میں کہے گئے ہیں۔ جن کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فعلن'' ہیں۔ وزن ھذا ایک اختراعی نوعیت کا حامل ہے جس میں سخن ور شاذ ہی شعر کہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عروض وضرب جس کا رکن فعلن ہے، دو زحافات کا اجتماع ہوا ہے۔ یعنی محذوف ومخبون کا علاقہ ایک ہی رکن سے ہے۔

سانس لینے کی اجازت کو ترستا ہے غریب
انحصار اس کا فقط تیری عنایات پہ ہے
شہر برباد ہوئے جس کی خرد مندی سے
اب یہ سنتے ہیں نظر اس کی مضافات سے ہے

(ص:47)

شاہدہ لطیف کا بہت بڑا موضوع سماجی حماقتیں بھی ہیں جن کی نمو پذیری ان کے افکار سے ہوتی ہے۔ وہ پیچیدہ موضوعات کو بھی اپنے سخن کا حصہ بناتی ہیں جس سے ان کے کلام میں فلسفیانہ اور نفسیاتی امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یوں ان کی شاعری میں گہرائی و گیرائی کے خصائص آشکار ہوتے ہیں۔ ان کے بیان میں ایک منطقیت کا پہلو ہے جو ان کے شعری موقف کو اجاگر بھی کرتا ہے اور اسے باور بھی کراتا ہے۔ وہ متضاد و متنوع موضوعات کو تکنیکی طور پر یوں مربوط کرتی ہیں کہ وہ لازم و ملزوم محسوس ہوتے ہیں۔ جس سے ان کے تخلیقی ارتقا کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس نسبت سے ان کی ایک غزل دیکھیے جو بحرِ رمل مثمن محذوف/مقصور میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ فاعلان'' ہے۔

بے اماں کیسے کوئی ہو سائباں ہوتے ہوئے
کیا کسی کو دکھ نہ ہو گا رائیگاں ہوتے ہوئے
رات خوابوں کے شبستاں میں عجب منظر ملا
میں نے دیکھا قمقموں کو کہکشاں ہوتے ہوئے
گہرے گہرے پانیوں سے پوچھتی رہتی ہوں میں
لوگ بستے کیوں نہیں ہیں بستیاں ہوتے ہوئے
الجھی الجھی گفتگو سے تنگ آ جاتی ہوں میں
چپ سی ہو جاتی ہوں میں منہ میں زباں ہوتے ہوئے
شاخِ گل سے پھول جھڑتے جس طرح ہیں بے شمار
دیکھنا لفظوں کو اس لب سے بیاں ہوتے ہوئے
کشتیء امید کو ساحل پہ لے کے آ گئی
ہار کب مانی شکستہ بادباں ہوتے ہوئے

(ص:49)

شاہدہ لطیف کے ہاں سماجی ادراکات میں ایک تنوع و تلون کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

مختلف رویے ہیں جو مختلف مزاجوں اور اذہان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یوں ان کا فکری کینوس وسیع ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں رجائی امکانات بھی ان کی شعریات کا حصہ ہیں۔ مصلحت پسندی اور زمانہ شناسی کا جوہر بھی ان کی فکریات کا نمایاں وصف ہے۔ ان کے ہاں کامیاب زندگی کرنے کے رہنما اصول ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ان کے کلام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان کے حصار سے باہر نہیں نکلتا چاہتا۔ ان کے سخن میں تلقین و تاکید کا پہلو بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جو بحر رمل مثمن محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں اور فاعلاتن کی مذوفی صورت ''فاعلن'' ہے۔

ساتھ چل اس عہدِ ناہنجار کے ورنہ کہیں
عین ممکن ہے تجھے دستِ زمانہ چھوڑ دے
لوگ موسم کی طرح ہوتے ہیں آوارہ مزاج
آتے جاتے موسموں سے جی لگانا چھوڑ دے

(ص:55)

ان کے بیان میں مقصدیت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جو اپنے سماج سے جڑی ہوئی ہے۔ سماجی حوالے سے وہ عصری بے حسی سے بھی نالاں ہیں۔ اس لیے وہ شکوہ سنج بھی نظر آتی ہیں کیونکہ وہ ایک مثالی معاشرے کی خواہاں ہیں جس کی وہ عملی تصویر دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے وہ تہذیبی و تمدنی ارتقا کو ضروری خیال کرتی ہیں۔ اس عظیم منزل کے حصول کے لیے وہ ہر فرد کی تربیت کو ضروری خیال کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کے میڈیم سے ترسیلِ ادراک کا کام لیتی ہیں۔ ان کی غزل کا ایک شعر دیکھیے جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے۔

میں سنگ و خشت سے کیا گفتگو کر لیتی لا حاصل
وہ پتھر تھا میں اس کے سامنے تقریر کیا کرتی

(ص:59)

شاہدؔہ لطیف سماجی ہم آہنگی کے لیے اخلاص کو ناگزیر خیال کرتی ہیں اور غیر مشروط اخلاص کا ہونا بہت ضروری ہے۔ رشتوں میں استحکام خلوص کی بدولت ہی ممکن ہے۔ وہ انسان کو نفسانفسی، خودغرضی اور مطلب پرستی کے حصار سے باہر نکالنا چاہتی ہیں۔ عصری آشوب کا مداوا صرف اسی صورت میں ہی ممکن ہے۔ وہ مادہ پرستی کی قائل نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے سخن میں مکارمِ اخلاق کا حسین آدرش ملتا ہے جو ان کی کامیابی و کامرانی کی دلیل بھی ہے۔

صرف اخلاص کی زنجیر انہیں باندھتی ہے
غیر مشروط ہوا کرتے ہیں رشتے سارے

(ص:64)

وہ صرف مقدر کے لکھے پر قناعت نہیں کرتیں۔ اسے برجوں، ستاروں اور سیاروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی وہ علم النجوم پر یقین رکھتی ہیں بلکہ وہ سعیِ پیہم کی قائل ہیں۔ بقول راقم:

عیاں یہ زمانے کی تصویر میں ہے
تعلق سا اک سعی و تقدیر میں ہے

یعنی ان کے ہاں عملِ پیہم کا حسین آدرش پایا جاتا ہے جسے وہ نویدِ انقلاب خیال کرتی ہیں۔ اس کے لیے وہ میدانِ عمل میں مقدر آزمانے کا مشورہ دیتی ہیں۔

تو اپنے ہاتھ کی الجھی لکیروں سے ہٹا نظریں
کہ میدانِ عمل ہی میں مقدر آزمانا ہے

(ص:65)

شاہدؔہ لطیف ہمہ وقت نئے امکانات کی بازیافت میں سرگرداں رہتی ہیں جسے وہ سماجی ادراک سے تعبیر کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے افکار انقلابی نوعیت کے ہیں۔ جس طرح علامہ اقبال نے اپنی شعریات میں عمل کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ بعینہٖ وہی عمل شاہدؔہ لطیف نے بھی دہرایا ہے۔ وہ فکری حوالے سے مقلدِ اقبال معلوم ہوتی ہیں جس پر وہ فاخر و نازاں بھی ہیں کیونکہ یہی ان کا سرمایہء افتخار ہے اور یہی کامیاب لوگوں کی علامت ہوا کرتی ہے۔

سمندر میں نئی بستی بسانا چاہتے ہیں ہم
یہ کشتی یہ کنارا چھوڑ دجانا چاہتے ہیں ہم

وہ ایک زمانہ شناس اور جہاں دیدہ شخصیت کی مالک ہیں۔ یہ ایک وہ جوہرِ خاص ہے جو ہر انسان کو ودیعت نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ صرف مشیتِ ایزدی کی ہی عطا ہوا کرتی ہے۔اس لیے ان کے ہاں بھرپور اعتماد اور یقین کی فضا پائی جاتی ہے۔دراصل سماجی ادراکات کا شعور ہی انسان کو پراعتماد اور پروقار بناتا ہے۔یہی امر شاہدہؔ لطیف کی فکری بالیدگی کا مظہر ہے۔

مجھے دھوکہ نہ دے پائے گا کوئی
زمانے کی نظر پہچانتی ہوں

(ص:74)

ان کے جذبات واحساسات میں ایک ایثارومروت کی فضا ہے۔وہ نفسیاتی حوالے سے Supper Eago کی سٹیج پر ہیں جہاں انسان اپنی ذات کی نفی کرتا ہےاور دوسرے انسانوں کی فلاح وبہبود اور خیرخواہی چاہتا ہے۔دراصل یہی اشرف المخلوقات ہونے کا معیار بھی ہے۔ سماجی ناہمواریوں پر بھی ان کا دل کڑھتا ہے کیونکہ وہ سماجی مساوات کی قائل ہیں۔

پہلے تم اپنے مسائل سے رہائی پا تو لو
پھر اگر فرصت میسر ہو تو ہم پر سوچنا
کیوں برس جاتا ہے صحرا پر ہیں پیاسی بستیاں
کیسا انصاف ہے ابرِ کرم پر سوچنا

(ص:77)

شاہدہؔ لطیف ایک باہمت شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ اپنے راستے میں کسی نوع کی رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ان کا یہ اعتماد ان کے زبردست سماجی ادراک کی دلیل ہے۔اس لیے وہ بڑے عزم وحوصلے سے جادۂ منزل پر رواں دواں ہیں کیونکہ وہ رکنا نہیں جانتیں بلکہ صرف آگے بڑھنا جانتی ہیں۔ان کا عزم بالجزم ان کی کامیابی وکامرانی کا جواز ہے۔ ہر قسم کے توہمات اور

خدشات کو خاطر میں نہ لانا ان کے اوصافِ حمیدہ میں شامل ہے۔ ان کا یہی وصفِ خاص انہیں مقامِ اعتبار سے نوازتا ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات وتوضیحات سے یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے کہ ان کا سماجی ادراکاتی کینوس بسیط وعریض ہے جس میں انواع واقسام کے پھول اگے ہیں جن کی مہک جہانِ قلب وخرد کو سیراب کرتی ہے، جس سے قاری کو ایک نیا عزم وحوصلہ ملتا ہے۔ پھر وہ زندگی کے سفر پر کامیابی سے گامزن ہو جاتا ہے۔ گویا شاہدہؔ لطیف کے کلام کے سماجی تناظر کا مطالعہ دراصل ایک کامیاب انسان کی تصویر پیش کرتا ہے اور زندگی کے لیے راہنما خطوط بھی فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے سخن کو ادب برائے زندگی کے نظریہ کی میزان پر تولا اور پرکھا جائے تو وہ خاصا وقیع وبلیغ ہے۔

شاہدہ لطیف کا تصورِ غم

زندگی مختلف رویوں، جذبات واحساسات اور مختلف کیفیات سے عبارت ہوا کرتی ہے جن میں حزن وطرب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ عام طور پر خوشی کو لمحاتی مسرت کا نام دیا جاتا ہے جبکہ غم ایک دیرپا جذبہ ہے جو خود میں بہت سی تاثیراتی کیفیات بھی رکھتا ہے۔ غم کی بھی مختلف نوعیات ہوتی ہیں جو اس کے اسباب وعلل سے علاقہ رکھتی ہیں۔ ایسا غم جو سوز وگداز کی کیفیات کا حامل ہو، جہانِ سخن میں خصوصی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ ہر سخنور کے ہاں حزنیہ احساسات اس کی افتادِ طبع کے مطابق ہوتے ہیں۔ خدائے سخن میر تقی میر کی مقبولیت و پذیرائی کا ایک سبب ان کی حزنیہ شعری طبع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضرتِ غالب سے بھی پیش رفت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ حزن و ملال کا تجزیہ بھی مختلف زاویوں سے کیا جاتا ہے۔ ایسا غم جو انسانی عزائم کو تقویت پہنچاتا ہے اور بھرپور انداز میں دعوتِ عمل دیتا ہے، جو خود میں ایک کامیاب انسان کی شخصیت کا عکس بھی رکھتا ہے، وہ قاری کے لیے بہت سے افادی پہلو رکھتا ہے۔ جس میں اکتسابِ فیض کے فزوں تر ساماں بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ غم زیادہ قابلِ قدر ہوا کرتا ہے جبکہ ایسا غم جو انسان کو محصورِ بیم و یاس کر دے، وہ زوال کی علامت ہوا کرتا ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے تصورِ غم کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کے اولین مجموعہء شعر ''معجزہ'' مطبوعہ فروری 1999ء کے نصف دوم کو مذکورہ موضوعاتی تناظر میں شاملِ تجزیہ کریں گے جس میں غزلیات ومنظومات شامل ہیں۔ ہم ان کی منتخب غزلیات و نظمیات اور منتخب اشعار کا تجزیہ ان کے تصورِ غم کے تناظر میں کریں گے اور تمام انتقادی تناظرات

کوملحوظِ خاطر رکھا جائے گا۔تمام تر نظری و اطلاقی تنقیدی ضابطوں کی پاسداری کی جائے گی جن میں اسلوبیاتی حوالے بھی ہوں گے۔عروضی پس منظر بھی ہوگا۔صنائع و بدائع اور رموز و وقائع بھی زیرِ بحث آئیں گے۔کلی زاویہءتنقید کی کارفرمائی ہوگی۔

شاہدہ لطیف کے ہاں دیگر جذبات و احساسات کے پہلو بہ پہلو غم کا جذبہ پوتر بھی ہے اور اپنی پوری شدت وحدت سے کارگر ہے جو شدتِ احساس اور ان کے زورِ بیاں کا مظہر ہے۔غم کی دیگر نوعیات کے برعکس غمِ تنہائی سخت ناگوار اور اذیت ناک ہوا کرتا ہے۔ان کی ایک پوری غزل دیکھیے جو اسی احساس کی آئینہ بندی کرتی ہے جو بحرِ اوفر میں ہے جس کا سالم رکن ''مفعولاتن'' ہے۔

دنیا بھی تنہا لوگوں سے ناچار مخاطب ہوتی ہے
جب بولنے والا کوئی نہ دیوار مخاطب ہوتی ہے
خاموش نہیں یہ رہ سکتیں خلوت میں بولنا پڑتا ہے
ہر خشتِ در و دیوار پئے گفتار مخاطب ہوتی ہے
وادی کے سکوت میں گونجتی ہے آواز کسی کے بولنے کی
جب چاندنی رات میں ہوا سرِ کہسار مخاطب ہوتی ہے
گولڑکی چپ چپ رہتی ہے ان بولنے والے لوگوں میں
جب تنہائی سے ہوتی ہے دوچار مخاطب ہوتی ہے
جو خود کو بچاتے رہتے ہیں انبوہِ گرانِ خلقت سے
ان لوگوں سے تنہائی کی تلوار مخاطب ہوتی ہے
اک شکل مری صورت کی طرح کچھ کہتی ہے آئینے میں
ہر بار میں چپ ہو جاتی ہوں ہر بار مخاطب ہوتی ہے

(ص:81)

شاہدہ لطیف کے ہاں غم کے کچھ افادی پہلو بھی ہیں جنہیں وہ سماجی ارتقا کے لیے ناگزیر کیا کرتی ہیں۔ وہ انہیں تمثیلاتی انداز میں بھی پیش کرتی ہیں۔ جیسے سونا آگ میں جل جل کر کندن ہو

جاتا ہے، اس لیے وہ شخصیت کی پختگی کے لیے غم کو ضروری خیال کرتی ہیں۔ ان کے ہاں غم کے حوالے سے یہ ایک مثبت پہلو ہے۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں غم کا ایک تھکا دینے والا تاثر بھی پایا جاتا ہے جو اتنا مضبوط و مستحکم نہیں ہے۔ گویا ان کے ہاں غم کی متنوع کیفیات کا بیان پایا جاتا ہے۔ اسی پس منظر میں ان کی ایک اور غزل ہدیہء قارئین ہے جو بحر ہزج محذوف مخبون میں کہی گئی ہے۔ جس کا وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ فاعلان'' ہے۔ عروض وضرب میں کبھی محذوف یعنی ''فاعلن'' اور کبھی مخبون یعنی ''فعلن''، مستعمل ہے کیونکہ علمِ عروض میں آخری رکن میں ایک حرف کی کمی بیشی روا ہوتی ہے۔

سونا تپتا ہے تو کچھ اور چمک جاتا ہے
وقت کی آگ میں ہر حادثہ پک جاتا ہے
مجھ سے گھبرا کے مری روح بدن دوز ہوئی
میرا سایہ بھی مرے بوجھ سے تھک جاتا ہے
کچھ سلگتی ہوئی فطرت سے میں جل جاتی ہوں
کچھ خیالوں کا جہنم بھی بھڑک جاتا ہے
دل لہو روتا ہے افکار کی حد بندی پر
قتلِ جذبات پہ احساس بلک جاتا ہے
عزم راسخ ہو تو گمراہ کو منزل مل جائے
ورنہ رہبر بھی بھٹکنے کو بھٹک جاتا ہے
شاہدہ آتا ہے جس وقت زمانے کا خیال
ہاتھ سے دامنِ امید سرک جاتا ہے

(ص:84)

ان کے غم کا یہ عالم ہے کہ ان کے ہاں سلگتی ہوئی فطرت بھی ہے اور خیالوں کا جہنم بھی ہے جو ان کے سوز و گداز کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے نزدیک افکار کی حد بندی اور قتلِ جذبات بہت

اذیت ناک ہیں جوان کے لیے باعثِ غم کا درجہ رکھتے ہیں مگر وہ عزمِ راسخ کی حامل ہیں جوانہیں ان کی منزل پر لے جاتا ہے ورنہ تو دنیا میں رہبروں کو بھٹکنے میں دیر نہیں لگتی۔ان کا ایک اور باعثِ غم ناگوار عصری رویے بھی ہیں۔ان کے ہاں غم اور باعثِ غم دونوں زیرِ بحث آتے ہیں۔یوں ان کے غم کی تفہیم کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔

شاہدہ لطیف کے سامنے بہت سے مسائل ہیں جو خود میں طرح طرح کی سنگینیاں سموئے ہوئے ہیں۔جن کا ہر ہر پہلو اذیت ناک ہے۔جو آشوبِ ہستی کا سماں پیش کر رہا ہے۔بہت سے زخم ہیں جن کی مسیحائی محال نظر آتی ہے۔ان تمام دشواریوں کے باوجود بھی وہ آگے بڑھنے کا عزمِ صمیم رکھتی ہیں۔گویا غموں سے ان کو ایک طرح کا حوصلہ ملتا ہے اور ان کے شریر کو شکتی ملتی ہے۔ان کی غزل کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں جو بحرِ وافر کے مربع محذوف وزن میں کہے گئے ہیں۔

منزل دھند میں لپٹی ہے
رستے ہیں ویران بہت
کب کسی سے سل سکتے ہیں؟
زخم ہیں میری جان بہت

(ص:89)

وہ ایک دردِ دل رکھنے والی اہلِ قلم ہیں۔انہیں سماج کے ہر طبقے کا احساس ہے۔انسانیت اور انسانی ہمدردی ان کے افکار میں فراواں ہے۔وہ ملت کے ہر فرد کو مقدر کا ستارہ بنانا چاہتی ہیں۔ایسے احساسات کے حامل اہلِ قلم ایک مثالی ادب تخلیق کیا کرتے ہیں اور شاہدہ لطیف نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ان کا ایک شعری فن پارہ جو نظمِ معریٰ کی ہیئت میں ہے اور چائلڈ لیبر کے پس منظر میں کہی گئی ہے،جس کا عنوان بھی ''چائلڈ لیبر'' ہے،قابلِ ذکر ہے۔جو بحرِ وافر مربع سالم میں ہے۔جس کا عروضی وزن ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہے۔

اس نظم میں موجود استفہامیہ اشارات نے نظم کے زورِ بیاں کو فزوں تر کر دیا ہے جس کے باعث جاذبیت اور اپنائیت کے شواہد آشکار ہوئے ہیں۔

کس نے پھول بدن ہاتھوں میں
لوہے کے اوزار دیے ہیں؟
کس نے کھیل کھلونے لے کر
سارے جگنو مار دیے ہیں؟
جانے کتنے شہزادوں کی؟
بھوک بلک کر سو جاتی ہے
پیٹ پہ باندھے پتھر ممتا
مستقبل میں کھو جاتی ہے
جانے کون محافظ ہو گا؟
مستقبل کے معماروں کا
جانے سورج کون بنے گا؟
اس دھرتی کے اندھیاروں کا

(ص:98)

مذکورہ بالا نظم میں سماجی محرومیوں کا بھرپور حوالہ ہے۔عمرانی حوالے سے بہت سے سوالات ہیں جونوکِ زباں پر آ چکے ہیں۔ایک دعوتِ غور وفکر ہے۔ایک انقلابی اور مزاحمتی انداز ہے جو ترقی پسند فکر کی غمازی کرتا ہے۔انسانی ہمدردی کے رویوں کونمو بخشتا ہے اور عمل کی تحریک بھی اس سے وابستہ ہے۔

شاہدہ لطیف کی ایک اور آزاد نظم لائقِ التفات ہے جو مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہی گئی ہے۔ ان کی اس نظم میں سعیِ پیہم کا ایک حسیں آدرش پنہاں ہے۔ان تھک محنت کا ایک انداز ہے جو جلوہ ریز ہو رہا ہے۔امیدوں اور امنگوں کا ایک جہان آباد ہے جن کی نمو احساسِ غم کے جذبے کی مرہونِ منت ہے۔جو لامتناہی مصائب و آلام اور کٹھنائیوں سے عبارت ہے جسے ان کے عزم و حوصلے کی دلیل بھی کہا جا سکتا ہے۔

ایک سفر ابھی کٹ نہیں پایا
چکر ہے پھر پاؤں میں
اپنا آپ کہاں ڈھونڈیں گے
کس بستی کس گاؤں میں؟

دور سفر اور منزل مشکل
پورا جیون بھاگے ہیں
جیسے سورج کی آہٹ میں
شب بھر کے ہم جاگے ہیں

کتنے دریا اور سمندر
عزم سے اپنے پاٹے ہیں
جنگل ، صحرا اور جزیرے
لمحہ لمحہ کاٹے ہیں

جانے سورج کب نکلے گا؟
جانے رات ڈھلے گی کیسے؟
دنیا کو معلوم نہیں ہے
من کی آگ جلے گی کیسے؟

کب طوفان تھمیں گے آخر؟
کب ہوگا ٹھہراؤ من میں؟

ایک قدم بس اور بڑھا کر
کوئی دیپ جلاؤں من میں

ان کی حزنیہ شعری طبع کی عکاسی کے حوالے سے ایک اور غزل بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین ہے جس کا تجزیہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔غزل ھذا بحر ہزج مثمن مقصور محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن / فاعلان'' ہیں۔ایک ہی غزل میں عروض وضرب میں کبھی مقصور اور کبھی محذوف کی زحافاتی فضا اس لیے ہے کہ عروضی حوالے سے ایک حرف کی کمی یا بیشی روا خیال کی جاتی ہے۔اس غزل میں ''کے پھول'' کی ردیف نے حزن و طرب کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

دیکھتا ہے کون جا جا کر بیابانوں کے پھول
آپ کھلتے ہ، آپ مرجھاتے ہیں ویرانوں کے پھول
اک نہ اک دن ان کا کملاجاناہی تقدیر ہے
قصر کی کلیاں ہوں یا رنگین ایوانوں کے پھول
کتنے دل اس انتظارِ شوق میں مرجھا گئے؟
میرے آنگن میں مہکتے میرے ارمانوں کے پھول
ساری مصنوعی سجاوٹ جلتے بجھتے قمقمے
اب دکھائی دیتے ہٰ ھی کم کم ہیں دالانوں کے پھول
خالی گملے سونے گھر جب سے نظر آئے مجھے
اجنبی معلوم ہوتے ہیں گلستانوں کے پھول
جن کے دل میں احترامِ گل نہیں جب شاہدہؔ
کارنس پر کیوں سجا لیتے ہیں گلدانوں کے پھول

(ص:104)

شاہدہؔ لطیف کی غزل کے چند اشعار دیکھیے جن میں حزن و ملال کے جذبے انتہائی فطری

رنگ میں پائے جاتے ہیں اور خالص آمد کا رنگ محسوس ہوتا ہے۔غزل ھذا بحر ہزج مربع مقبوض میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ’’مفاعلن مفاعلن‘‘ ہے۔

رات بھر اداسی تھی
جھیل کتنی پیاسی تھی
ہر طرف تھا اندھیارا
اور بدحواسی تھی
غم سے اس قدر میری
کل بھی روشناسی تھی
یہ زمین زنداں سی
اور میں سزا سی تھی

(ص:124)

شاہدہ لطیف کے سخن میں حزن وطرب کے یکساں کوائف ہیں۔اگر حزن و ملال بیم و یاس کا مشیر ہے تو طربیہ عوامل رجائی امکانات کے حامل ہیں۔ان کے ہاں غم کا ایک صحت منداور مثبت تاثر بھی ملتا ہے۔ جو شخصیت کی نمو میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور کردار سازی میں سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ان کے حزنیہ شعری تاثر سے بیم و یاس کے احساسات کو تقویت نہیں ملتی بلکہ عزم وحوصلے کو فروغ میسر آتا ہے۔سعی پیہم کی تحریک ملتی ہے جس سے قاری کے من میں کچھ کرنے کی خو جاگتی ہے۔

شاہدہ لطیف کے سخن میں استفہامیہ اشارات

علم البیان جو بیان کے مختلف قرائن کا مخزن ہے، ان قرینوں میں سے ایک معتبر و وقیع قرینہ اندازِ استفہام بھی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بات کو سمجھنے اور واضح کرنے کے لیے کچھ دریافت کیا جائے یا پوچھا جائے۔ اس کے لیے دیگر زبانوں اور اردو زبان میں کچھ الفاظ مقرر ہیں جن کو حروفِ استفہام کہا جاتا ہے مثلاً کب، کیوں، کہاں، کیا اور کیسے وغیرہ۔ دنیا و عقبیٰ کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں حروفِ استفہام کی اہمیت سے مفر ممکن ہو۔ حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کی راہنمائی بارگاہِ ایزدی سے ملتی ہے۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید کے ذریعے استفہامیہ اندازِ بیاں کی بدولت حضرتِ انساں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام فرمایا ہے۔ اس سے بیان وقیع اور معتبر ہوتا ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ کے کلام کا تجزیہ استفہامیہ اشارات کے تناظر میں کریں گے۔ اس سلسلے میں ان کی منتخب غزلیات و نظمیات اور منتخب اشعار زیرِ بحث آئیں گے۔ اس حوالے سے ہم نے ان کے شعری مجموعہ ''معرکہء کشمیر'' مطبوعہ جولائی 2001ء کے نصف دوم کو شامل کریں گے۔ یہ ان کی ایک نظریاتی و انقلابی تخلیق ہے جو خود میں ایک بھرپور ملی تاثر بھی رکھتی ہے۔

ان کی نظم ''صبحِ کشمیر'' استفہامیہ اشارات کی نسبت سے ملاحظہ کریں۔ نظم ھذا بحرِ اوفر مربع محذوف میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''مفعولاتن مفعولن'' ہے۔

کب خوف کا منظر ٹوٹے گا؟
کب صبح کا تارہ چمکے گا؟

کب کھیتوں اور کھلیانوں میں؟
کب جھیلوں اور میدانوں میں؟
کب پیڑوں اور چٹانوں میں؟
کوئی موسم اپنا مہکے گا
کب خوف کا منظر ٹوٹے گا؟

کب رات لبادہ بدلے گی؟
کب اجلی سحر آ جائے گی؟
کب ہر اک بستی مہکے گی؟
کوئی بادل چھم چھم برسے گا
کب خوف کا منظر ٹوٹے گا؟

کب باسی گھر کو جائیں گے؟
کب گیت خوشی کے گائیں گے؟
کب اپنی منزل پائیں گے؟
کوئی نور زمیں پر اترے گا
کب خوف کا منظر ٹوٹے گا؟
کب صبح کا تارہ چمکے گا؟

(ص:103)

نظم ھذا میں جہاں مقبوضہ کشمیر کے حوالے سے بھارتی جبر و استبداد کو اجاگر کیا گیا ہے، وہاں استفہامیہ اشارات کے وفورِ استخدام کا حوالہ بھی محلِ نظر ہے جن کے اسباب و علل میں یہ امر شامل ہے کہ بھارت کے غاصبانہ قبضے اور ریاستی دہشت گردی کے باعث مقبوضہ وادی کا ماحول

خونچکاں مناظر پیش کرتا ہے۔ اس نظم میں استفہامیہ اشارات کے بکثرت استعمال نے شدتِ جذبات و احساسات کے پہلو بہ پہلو زورِ بیاں کو بھی فزوں تر کر دیا ہے جن کے باعث کلام کی نفسیاتی و فلسفیانہ سطح بلند ہوئی ہے اور تاثیراتی کیفیات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ''صبحِ کشمیر'' میں موجود استفہامیہ اشارات دراصل کشمیر کی نوکِ زباں پر موجود سوال ہیں جو وہ امتِ مسلمہ اور عالمی برادری سے کر رہے ہیں۔ عالمی جمود کو توڑنے کی سعیِ مشکور کی گئی ہے۔ انقلاب کی راہیں ہموار کی گئی ہیں۔ یہاں انقلاب سے مراد نظری و عملی انقلاب ہے جس کی ساعتِ موجود میں اشد ضرورت ہے۔

استفہامیہ اشارات کی حامل ایک غزل کے چار اشعار ہدیہء قارئین ہیں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ہیں جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔ مفاعیلن کی محذوفی صورت ''فعولن'' ہے۔

زمیں پر کیوں اندھیرا چھا رہا ہے؟
یہ سوج خود ہی ڈھلتا جا رہا ہے
کہاں کو دوڑتی جاتی ہے خلقت؟
کہ رستہ منزلوں کو کھا رہا ہے
دلوں میں روشنی بڑھتی نہیں ہے
دلوں میں میل سا کیوں آ رہا ہے؟
مجھے اب شاہدہ یہ دیکھنا ہے
کہاں جاتا ہے جو بھی آ رہا ہے؟

مذکورہ اشعار کشمیریاتی تناظر کے حامل ہیں جن میں اہلِ کشمیر کی تصویرِ غم پیش کی گئی ہے۔ ظلمتوں کے فروغ کا ایک حوالہ ہے۔ سورج کے زوال کی عکاسی ہے۔ یعنی روشنی کی ناکامی کا مذکور ہے۔ عصری آشوب کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دلوں میں روشنی کے ماند پڑنے کا ذکر ہے۔ دلوں میں موجود نفرتوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ اس غزل میں ایک تحیر و استعجاب کی

فضا پائی جاتی ہے جو اس کے فلسفیانہ اور نفسیاتی گراف کو بلند کر رہی ہے اور تاثیرات کے کوائف فزوں تر ہو رہی ہیں۔ ایک طرح کا کلائمکس ہے جو ان اشعار میں روحِ رواں کا درجہ رکھتا ہے۔

ان کی غزل کا ایک شعر جو استفہامیہ اندازِ فکر کا حامل ہے، نذرِ قارئین ہے جو بحر متقارب مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کا وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

یہ کس سمت میں ہے سفر ارتقا کا
پریشان ارض و سما ہو رہے ہیں

(ص:131)

اگر چہ یہ شعر کشمیریاتی تناظر میں کہا گیا ہے مگر ایک ہمہ گیر تاثر کا حامل ہے۔ اس شعر میں مجموعی طور پر انسان کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے کہ اس کی حالتِ زار پر مظاہرِ فطرت بھی پریشان و مضطرب ہیں۔ حتیٰ کہ زمین و آسماں بھی کیفیتِ اضطراب میں مبتلا ہیں۔ یہ شعر دراصل انسان کی خلافِ توقع صورتِ حال کی غمازی کرتا ہے، جس کی توضیح کچھ اس طرح ممکن ہے کہ انسان جو اپنے آپ کو محوِ ارتقا سمجھتا ہے، اس کے ارتقا کے سفر کو اگر حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو کافی حد تک قابلِ اعتراض ہے کیونکہ انسان کے ہاں تنزلی کے شواہد فزوں تر ہیں اور ارتقا کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر ہے۔ یہ ایک ایسا شعر ہے جو انسانی وقار کے حوالے سے ایک سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے رفعت و افتخار کا قصر ایک دم دھڑام سے گر جاتا ہے اور انسان اپنی حقیقتِ حال سے واقف ہو جاتا ہے۔ شعر ھذا شاہدؔہ لطیف کے تخلیقی ارتقا کا ایک عمدہ مظہر اور بین دلیل ہے۔

ان کی نظم ''ساری دعائیں'' سے ایک شعر زیبِ قرطاس ہے۔ یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں ہے جو بحر رمل مثمن محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔ ''فاعلن'' فاعلاتن کی محذوفی صورت ہے۔ شعر ھذا میں کلائمکس کی ایک بھرپور فضا ہے جو حیرت واستعجاب کے نئے ابواب وا کر رہی ہے۔

جنگ اب میدان سے ایوان میں ہونے کو ہے

کون کیا پانے کو ہے اور کون کیا کھونے کو ہے

(ص:142)

شاہدؔہ لطیف کی غزل کا ایک مطلع دیکھیے جو استعجابیہ انداز کا حامل ہے جو بحرِ اوفر مثمن محذوف میں کہا گیا ہے۔جس کا وزن ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن مفعولن'' ہے۔شعر ھذا میں عصری حوالے سے دوہرے رویوں کی نسبت تنقید کی فضا پائی جاتی ہے۔

کیسے لوگ منافق ہیں یہ کتنے سیدھے بیٹھے ہیں؟

باہر آ کر بول رہے ہیں اندر سہمے بیٹھے تھے

(ص:153)

ان کی ایک پوری غزل جس میں ایک استفہامیہ ردیف ''کیا تماشا ہے'' کو بروئے کار لایا گیا جو بحر ہزج مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے،پیشِ خدمت ہے۔غزل ھذا کا تبصرہ وتجزیہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قارئین اس غزل کے حوالے سے کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

سبھی نامعتبر ہیں معتبر یہ کیا تماشا ہے؟
سرِ بزمِ تماشا اے نظر یہ کیا تماشا ہے؟
درو دیوار باتیں کر رہے ہیں شور کرتے ہیں
مگر خاموش ہے کیوں سارا گھر یہ کیا تماشا ہے؟
یہ گردو پیش میں جو کچھ بپا ہے حشر کا عالم
سمجھتے ہیں یہ سب کچھ ہم، مگر یہ کیا تماشا ہے؟
ابھی رختِ سفر تکمیل کو پہنچایا تھا میں نے
کیا کیوں ملتوی عزمِ سفر یہ کیا تماشا ہے؟
جو سیلِ آب سے کچھ بہکے تھے مالک مکانوں کے
وہی اب پھر رہے ہیں دربدر یہ کیا تماشا ہے؟

کہیں سے تو ہوائے تازہ کا جھونکا چلا آئے
نہیں آتی کبھی اچھی خبر یہ کیا تماشا ہے؟
گماں کب تک شاہدؔہ اس خوں خرابے کا مجھے ہوتا
مقابل ہو رہے ہیں سنگ و سر، یہ کیا تماشا ہے؟

(ص:155)

ان کی ایک اور غزل جو خود میں استفہامیہ اشارات سموئے ہوئے ہے، جس میں شاہدؔہ لطیف مقدر سے سراپا سوال ہیں۔ کلاسیکی شاعری میں گردوں یا آسمان کو مقدر کے استعارے کی حیثیت حاصل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے متقدمین اساتذۂ فن سے بھی اکتسابِ فیض کیا ہے۔ آمدہ غزل کے مطلع میں بھی یہی کیفیت ہے جس میں عصری آشوب کے حوالے سے سوال کیا گیا ہے کہ یہ جہاں کیوں پرآشوب ہے۔ تنگ کرنے کا یہ سلسلہ کتنا دراز ہے۔ ظلم کی بجلیاں اور آندھیاں کب تک جاری رہیں گی۔ یہ غزل مقبوضہ کشمیر کے تناظر میں ہے۔ تمام تر استفہامیہ اشارات بھی اسی حوالے سے ہیں اور بھارتی ظلم واستبداد سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ کس نے میرے روشن چمن کو لوٹ لیا۔ کس نے آبادیاں ویران کر دیں؟ کس نے سروں سے ردائیں چھین لیں؟ کس نے آنکھوں میں ویرانیاں بھر دیں؟ ظلم اور مظلوم کا یہ فیصلہ ہونا چاہیے۔ آخر کب تک یہ ویرانی مسلط رہے گی۔ شدتِ احساس اور زورِ بیاں کے فکری وفنی تلازمات پورے طور پر کارگر نظر آتے ہیں۔ یہ غزل بحر رمل مسدس محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔ غزل دیکھیے:

تو بتا اے آسماں ہفت آسماں
خون سے رنگیں ہے کیوں میرا جہاں؟
اور کتنا تنگ کرتے جاؤ گے؟
کیوں ہیں جاری بجلیاں یہ آندھیاں؟
کس نے لوٹا ہے مرا روشن چمن؟

کس نے آبادی کو دیں تاریکیاں؟
کس نے چھینی ہیں سروں سے چادریں؟
کس نے آنکھوں میں بھری ویرانیاں؟
ظالم اور مظلوم کا فیصلہ
کب تلک دیکھا کریں ویرانیاں؟

شاہدہ لطیف کے سخن میں فزوں تر استفہامیہ اشارات پائے جاتے ہیں جو ان کے کلام کی فلسفیانہ اور نفسیاتی سطح کو بلند کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری کینوس میں فزوں تر شدتِ احساس بھی ہے اور زورِ بیاں بھی زوروں پر ہے۔ جس سے ان کی شاعری میں جاذبیت اور اپنائیت کی فضا پائی جاتی ہے۔ جس طرح غالب کے کلام کے تحقیقی مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کے زورِ بیان کا ایک سبب استفہامیہ اشارات بھی ہیں۔ یہی معاملہ شاہدہ لطیف پر بھی صادق آتا ہے۔ شذرہ ھذا میں دی گئی استشہادات ان کے کلام میں موجود استفہامیہ اشارات کا عشرِ عشیر ہیں۔ ہم نے قصداً طولِ بیان سے گریز کیا تا کہ قاری کی طبعِ نازک پر گراں نہ گزرے کیونکہ جو اہلِ قلم قارئین کی زیادہ سے زیادہ سہولت کا اہتمام کر پاتے ہیں وہ اتنے ہی زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ شاہدہ لطیف کا استفہامیہ کینوس بسیط و عریض ہے جس پر لکھنے کے لیے کم از کم پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ درکار ہوگا۔

شاہدہ لطیف کا دعائیہ طرزِ کلام

ایک بندۂ مومن کی حقیقی پہچان یہی ہے کہ اس کا اپنے خالقِ حقیقی سے ربط وضبط انتہائی مضبوط ہوتا ہے اور اپنے مالک کا زیادہ سے زیدہ حقِ بندگی ادا کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ انسان ہوتا ہے۔ وہ اپنی ریاضتوں کے پہلو بہ پہلو دعا کے عمل سے بھی گزرتا رہتا ہے۔ اس کے دعائیہ افکار اس کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہیں اور خلوصِ نیت کا اندازہ بھی بہ حسن وخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے دعائیہ طرزِ سخن کے حوالے سے اپنے تجزیات سپردِ قرطاس کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کے منظوم سفرنامہ ''بیت اللہ پر دستک'' مطبوعہ اکتوبر 2012ء کے نصف دوم سے شعری استشہادات منتخب کریں گے جن میں منتخب غزلیات ونظمیات اور قطعات واشعار شامل کیے جائیں گے۔

شاہدہ لطیف ملک وملت سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ شعری حوالے سے ان کا ملی وقومی کینوس بسیط وعریض ہے۔ حب الوطنی کا جذبہ ان کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ وہ ایک مخلص مسلمان ہونے کے پہلو بہ پہلو محبِ وطن پاکستانی بھی ہیں۔ اس لیے وہ پاکستان کے حق میں دعا گو رہتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ فرائض کی تسلسل سے ادائیگی کا عزم بالجزم بھی رکھتی ہیں۔ یہ ان کی وطن سے بے پایاں محبت کا فزوں تر اظہار ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دیش بھگت شاعرہ ہیں۔ اپنے ملک اور اپنی قوم سے محبت ان کی گھٹی میں شامل ہے۔ اس سلسلے میں ان کے والدین نے جو ان کی تربیت کی ہے، وہ معیار بھی قابلِ ستائش ہے۔ ان کی غزل کا ایک مطلع

اسی حوالے سے دیکھیے جو بحر ہزج مثمن محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان ’’مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن‘‘ ہیں۔

میں پاکستان کے حق میں دعا کرتی رہوں گی
فرائض جو بھی ہیں میرے ادا کرتی رہوں گی

(ص:89)

ان کے ہاں شعری حوالے سے متنوع ہیئتی تجارب بھی ملتے ہیں۔ انہوں نے اکثر و بیشتر اصنافِ شعر میں بطریقِ احسن سخن سنجی کی ہے۔ ان کا ایک استدعائی اندازِ فکر کا حامل قطعہ ہمارے پیشِ نظر ہے جو بحر کامل مثمن سالم میں کہا گیا ہے۔ یہ بحر جیسی دائرے میں وضع کی گئی ہے ویسی ہی مستعمل ہے۔ اس لیے اس کو کامل کہتے ہیں۔ اس کا عروضی وزن ’’متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن‘‘ ہے۔

مجھے اور کچھ نہ سجھائی دے مجھے اور کچھ نہ دکھائی دے
مجھے بخش ایسی متاع جس سے تو اپنے در پہ رسائی دے
تو کریم ہے تو رحیم ہے تو عظیم ہے تو صمیم ہے
مجھے مشکلوں سے نجات دے مجھے وحشتوں سے رہائی دے

(ص:91)

قطعہ ھذا دوہرے فکری تناظر کا حامل ہے جس میں دعائیہ طرزِ فکر بھی ہے اور حمدیہ تاثر بھی موجود ہے۔ اس سے ان کے توحید کے حوالے سے ایک پختہ عقیدے کی عکاسی ہوتی ہے۔ خدا کی ذات سے بے پناہ محبت کا اظہار بھی ہے۔ وہ صرف اللہ کی ذات سے لو لگاتی ہیں اور دنیا و ما فیہا سے بے نیاز نظر آتی ہیں۔ انہوں نے ایک مصرع کے مختصر پیمانے میں چار خدائی صفات جو چار اسمائے حسنیٰ بھی ہیں، مجتمع کر دیے ہیں جن میں کریم، رحیم، عظیم اور صمیم شامل ہیں۔ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کو قادرِ مطلق سمجھتی ہیں اور اسی سے ہی مدد چاہتی ہیں۔ تمام مصائب و آلام کا مداوا اسی ذاتِ بابرکات کی بدولت سمجھتی ہیں۔ یہ قطعہ منفرد دعائیہ اندازِ فکر کا حامل ہے جس سے شاہدہ لطیف

کے فکروفن کی عمدگی کی عکاسی ہوتی ہے۔

ان کی ایک پوری غزل ملاحظہ کریں جو مکمل طور پر دعائیہ اندازِفکر کی حامل ہے جس میں قربِ خداوندی کے حصول کے لیے چشمِ نم کی آرزو کی گئی ہے۔جس میں سوزِغم کی تمنا بھی شامل ہے۔وہ خدا کے برگزیدہ بندوں کے راستے پر چلنا چاہتی ہیں کیونکہ اس میں فلاح وکامیابی کی ضمانت ہے۔ وہ عنایاتِ ایزدی کا اعتراف کرتی ہیں اوراس سلسلے کے دراز ہونے کی خواہاں ہیں۔انہوں نے اپنی اس غزل میں جامِ جم کی معروف کلاسیکی تلمیح کا بھی استخدام کیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ایران کے بادشاہ جمشید کے پاس ایک ایسا پیالہ تھا جس میں وہ ہفت اقلیم کو مشاہدہ کرتا تھا۔وہ لمحہ بہ لمحہ خدا کی رحمتوں کی طلبگار رہیں۔وہ اپنی زندگی کی ذمہ داریوں کی تکمیل چاہتی ہیں اورمحوِ دعا ہیں کہ انہیں اتنی مہلت میسر آجائے تا کہ وہ اپنے فرائضِ حیات بہ حسن وخوبی پورے کرسکیں۔غزل پیشِ خدمت ہے۔

مری زندگی کے مالک مجھے چشمِ نم عطا کر
جو ترے قریب لائے وہی سوزِ غم عطا کر
جو مجھے بھی لے کے جائے ترے برگزیدگاں میں
وہی راستہ دکھا دے وہی پیش وخم عطا کر
جو ہوئیں عنایتیں وہ نہیں کم کسی طرح بھی
رہے کچھ بھرم اسی کا مجھے اب نہ کم عطا کر
یہ جو آئینے ملے ہیں مجھے چہرہ دیکھنے کو
مجھے کب طلب تھی ان کی کوئی جامِ جم عطا کر
نہ رہے کوئی بھی حسرت نہ سماج کی سماجت
مجھے رحمتوں کے تحفے تو قدم قدم عطا کر
کوئی قرض رہ نہ جائے مری زندگی کا مجھ پر
مجھے مہلت اتنی دے دے مجھے اتنا دم عطا کر

(ص:97)

غزل ھذا اسلوب کی عمدگی کا مظہر ہے۔ مطلع میں چشمِ نم اور سوزِ غم جیسے خوبصورت مرکبات استعمال ہوئے ہیں جو بیک وقت مرکب اضافی بھی ہیں اور مرکب توصیفی بھی ہیں۔ اسی طرح پہلے شعر میں پیچ وخم کا مرکب بھی دوہری خصوصیات کا حامل ہے جو بیک وقت مرکب عطفی بھی ہے اور مرکب توصیفی بھی ہے۔ اسی طرح تیسرے شعر میں جامِ جم کا مرکب بھی خود میں اضافی اور توصیفی حوالہ رکھتا ہے بلکہ خود میں تلمیحی تاثر بھی رکھتا ہے۔ مرکبات کے دوہرے اور تہرے تناظر ان کی اسلوبیاتی اور لسانیاتی اپچ کے عکاس ہیں۔ جس سے زبان و بیان پر ان کی گرفت کا تعین بطریقِ احسن کیا جاسکتا ہے۔ جس سے شاہدہ لطیف کا لسانی تبحر لائقِ تحسین ہو جاتا ہے۔ ان کی یہ غزل ایک مرکب بحر میں کہی گئی ہے جو بحر سریع مثمن مخبون مکسوف سے موسوم ہے۔ جس کا عروضی وزن ''مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن'' ہے۔ یہ بحر اگرچہ اردو میں غیر مستعمل شمار کی جاتی ہے مگر شعرا اور شاعرات کے ہاں اس کے شواہد ضرور ملتے ہیں۔

ان کی ایک نظمِ معریٰ دیکھیے جس کا عنوان بھی ''دعا'' ہے جس میں موجود قوافی نے پابند نظم کا سماں باندھ دیا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شاہدہ لطیف نے عروسِ سخن غزل کی فزوں تر خدمت کی ہے۔ یہ اسی ریاضت کا ہی اثر ہے کہ ان کی نظمِ معریٰ اور آزاد نظم بھی پابند شاعری کا لطف لیے ہوئے ہیں۔ یہ نظم بحر رجز مربع سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''مستفعلن مستفعلن'' ہیں۔ مربع وزن میں ایسے عمدہ اشعار نکالنا بھی کمالِ فن کی علامت ہے۔

میرے مہرباں اے مرے خدا
کوئی ایک لمحہء معتبر
کوئی ایک لمحہء جاں فزا
میرے دد کی ہو کوئی دوا
میرے مہرباں اے مرے خدا
مرے حال پر ہو تری عطا

میرے مہربان اے مرے خدا
مجھے غاصبوں سے نجات دے
مجھے پرسکوں کوئی رات دے
میری سب دعائیں قبول کر
میرے دشمنوں کو تو مات دے
مجھے آندھیوں سے تو ہی بچا
میرے مہرباں اے مرے خدا
وہ زمین ہی ہے چمن مرا
وہی وادیاں ہیں وطن مرا
یہ ہی زندگی ، یہ ہی آرزو
یہ ہی جسم و جاں، یہ ہی تن مرا
ہو نویدِ جاں کوئی معجزہ
میرے مہرباں اے مرے خدا
میں نہیں ہوں لائقِ امتحاں
میں ہوں اصل میں بڑی ناتواں
تیری ذات، ذاتِ کریم ہے
میرے پاسباں، میرے مہرباں
مجھے ترا ہی تو آسرا
میرے مہرباں اے مرے خدا
کوئی ایک لمحہء معتبر
کوئی ایک لمحہء جاں فزا

(ص:117-118)

یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ مبتلائے ابتلا ہوتا ہے، جب اسے کسی قدرتی آفت کا سامنا ہوتا ہے تو وہ بے ساختہ محوِ دعا ہوجاتا ہے اور اپنے خالق و مالکِ حقیقی سے مدد طلب کرتا ہے۔ شاہدہ لطیف کی نظم بعنوان ''خدا خیر کرے'' جو دعائیہ تاثر کی حامل ہے، اور سیلاب کے تناظر میں کہی گئی ہے، غزل کی ہیئت میں ہے۔ نظم کی یہ ایک مقبول ترین ہیئت ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قارئین کی پسند سے بخوبی واقف ہیں۔ نظم کے تین اشعار نذرِ قارئین ہیں جو بحر رمل مثمن محذوف میں ہیں۔ اس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔

چاروں صوبوں میں ہے سیلاب خدا خیر کرے
بستیاں آئیں تہِ آب خدا خیر کرے
ہر طرف پھیل گئی سیلِ رواں کی چادر
کھیت کھلیان ہیں غرقاب خدا خیر کرے
بہہ گئے تیز بہاؤ میں کہ کچھ کر نہ سکے
کتنے ہی گوہرِ نایاب خدا خیر کرے

(ص:129)

شاہدہ لطیف کے فکری و فنی گوشوں کی سیر حاصل سیر کے بعد یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ وسیع تر دعائیہ فکری کینوس کی حامل ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی ذات پر کس قدر اعتماد رکھتی ہیں۔ وہ عقیدۂ توحید کی سختی سے قائل ہیں جس کا تعین ان کی فکریات سے بہ حسن و خوبی کیا جا سکتا ہے۔

شاہدہ لطیف اور آشوبِ عصر

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر تخلیق کار اپنے عہد سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور اپنے عہد پر اپنے اپنے اثرات بھی مرتب کرتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ کسی دور کی واژ گونی اور سنگینی جو آشوبِ عصر سے موسوم ہوتی ہے، کا مطالعہ کرنے کے لیے اس دور کی شعریات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ حالات چونکہ عموماً نامساعد رہتے ہیں، البتہ کچھ کمی بیشی ضرور ہوتی رہتی ہے، گویا آشوبِ عصر ایک ایسا موضوع ہے جو تاریخ کے ہر عہد میں اپنی پوری آب وتاب سے تندرست وتوانا رہا ہے۔ اس لیے اس موضوع کو ایک طرح کی زمانی ومکانی ہمہ گیری حاصل رہی ہے۔ چنانچہ متقدمین ومتوسطین اور متاخرین ومعاصرین کے ہاں اس حوالے سے شعری شواہد بکثرت ملتے ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ یہ شاعری کے محبوب ترین موضوعات میں سے ایک موضوع ہے جو خود میں ایک عالمی تناظر بھی رکھتا ہے اور اسے دنیا کے ہر خطے میں پذیرائی حاصل ہے۔ اس موضوع کی مقبولیت کے اسباب وعلل میں یہ امر مبادی ہے کہ اس کا حقیقت پسندی سے بھی گہرا تعلق ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے سخن کا تجزیاتی مطالعہ آشوبِ عصر کی نسبت سے پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کے اولین شعری مجموعہ ''معجزہ'' کی منتخب غزلیات ونظمیات کے اشعارِ منتخبہ برائے استشہادات وتجزیات شامل کریں گے۔ مشمولہ اشعار کو ہم کلی زوایہء انتقاد کی روشنی میں پیش کریں گے اور تمام تر تنقیدی تناظرات بروئے کار لائے جائیں گے۔

عصری آشوب کی نسبت سے ان کی نظم حسین ابنِ علیؑ ہمارے روبرو ہے جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ جس میں حسین ابنِ علیؑ اور یزید کے تلمیحاتی نوعیت کے استعارے برتے گئے ہیں جو خود

میں شدتِ احساس اور زورِ بیان کے پہلو بہ پہلو فزوں تر تاریخی تاثر بھی رکھتے ہیں۔ نظم ہدیہ ءقارئین ہے۔

ہمارے عہد میں کتنے یزید رہتے ہیں؟
ہمارے عہد میں خوں کے فرات بہتے ہیں
ہمارا عہد بھی کرب و بلا کی صورت ہے
حسین ابنِ علیؑ کی ہمیں ضرورت ہے

○

ہماری فکر کے ڈوبے ہوئے سویرے ہیں
ہمارے چار سو پھیلے ہوئے اندھیرے ہیں
ہماری سوچ میں لپٹی ہوئی کدورت ہے
حسین ابنِ علیؑ کی ہمیں ضرورت ہے

○

دل و دماغ میں جب وسوسے اُبھرتے ہیں
غم و الم کے حوادث ہمیں پکڑتے ہیں
حسینیت کا چلن سب سے خوب صورت ہے
حسین ابنِ علیؑ کی ہمیں ضرورت ہے

شاہدہ لطیف کی یہ نظم ایک بھرپور آشوب نامے کا درجہ رکھتی ہے جو ہمارے عصری آشوب کی زبردست عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے ایجاز و اختصار کے تقاضے نبھاتے ہوئے اپنے عہد کی تمام تر سنگینیوں کو ایک نظم کے مختصر پیمانے میں سمو دیا ہے۔ گویا انہوں نے دریا کو کوزے میں بند نہیں کیا، بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس نظم میں ہمارے عہد کی تمام تر ظلمتیں سمٹ کر رہ گئی ہیں جس میں ناروا عصری رویے بھی ہیں اور بے حسی کے شواہد بھی ہیں۔ اس نظم میں مصرع ''حسین ابنِ علیؑ کی ہمیں ضرورت ہے'' ٹیپ کا مصرع ہے جو موضوعاتی بالادستی کا غماز ہے اور نظریہ ء ادب

برائے زندگی کا ترجمان بھی ہے۔اس نظم کا شماران کی معرکتہ الآرا نظموں میں ہوتا ہے۔

مذکورہ موضوع کے حوالے سے ان کی غزل کے تین اشعار دیکھیے جن میں عصری آشوب کے پہلو بہ پہلو استدعائی اندازِ فکر بھی شامل ہے جو مستقبل کے حوالے سے رجائی تاثر کا حامل ہے اور موضوعاتی تنوع کی عکاسی سے مربوط ہے۔مطلع میں وحشت اور حسرت کے دو فکری تلازمے بروئے کار لائے گئے ہیں جن کا علاقہ انسانی حسیات ونفسیات سے ہے جو عصری آشوب کی نمائندگی سے مملو ہیں۔دوسرے شعر میں چارسو نفرتوں کی عملداریوں کی بات کی گئی ہے اور استفہامیہ انداز میں اظہارِ تعجب بھی کیا گیا ہے۔حیرت و استعجاب کا یہ انداز حصارِ ضبط کی شکستگی کی علامت ہے۔تیسرے شعر میں آشوبِ جاں کا تذکرہ وقت کی دو اکائیوں یعنی شام اور سویر کی نسبت سے کیا گیا ہے۔یہ حقیقت بخوبی آشکار ہوتی ہے کہ اس موضوع کے حوالے سے ان کے ہاں متنوع کیفیات پائی جاتی ہیں۔وحشت وحسرت کے استخدام شدہ تلازمات عصری آشوب کے اسباب وعلل کا حصہ ہیں۔یہ اشعار بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن'' ہیں۔

وحشت ہے کہ حسرت ہے خدا خیر کرے گا
دنیا کی جو حالت ہے خدا خیر کرے گا
آنکھیں مری دیکھیں گی تماشا یہ کہاں تک
ہر سمت ہی نفرت ہے خدا خیر کرے گا
ہنگامہ سا رہتا ہے یہاں شام سویرے
ہر شخص بہ عجلت ہے خدا خیر کرے گا

(ص:23)

عصری آشوب کی دیگر وجوہات میں سے بے حسی کے رویوں کا عمل دخل بھی ہے جو حالات کی ابتری میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔اقدار وروایات کی پامالی بھی اسی باعث ہوتی ہے۔مکارمِ اخلاق کی زبوں حالی کا سبب بھی یہی ہے۔اسی نسبت سے شاہدہ لطیف کا شعر دیکھیے جس

کے استفہامیہ انداز نے موضوعاتی شدت میں اضافہ کر دیا ہے

زیادہ اچھا کہ دیوار و در سے سر ٹکراؤں
میں گونگے بہروں کو اپنی غزل سناؤں کیا؟

(ص:24)

متذکرہ موضوع کی نسبت سے ان کی غزل کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں جو موضوع کی نمائندگی کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ شعر اول کے مصرع ثانی میں ایک رجائی تاثر بھی کارفرما ہے جبکہ مقطع میں عصری آشوب کی خفیف سی جھلک مشاہدہ کی جا سکتی ہے جو بندِ ضبط کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیب و شائستگی اور صبر و استغنا کی دلیل بھی ہے۔

اس درجہ دل شکن ہے یہ آلام کی فضا
آہٹ بھی ہو کہیں تو شفا مانتے ہیں ہم
ہم شاہدؔہ لطیف زمانے کا عکس ہیں
یہ بات وہ کہے تو برا مانتے ہیں ہم

ان دو اشعار میں ایک اور بات جو قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ان میں جمع متکلم کا صیغہ ''ہم'' استعمال ہوا ہے جو خالص دبستانِ دہلی کا انداز ہے۔ اس طرز میں ایک تہذیبی رکھ رکھاؤ اور وضع داری کا عنصر پایا جاتا ہے جو شاہدؔہ لطیف کے سخن کا نمایاں وصف بھی ہے جسے ان کی شخصیت اور کردار کی سنجیدگی کی علامت بھی گردانا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ تعین بہ آسانی ہو جاتا ہے کہ ان کا شعری اظہار کس قدر رفعتوں سے آشنا ہے۔

شاہدؔہ لطیف اپنے قاری کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ عصری آشوب کو دعائیہ تاثر کے ساتھ لے کر آئی ہیں تو کبھی اس موضوع کو رجائی امکانات سے مربوط کر دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ حکیم حاذق کا دیا ہوا کڑوا شربت مریض شکر کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ ان کی مثال ایک ایسے حکیم کی سی ہے جو کڑوے شربت کے ساتھ شکر بھی خود دیتا ہے تاکہ شکر ملا کر مریض بہ آسانی استعمال کر سکے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ بڑا سخنور وہی ہوتا ہے جو اپنے

قارئین کی نفسیات کا ادراک واحترام رکھتا ہواور انہیں زیادہ سے زیادہ سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کرے۔یہی اندازِ سخن شاہدؔہ لطیف کا بھی ہے۔

ان کی غزل کے تین اشعار شاملِ شذرہ ہیں جو آشوبِ عصر کی متنوع کیفیات خود میں سموئے ہوئے ہیں۔ یہ اشعار بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

جنہیں حاکم نے دستاریں عطا کیں
کہاں کاندھوں پہ ایسے سر رہے ہیں؟
کہانی پھر کوئی ترتیب دے لیں
ہمی ہیں جو بہت بے در رہے ہیں
انہوں نے بستیاں آباد کی تھیں
یہی ہیں لوگ جو اب مر رہے ہیں

(ص:34)

عصری آشوب کی مختلف صورتیں ان کی غزل کے مندرجہ ذیل تین اشعار میں ملاحظہ کریں جس سے یہ تعین بہ آسانی ہو جاتا ہے کہ ان کا شعری کینوس کس قدر آشوبِ عصر کی وسعتیں خود میں سموئے ہوئے ہے۔

اپنے ہی کاندھوں پہ لاش اپنی لیے پھرتے ہیں
وہ جو مشہور تھے کچھ لوگ صداقت کے لیے
اچھے لوگوں کا یہاں قحط پڑا ہے شاید
کوئی ملتا ہی نہیں آج امامت کے لیے
شاہدؔہ جن کو سکھایا تھا شرافت کا سبق
اب وہی لوگ نکل آئے عداوت کے لیے

(ص:39)

ایک اور غزل کا شعر دیکھیے جس میں عناصرِ اربعہ کے حوالے سے آشوبِ عصر کی نمائندگی کی گئی ہے۔ یہ شعر بحرِ وافر کے مربع وزن میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہیں ۔ یہ بحر عہدِ امیر خسرو میں عاشق صادق نامی ایک ماہرِ عروض نے ایجاد کی تھی جو رسالہ ''جامع الصنائع'' میں مذکور ہے۔ مربع وزن میں ایسے عمدہ اشعار نکالنا شاہدہ لطیف کی فکری و فنی بالیدگی کی بین دلیل ہے۔

آگ ہوا اور پانی مٹی
دنیا میں ہنگام بہت ہے

شاہدہ لطیف کے شعری کینوس میں اس موضوع کے حوالے سے فزوں تر اشعار پائے جاتے ہیں ۔اسی نسبت سے ان کی غزل کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں جو بحر رمل مثمن محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

گھر سے نکلوں گی تو کوئی حادثہ ہو جائے گا
جانیے کس موڑ پر کوئی واقعہ ہو جائے گا
خواب کے اندر کوئی لپٹا ہوا سا خوف ہے
ڈر گئی تو بے سبب اک سلسلہ ہو جائے گا

(ص:70)

ان کے ہاں بسا اوقات آشوبِ ذات آشوبِ کائنات سے ہم آغوش ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ایک غزل بدونِ تبصرہ عصری آشوب کے تناظر میں دیکھیے جس کا تجزیہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ غزل ھذا بحر ہزج مربع سالم میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

انائیں بیچ دیتے ہیں
وفائیں بیچ دیتے ہیں
جو بارش پر بھی ہیں قابض

گھٹائیں بیچ دیتے ہیں
نرالے ہیں یہاں منصف
سزائیں بیچ دیتے ہیں
وظیفے چھین کر اکثر
دعائیں بیچ دیتے ہیں
یہ کچھ معصوم چہروں کی
ردائیں بیچ دیتے ہیں

(ص:71)

شاہدؔہ لطیف کی ایک اور غزل کے ایک شعر میں آشوبِ عصر کے مستقل ہونے کی بات کی گئی ہے۔ کیونکہ کارِ شیطاں تو رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ طاغوتی طاقتیں تا قیامت سرگرمِ عمل رہیں گی۔ خیر اور شر کا معرکہ ازل تا ابد رہے گا۔ صرف کردار تبدیل ہوتے رہیں گے۔ یہ شعر بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے۔

ستم کے تیر پھینکے گا زمانہ رہتی دنیا تک
نشانہ ہم نہیں ہوں گے تو کوئی دوسرا ہو گا

(ص:76)

شاہدؔہ لطیف کی شعریات کے تجزیاتی و تحقیقی مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان کے ہاں آشوبِ عصر کے حوالے سے فزوں تر شواہد پائے جاتے ہیں جن میں جذبات و احساسات کی شدت بھی ہے اور زورِ بیان کے تقاضے بھی بہ حسن و خوبی پورے کیے گئے ہیں۔ وہ بیان کی جملہ نزاکتوں سے آشنا ہیں۔ مذکورہ بالا استشہادات و تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے عہد سے اثرات قبول کیے ہیں بلکہ اپنے عہد پر اپنے اثرات بھی مرتب کیے ہیں جن کا اظہار ان کے اشعار میں ملتا ہے۔

شاہدہ لطیف کا رجائیت آمیز سخن

زندگی طرح طرح کے مصائب و آلام سے عبارت ہے۔ فزوں تر انسانی ارتقا کے باوجود مسائل کی گمبھیرتا میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ اور زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ ہر انسان غم و الم سے ایک جیسا تاثر نہیں لیتا۔ کچھ لوگ پریشان و ملول ہو کر بیم و یاس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یعنی حیات کی کٹھنائیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور شکست قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے افرد ہمیشہ ناکام و نامراد رہتے ہیں۔ ان کے برعکس کچھ لوگ مشکلات کے باوجود امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اپنے عزم و حوصلے کو جوان رکھتے ہیں۔ مسلسل جد و جہد پر کاربند رہتے ہیں اور اس عالمگیر حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا امید پر قائم ہے۔ اس طرح کا طرزِ حیات رکھنے والے ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے ہیں۔ دنیا میں دو مکتبِ فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو ہر معاملے کا روشن پہلو دیکھتے ہیں اور پر امید رہتے ہیں۔ انہیں رجائیت پسند کہا جاتا ہے۔ دنیا میں اکثریت اسی مکتبِ فکر کی ہے۔ لفظ ''رجا'' عربی اسم مونث ہے جو امید، آس، آسرا اور آرزو کے مفاہیم سے عبارت ہے۔ دوسرا مکتبِ فکر ایسے انسانی طبقے پر مشتمل ہے جو ہر معاملے کا تاریک پہلو دیکھتا ہے۔ اس لیے محوِ یاس ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ قنوطیت پسند یا قنوطی کہلاتے ہیں۔ لفظ ''قنوط'' بھی عربی اسم مونث ہے جو ناامیدی اور مایوسی کا مفہوم رکھتا ہے۔ قنوطیت پسند لوگ ہمیشہ زندگی میں ہزیمت سے دوچار ہوتے ہیں۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے رجائیت آمیز سخن کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ پیش کر رہے ہیں۔ اسی نسبت سے ہم ان کے اولین شعری مجموعہ ''معجزہ'' کی منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ

مذکورہ موضوع کے پس منظر میں زیرِ تجزیہ لائیں گے۔ ہمارے اس شذرے میں اگرچہ موضوع کو بالا دستی حاصل ہوگی لیکن دیگر فکری وفنی تناظرات بھی زیرِ بحث آئیں گے۔کلی انتقافی تاثر کو اجاگر کرنے کی سعیِ مندوب کی جائے گی۔

شاہدہ لطیف کے فکری کینوس میں موضوعات کا ایک بحرِ تلاطم خیز موجود ہے۔اسی طرح ان کے ہاں متنوع رجائی کیفیات بھی ملتی ہیں جن کی بدولت یکسانیت کی فضا پیدا نہیں ہوتی اور قاری ہر نوع کی بیزاری سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔وہ خدا کی ذات پر پختہ یقین رکھتی ہیں اور نا امیدی کا شکار نہیں ہوتیں۔آس کی شمعیں ہمیشہ فروزاں رکھتی ہیں۔وہ اپنے عزم وحوصلے کو ہمیشہ بلند رکھتی ہیں اور جادۂ منزل پر مستقل مزاجی سے رواں دواں رہتی ہیں۔یوں ان کے ارتقا کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔ان کا رجائی احساس کہیں کہیں جمالیاتی احساس سے مربوط نظر آتا ہے۔اسی پس منظر میں ان کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جو بحرِ خفیف مسدس مخبون محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہے۔یہ ایک مرکب بحر ہے۔

حوصلے ہوں بلند راہوں میں
منزلوں کے نشاں بھی ملتے ہیں
گل سے الفت ہو سانس کا حصہ
خوشبوؤں کے جہاں بھی ملتے ہیں

(ص:27)

انسان کے عزم وحوصلے کا اس وقت صحیح معنوں میں امتحان ہوتا ہے جب وہ چاروں طرف سے طوفان میں گھرا ہوا ہو۔پھر اس کے پاس دو ہی راستے ہوتے ہیں۔یا تو وہ طوفان میں غرقاب ہونے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرلے یا پھر سوچ کے دیے کو اپنی جگہ روشن رکھے۔یعنی سعیِ پیہم کے ذریعے رجا کی شمعوں کو فروزاں رکھے۔اسی نسبت سے شاہدہ لطیف کا ایک شعر دیکھیے جو بحر ہزج مثمن محذوف میں کہا گیا ہے۔جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

مرے چاروں طرف طوفان ہیں کتنے زیادہ؟
مگر یہ سوچ کا روشن دیا اپنی جگہ ہے

(ص:35)

اگر رجائیت پسندی کا مطالعہ فلسفیانہ اور نفسیاتی وحسیاتی سطحوں پر کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں حوصلہ افزا اور مثبت امکانات کو حدِ نگاہ میں رکھنا ہے لیکن اس عمل کے پہلو بہ پہلو مستقل جدوجہد بھی ناگزیر ہے۔جس کے بغیر امیدوں اور توقعات کا پورا ہونا محالات میں سے ہے۔اسی نوع کا آدرش شاہدہ لطیف کے اس شعر سے بھی ملتا ہے۔

آنکھوں میں ستارے رکھتے ہیں
دن رات نکھارے رکھتے ہیں

(ص:50)

شاہدہ لطیف کے نزدیک مسلسل امید سے مربوط رہنے کا نام زندگی ہے۔بقول اقبال:

؎ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اس لیے وہ تواتر سے امکانات کے ابواب وا کرتی چلی جاتی ہیں اور مزید امکانات کی بازیافت میں بھی مصروف ومنہمک رہتی ہیں۔یہی ان کا فلسفہء حیات ہے۔اس لیے ان کے سخن میں عمل اور امید پہلو بہ پہلو چلتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔یہی امر ان کی متقضیاتِ حیات کا حصہ ہے جسے وہ مبادیات واساسیاتِ زیست گردانتی ہیں۔اس لیے وہ مختلف اظہاری لوازمات بروئے کار لاتی ہیں جس سے ان کی لسانی وفکری جدت کا اندازہ بطریقِ احسن لگایا جاسکتا ہے۔اسی حوالے سے ان کا ایک شعر دیکھیے۔

ہر اک کھڑکی نہ بند کرنا
رستے تازہ ہوا کے رکھنا

(ص:72)

اسی فکری تسلسل کے حامل ان کی غزل کا مطلع ومقطع ہیں جو بحر سریع مخبون مکسوف میں ہیں

جن کا عروضی وزن ''مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن'' ہے جو ایک مرکب بحر ہے۔

منزل کی جستجو میں سو اعتبار ہوں گے
تم کارواں سے پوچھو رستے ہزار ہوں گے
درسِ حیات ہم کو یہ شاہدؔہ ملا ہے
عزم و یقین ہو گا تو کامگار ہوں گے

(ص:91)

شاہدؔہ لطیف کی ایک مسلسل غزل جو رجائی امکانات کی حامل ہے، جس کی ردیف ''ابھی تک زندہ ہے'' رجا کا ایک بھرپور حوالہ ہے، نذرِ قارئین ہے جو بحرِ وافر مسدس محذوف میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولن'' ہیں۔

دل میں اک ارمان ابھی تک زندہ ہے
تجھ سے وہ پیمان ابھی تک زندہ ہے
قائم دائم ہے یہ دنیا آج تلک
چاہت سے انسان ابھی تک زندہ ہے
میری سوچ خیالوں میں ہے وہ اب تک
یادوں کا طوفان ابھی تک زندہ ہے
اپنا اپنا سا لگتا ہے جانے کیوں
وہ جو تھا انجان ابھی تک زندہ ہے
جانے کیسا گیت فضا میں گونجا تھا
اس کی لے اور تان ابھی تک زندہ ہے

(ص:103)

ان کی ایک اور غزل جس کی ردیف ''رفتہ رفتہ'' نے ایک دھیمے رجائی تاثر کو اجاگر کیا ہے، یہ دھیما پن معقولیت ومعروضیت، منطقیت واستدلالیت، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور وضع داری کی دلیل

ہے۔ یہ غزل بحر سریع مثمن مخبون مکسوف میں کہی گئی ہے۔

خوابوں کو مل رہی تھی تعبیر رفتہ رفتہ
کھلنے لگی سمے کی زنجیر رفتہ رفتہ
راہِ سفر میں ہر سو منظر بچھے ہوئے تھے
بنتی رہی نگہ میں تصویر رفتہ رفتہ
مٹی بھی آسمان کے منظر گم رہی تھی
اور خاک پر فلک کی تاثیر رفتہ رفتہ
گو داستاں سناتا رہتا ہے وقت ہم کو
بنتی ہے ذہن میں اک تحریر رفتہ رفتہ
اے وقت تیرے ہاتھوں میں ہے نظام سارا
ہر ذہن کی ہے تجھ سے تعمیر رفتہ رفتہ
مٹنے کو دیر کوئی لگتی نہیں جہاں میں
بنتی ہے شاہدہ پر توقیر رفتہ رفتہ

(ص:109)

غزل ہذا کا نفسیاتی و حسیاتی اور فلسفیانہ گراف بلندیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوا ہے جس میں گہرائی و گیرائی کے تلازمات روبہ کار ہیں اور فکر کا جدید پیرائیہ اظہار ہے۔شاہدہ لطیف نادر الاستعمال قوافی اور ردیفوں کو برتنے کا ہنر جانتی ہیں۔ یہ ان کی فنی چابکدستی کی عمدہ دلیل ہے۔

ان کے ہاں بسا اوقات رجائی احساس کے پہلو بہ پہلو جمالیاتی احساس بھی پورے طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے اور کہیں حیرت و استعجاب کی فضا پائی جاتی ہے۔یہی ان کی شاعری کا معجزہ بھی ہے کلائمکس بھی ہے جسے آپ کرشمہ کاری اور نادرہ کاری سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ان کی غزل کا مقطع ہدیہ ءقارئین ہے۔

فضا میں شاہدہ خوشبو رچی ہے

یہ کس نے معجزہ سا کر دیا ہے

(ص:110)

شاہدہ لطیف کے ہاں رجائی حوالے سے ایک وسعت کا پہلو کارفرما ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کی نسبت سے ایک تنوع وتلون کی صورت حال پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کی ان کے سخن سے دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ وہ ایک قناعت پسند انسان ہیں اور صبر وشکر کرنا ان کا وظیفہء حیات ہے۔ ان کا ایک شعر لائقِ التفات ہے جو بحرِ اوفر مربع محذوف میں کہا گیا ہے۔

اللہ کا انعام بہت ہے
دیس کی مٹی سونا ہے

(ص:114)

شاہدہ لطیف کی رجائیت میں معقولیت ومعروضیت اور منطقیت واستدلالیت کارفرما ہے۔ ان کا بیانیہ باوثوق اعتبار کا حامل ہے۔ وہ باوثوق اعتبار کیا ہے؟ وہ خدائے بزرگ وبرتر کی ذات پر یقین ہے کیونکہ وہ ارشادِ خداوندی ''لاتقنطوا من رحمۃ اللہ'' پر عمل پیرا ہیں۔ توکل باللہ ان کے بیانیے کی روح ہے۔ اس لیے ان کی امید کی شمعیں ہمیشہ فروزاں رہتی ہیں۔

یہ کہہ کے دی ہے در وبام کو تسلی بھی
نئی سحر کا اجالا اُترنے والا ہے
زمانہ بدلے گا اک انقلاب آئے گا
ہمارا جذبِ دروں کام کرنے والا ہے

(ص:122)

کہیں کہیں ان کے رجائی جذبے مزاحمتی رویوں سے ہم آغوش ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ امر ان کی رجائیت کی مقتضیات میں شامل ہے اور ان کی ترقی پسند فکر کی غمازی بھی ہے۔ وہ مزید امکانات کی بازیافت کے عمل میں کوشاں رہتی ہیں۔ وہ مسدود راستوں کی بجائے متبادل جادۂ منزل پر گامزن رہتی ہیں۔ اس میں ہی ان کے ارتقا کا راز مضمر ہے۔ ان کی غزل کے دو

اشعار قابلِ ذکر ہیں جو بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہیں۔

کھلی تو ہے کھڑکی صدا پر ہماری
یہ ممکن ہے در بھی کوئی باز کر لیں
فضاؤں میں جو آج پابندیاں ہیں
جہانِ تخیل میں پرواز کر لیں

(ص:129)

شاہدہ لطیف کی رجائیت کچھ معجزانہ فکری عوامل بھی رکھتی ہے جسے ان کی فکری نادرہ کاری اور تخلیقی کرشمہ کاری سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ وہ تمام امکانات کو حیطہء ادراک میں رکھتی ہیں۔ وہ اپنے اظہاری بیانیے میں مظاہرِ فطرت کا استخدام بھی انتہائی عمدگی سے کرتی ہیں۔ یہ سبب ہے کہ ان کا سخن فطری رچاؤ سے مملو نظر آتا ہے۔

بادل کسی بھٹکی ہوئی امید کا اک دن
بارش سے در و بام کو دھو جائے گا ایسا
چمکے گا مرے شہر کا جھلسا ہوا چہرہ
امید ہے اک روز تو ہو جائے گا ایسا
سوکھے گا نہ مرجھائے گا اس دورِ خزاں میں
مالا میں کوئی پھول پرو جائے گا

(ص:147)

وہ زندگی سے پیار کرتی ہیں۔ مصائبِ حیات کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہیں۔ زیست کے اس سفر میں قلب و خرد اس کے معاون ہیں۔ وہ شبِ تیرہ میں خوف زدہ نہیں ہوتیں بلکہ روشنی کا اہتمام کرتی ہیں اور اہلِ دنیا کو باور کراتی ہیں کہ زندگی ایسے کی جاتی ہے۔ بقول راقم:

اسی دور میں زندگی ہم نے کی ہے

کہ چرچے تھے جس میں بہت خودکشی کے

ان کا زندگی کرنے کا جنون تمام تر ظلمتوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور حیات کو بقعہء نور بنا دیتا ہے۔

شبِ سیاہ میں اس دل نے روشنی کر لی
زمانے دیکھ ہم نے بسر زندگی کر لی

(ص:149)

شاہدہ لطیف کے ہاں امید و رجا کے مختلف روپ نمایاں ہیں۔ کہیں کہیں ان کی رجائیت دعائیہ طرزِ فکر سے مربوط ہوتی ہے۔ رجا کا ایک انداز اللہ تعالیٰ سے خیر کی امید بھی ہے کیونکہ وہ ذاتِ واحد ہی صحیح امیدیں پوری کرنے والی ہے۔ ان کا ایک شعر دیکھیے جس میں رجائیت کے پہلو بہ پہلو ممتا کی محبت کو بھی واضح انداز میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ شعر بحر خفیف مسدس مخذوف مخبون میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہے۔

حادثے اپنا رخ بدل لیں گے
مائیں بچوں کو جب دعا دیں گی

مشمولہ تصریحات شاہد ہیں کہ شاہدہ لطیف وسیع تر رجائی کینوس کی حامل ہیں جس کی بدولت ان کے کلام کی قرات سے قاری کو عزم و حوصلے کی نوید ملتی ہے اور اس میں زندگی کرنے کی خو جاگتی ہے جس کے باعث ہر نوع کی بیزاری گریزاں نظر آتی ہے۔ پھر وہ اپنے آپ کو مسرتوں سے سرشار سمجھتا ہے۔

شاہدہ لطیف کی حب الوطنی

جذبات واحساسات کی دنیا میں وطن کی محبت کے جذبے کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو ہر کہ ومہ کو میسر نہیں آتا بلکہ یہ مشیت ایزدی سے ودیعت ہوتا ہے اور یہ کسی بھی شخص کی فرخندہ نصیبی سے عبارت ہے۔ اس احساس میں وہ کیف وسرور اور خوشی وسرمستی شامل ہے جو قابلِ بیان نہیں ہے۔ مذہب وملت کی محبت کے علاوہ تمام تر محبتیں اس کے سامنے ہیچ وحقیر ہیں۔ اسی احساس کی بدولت شخصیت کی نمو ہوتی ہے۔ کردار سازی کے زینے طے ہوتے ہیں اور اعلیٰ وارفع مدارج تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔ گویا جسے وطن کی محبت عطا ہوگئی، اس کو خیرِ کثیر سے نواز دیا گیا۔

شاہدہ لطیف ایک محبِ وطن شاعرہ ہیں۔ دیش بھگتی ان کی سرشت میں شامل ہے۔ یعنی ان کے ضمیر کا حصہ ہے۔ وہ وطن کی محبت کو سرمایہء نازش وافتخار قرار دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک خوبصورت واقعہ یاد آرہا ہے جسے ہم رقم کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جب 2013ء میں شاہدہ لطیف کو حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان کی طرف سے ان کے اعلیٰ ادبی وصحافتی کام کے باعث صدارتی اعزاز برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا، بعدازاں ایک بزرگ اور سینئر شاعر نے جب شاہدہ لطیف کے سامنے نکتہء اعتراض اٹھایا تو اس وقت شاہدہ لطیف نے کیا خوب اور برجستہ جواب دیا، ''صاحب! آپ نے اپنی مجازی محبت کے فسانے لکھے ہیں، جبکہ میں نے اپنے وطن کے ترانے لکھے ہیں۔'' یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنے وطن سے محبت کرنے والوں کو مشیت قدر ومنزلت سے نوازتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاہدہ لطیف کا مقام ومرتبہ اپنے وطن سے محبت کا ثمر ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے دوسرے شعری مجموعے ''میں پاکستانی ہوں'' مطبوعہ

14 اگست 2000ء کا تجزیاتہ مطالعہ حب الوطنی کے تناظر میں پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کی منتخب غزلیات ونظمیات اور ان کے اشعار واقتباساتِ منتخبہ برائے استشہادات واستخراجات لائیں گے۔ انتقادی حوالے سے ایک اجتماعی تاثر کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔ ''میں پاکستانی ہوں'' ان کا ایک ایسا مجموعہءشعر ہے جس کی بدولت انہیں علمی وادبی اور سماجی حلقوں میں بے پناہ مقبولیت و پذیرائی میسر آئی۔ اس کی پسندیدگی کا یہ عالم ہے کہ دنیا کے متعدد ممالک میں اس کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی اور شاہدہ لطیف کو فزوں تر عزت ووقار سے نوازا گیا۔

شاہدہ لطیف ملک وقوم کے مستقبل کو اپنا مستقبل سمجھتی ہیں۔ وہ وطن سے اظہارِ الفت کے لیے فزوں تر مظاہرِ فطرت کا استخدام کرتی ہیں جس کے باعث ان کا سخن فطری رچاؤ کا حامل ہو جاتا ہے۔ مزید برآں وطن سے اظہارِ محبت کے لیے ان کے ہاں وسیع تر جمالیاتی احساس بھی پایا جاتا ہے جس میں گلشن، گلاب، پھول اور خوشبو کے تلازمات برتے گئے ہیں۔ اسی نسبت سے ان کے ملی نغمے کے دو بند ملاحظہ ہوں جو گیت کی ہیئت میں ہیں اور بحرِ وافر کے مربع محذوف وزن میں کہے گئے ہیں۔

تو منزل اجلے خوابوں کی
تو دھرتی شوخ گلابوں کی
ہر پھول ترا شیدائی ہے
ہر خوشبو کا ارمان ہے تو
خود گلشن اور پہچان ہے تو
مرا اپنا پاکستان ہے تو

تو خواب درخشاں نسلوں کا
تو نور چمکتی آنکھوں کا
ہے تجھ پر ناز صداقت کو
سچائی کی میزان ہے تو

ہر راحت کا سامان ہے تو
مرا اپنا پاکستان ہے تو

(ص:28)

وہ نہ صرف وطن سے محبت کرتی ہیں بلکہ اپنے اردگرد بھی وطن سے محبت کرنے والوں کو مشاہدہ کرتی ہیں۔ وہ اپنے دیس کی محبت میں اس قدر گرفتار ہیں کہ اس کے پھولوں کے پہلو بہ پہلو کانٹوں کے حوالے سے بھی دعائیہ طرزِ فکر رکھتی ہیں۔ حقیقت میں وطن کی محبت بھی یہی ہے اور اس محبت کی معراج بھی یہی ہے۔

وطن کے نام پہ ہر دل تڑپ سا جاتا ہے
زباں پہ آتا ہے بے اختیار زندہ رہے
چمن کے حق میں دعائے تضاد ہے میری
کلی بھی زندہ رہے اور خار زندہ رہے

(ص:30)

شاہدہ لطیف کی نظم ''مرا وطن'' جو غزل کی ہیئت میں ہے، اس کے دو اشعار جو وطن سے محبت کے تناظر میں ہیں، قابلِ ذکر ہیں۔

پرچم یہ چاند تارے کا یہ سبز روشنی
دنیا میں اک نشانِ وفا ہے مرا وطن
دنیا میں یوں تو ہوں گے کئی ملک خوب تر
سب سے مگر الگ ہے جدا ہے مرا وطن

(ص:31)

وطن کی محبت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں قومی آشوب کے شواہد بھی ملتے ہیں جس میں وہ قومی مسائل اور مصائب و آلام کو زیرِ بحث لاتی ہیں جس کے لیے وہ دعائیہ طرزِ فکر اختیار کرتی ہیں۔ یوں یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ شاہدہ لطیف کی دعائیں صرف اپنی ذات کے لیے نہیں ہیں بلکہ

وطن اور اہلِ وطن کے لیے بھی ہیں۔

مرے چمن کو ہے درکار روشنی یا رب
سیاہ تر ہے بہت لالہ زار، کوئی چراغ

شاہدہ لطیف کے سخن میں وطن سے محبت کے مختلف قرائن جلوہ گر ہیں۔ وہ ہر ایسا قرینہ اختیار کرتی ہیں جو وطن کی محبت کے حوالے سے خوبصورت بھی ہو اور محبوب ترین بھی ہو۔ وطن کی خاک کو سر پر سجانا اور اپنے آنچل کو پرچم بنانا وطن سے اظہارِ محبت کے خوبصورت اور محبوب ترین سلیقوں میں سے ہیں۔ گویا وہ وطن سے محبت کرنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ گویا وطن سے محبت بھی ایک آرٹ ہے جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ وطن سے محبت کے ان کے ہاں انقلابی رویے بھی پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے کچھ رموز و علائم کا استخدام بھی کیا ہے۔ ان تلازمات میں نئے سویرے، سرحد، سرخ آنکھ اور سپنے وغیرہ شامل ہیں۔ صوتی حوالوں سے حرف ''س'' کا اعادہ سفید رنگ کی علامت ہے جو امن کی ترجمانی کرتا ہے۔ گویا ان کا تصورِ انقلاب پر امن کیفیات کا حامل ہے مگر اس میں سعیِ پیہم، ان تھک محنت اور قربانی کے جذبے جیسے لوازمات بھی شامل ہیں۔ ان حوالوں سے ان کے یہ دو اشعار سپردِ قرطاس ہیں۔

وطن کی خاک کو سر پر سجا کے نکلی ہوں
میں آنچل اپنا ہی پرچم بنا کے نکلی ہوں
نئے سویرے مرے منتظر ہیں سرحد پر
میں سرخ آنکھوں میں سپنے سجا کے نکلی ہوں

(ص:33)

وطن کی محبت کے حوالے سے ان کے ہاں ایک خوبصورت پہلو یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ان کے ہاں وطن اور مظاہرِ فطرت کے ایک موازنے یا تقابلی مطالعہ کی فضا پائی جاتی ہے۔ اس مسابقت میں وطن کو مظاہرِ فطرت پر سبقت حاصل ہے۔ گویا ان کے نزدیک وطن ایک اعلیٰ ترین مظہرِ فطرت ہے۔ یہ شاہدہ لطیف کا وطن سے محبت کا ایک عمدہ ترین جمالیاتی معیار ہے۔ یہی سبب

ہے کہ وہ اپنے دیس کو اپنے خواب سے بھی بڑھ کر قرار دیتی ہیں۔ان کے نزدیک وطن کی خاک کے مقابلے میں مہتاب بھی کم تر ہے۔ان کا وطن کی محبت کے حوالے سے ایک مثالی نظریہ ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ان کے ہاں وطن کی محبت اپنی انتہا کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔

جو ہم نے دیکھا تھا اس خواب سے بھی بڑھ کر ہے
وطن کی خاک تو مہتاب سے بھی بڑھ کر ہے

(ص:38)

شاہدہ لطیف کے ہاں وطن کی محبت کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں ہے۔وہ ہر پہلو کے حوالے سے بڑے فلسفیانہ اور نفسیاتی وحسیاتی انداز میں پیش رفت کر جاتی ہیں۔اس لیے وہ دفاعِ وطن کے قومی فریضے سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ان کی نظم ''قومی دفاع'' کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے پر یہ تعین قدرے دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ ایک محبِ وطن شاعرہ کا وطن سے اظہارِ محبت ہے یا یہ کسی سپہ سالار کا اپنے عساکر سے دفاعِ وطن کے حوالے سے خطاب ہے۔ان کی یہ نظم غزل کی ہیئت اور بحر ہزج مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

دفاعِ ملک و ملت کے لیے دیوار بن جائیں
مرے بازو فقط بازو نہ ہوں تلوار بن جائیں
عدو کے سامنے تصویر بن جائیں اخوت کی
جو ہو ناقابلِ تسخیر وہ کہسار بن جائیں
بہ ضد ہو جنگ پر دشمن تو اس کو ہوش آ جائے
اگر وہ صلح کو آئے سراپا پیار بن جائیں
شہیدانِ وفا کا خون ہے اس خاک میں شامل
شجاعت کی اسی مٹی سے لالہ زار بن جائیں
چمکتے ہیں جو تاروں کی طرح آفاقِ ملت پر

یہی سب امنِ عالم کے لیے معیار بن جائیں

(ص:39)

شاہدہ لطیف کی وطن سے محبت بے پایاں ہے۔ وطن اس کا ایک ایسا محبوب ہے جس پر دنیا بھر کے مجازی محبوب بھی قربان کر دیے جائیں تو پھر بھی معاملہ وطن جیسے محبوب کے شایانِ شان نہیں ہوگا۔ ان کی غزلیات و نظمیات اور نغمات میں کچھ ایسے علامتی تاریخی حقائق بھی ہیں جو نا قابلِ فراموش ہیں۔ جو ملکی تاریخ میں قومی آشوب کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لیے وطن کے حوالے سے ان کا دعائیہ فکری کینوس بسیط و عریض ہے جو وطن سے ان کی محبت کو ایک مثالی محبت ثابت کرتا ہے۔ اسی نسبت سے ان کی نظم ''مرا خواب چودہ اگست ہے'' کے آخری دو بند زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ نظم ھذا گیت کی ہیئت میں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ہاں مختلف ہیئتی تجارب کامیابی کے پیرائے میں ملتے ہیں۔ یہ بحر رجز مربع سالم میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''مستفعلن مستفعلن'' ہے۔

مرے دلربا اے مرے وطن
تجھے کس نے زخم دیا نہیں؟
تجھے دشمنوں سے ہے کیا گلہ؟
ترے دوستوں میں وفا نہیں

یہ عجیب وقت کی جست ہے
مرا خواب چودہ اگست ہے

تجھے باقی رہنا ہے تا ابد
تو عطائے ربِ غفور ہے
تو ہی ہر دعا میں ہے اولیں
مری بندگی کا شعور ہے

ترا نام ہی مرا بخت ہے

مرا خواب چودہ اگست ہے

(ص:40)

شاہدہ لطیف اپنے ملک پاکستان اور خود پاکستانی ہونے پر فاخر و نازاں ہیں۔ یہ بھی ان کا وطن سے محبت کا ایک انداز ہے۔ وہ وطن کی خاک سے جنوں کی حد تک محبت کرتی ہیں۔ ان کی زندگی "رحمٰا بینھم اشدا الکفار" کی عملی تفسیر ہے۔ انہوں نے قرآنی ماخذات مراجع سے بھرپور اکتسابِ فیض کیا ہے۔ وہ خود کو بحرِ جذبات کی شناور اور امواج کی روانی گردانتی ہیں۔ کیونکہ پاکستانی ان اوصاف سے متصف ہوتا ہے اور وہ پاکستانی ہیں۔ ان کی نظم ''میں پاکستانی ہوں'' جو گیت کی ہیئت میں ہے، کے دو بند ملاحظہ ہوں جن میں شدتِ احساس اور زورِ بیان زوروں پر ہے۔

توحید کا نعرہ ہوں امید کا پرچم ہوں
اپنی مری دھرتی ہے، اپنا مرا موسم ہے
اس خاک پہ میں قربان، اس کی ہی دیوانی ہوں
میں پاکستانی ہوں
میں پاکستانی ہوں
دشمن کے لیے شعلہ، اپنوں کے لیے شبنم
باطل کے لیے بجلی اور حق کے لیے سرخم
جذبوں کا سمندر ہوں موجوں کی روانی ہوں
میں پاکستانی ہوں
میں پاکستانی ہوں

(ص:41)

ان کی ایک اور غزل سپردِ قرطاس ہے جس میں قومی پرچم سے دلی وابستگی کا اظہار ہے اور اپنے لباس کو اس کا ہم رنگ قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں اپنے وطن کی خارجہ پالیسی کو بھی

بیان کیا گیا ہے جو دوستوں سے دوستی اور دشمنوں سے دشمنی کے اصول پر مبنی ہے۔ تیسرے شعر میں دہشت گردی کے امکانات کے معدوم ہونے کا ذکر ہے۔ چوتھے شعر میں وطن کے حوالے سے نشاطِ عشق کا تذکرہ ہے۔ پانچویں شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ دشمنانِ وطن سے کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ چھٹے شعر میں سبز ہلالی پرچم کی سفیدی کو اقلیتوں کی نمائندگی ظاہر کیا گیا ہے۔ آخری شعر میں ایک جمالیاتی اور طربیہ ورزمیہ تاثر پایا جاتا ہے۔

میرے پرچم، مرا دل ترے سنگ ہے
اوڑھنی بھی مری، تیری ہم رنگ ہے
دوست ملکوں کے سب سے بڑے دوست ہیں
دشمنوں سے تو اپنی کھلی جنگ ہے
فتنہ پرور نہیں رہ سکے گا کوئی
یہ زمیں ہر عدو کے لیے تنگ ہے
عشق مٹی کا ایسا نشہ ، جس طرح
پوست کا آخری مرحلہ بھنگ ہے
ہاتھ عدو سے ملاؤں میں کیوں
ظرف اعلیٰ نہیں اور دل تنگ ہے
آنکھ کی یہ سفیدی، کہ ہے اقلیت
سبز پرچم مری سوچ کا رنگ ہے
اس چمن، اس وطن میں بفضلِ خدا
رقص طاؤس ہے نغمہء جنگ ہے

(ص:43)

ان کی ایک نظم بعنوان ''قومی گیت'' جو گیت کی ہیئت میں ہے، کے دو بند ملاحظہ کریں جن میں وطن کے حوالے سے وفورِ الفت کا پہلو نمایاں ہے۔ اس کا عروضی حوالہ بحر رجز مربع سالم ہے

جس کا وزن ''مستفعلن مستفعلن'' ہے۔

کوئی تجھ سے بڑھ کے حسیں نہیں
جو یہاں نہیں ہے وہ کہیں نہیں
تری خاک میری نجات ہے
اے وطن تو میری نجات ہے

O

بھلا کیا ہوں ترا ہی عکس ہوں
میں سراپا عکس کا رقص ہوں
ترے حسن کی شروعات ہے
اے وطن تو مری نجات ہے

(ص:46)

ان کی ایک اور نظم ''وطن مرا غرور ہے'' جو غزل کی ہیئت میں ہے، جسے عصرِ حاضر میں نظم کی مقبول ترین ہیئت قرار دیا گیا ہے، جو بحر ہزج مربع مقبوض میں کہی گئی ہے، جس کے عروضی ارکان ''مفاعلن مفاعلن'' ہیں۔

ہوا میں جیسے تازگی کا
ایک سا سرور ہے
فضا میں جیسے دور تک
اجالا اور نور ہے
چمن چمن ، کلی کلی
عجیب سا غرور ہے
مرے وطن کے دشمنو
تمہیں کہاں شعور ہے

مرے وطن کی خاک کا
یہ ایک نقشِ طور ہے
یہی مرا غرور ہے
یہی مرا غرور ہے

(ص:53)

شاہدہ لطیف کا وطن سے بے پناہ اظہارِ الفت ذرا اس مطلع میں دیکھیے کہ دیش بھگتی کا جنون اعماق و آفاق کے نئے ابواب وا کر رہا ہے۔

تو خاک ہے وطن کی سو نسبت تجھی سے ہے
میرا تمام عشق ، محبت تجھی سے ہے

(ص:57)

اپنے دیس سے محبت اور اپنے دیس پر ناز کرنا کسی بھی انسان کے محبت ہونے کی دلیل ہوا کرتی ہے۔اس کی خوش حالی و ترقی کا خواب مقصدِ حیات ہوا کرتا ہے۔ان کی غزل کے دو اشعار اسی تناظر میں ہیں جو بحر رجز مربع سالم میں کہے گئے ہیں جن کا وزن ''مستفعلن مستفعلن'' ہے۔

اک پھول حسین گلدان کی ہوں
میں بیٹی پاکستان کی ہوں
میرا ہر لمحہ اس کے لیے
میں طالب اس کی آن کی ہوں

(ص:62)

شاہدہ لطیف نہ صرف اپنے وطن سے محبت کرتی ہیں بلکہ اس سے نسبت رکھنے والی ہر چیز سے والہانہ پیار کرتی ہیں۔حقیقی حب الوطنی کی معراج بھی یہی ہے۔عشق و محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ جس سے عشق کیا جاتا ہے، اس کے متعلقات سے بھی عشق ہو جاتا ہے۔اس لیے وہ وطن اور اہلِ وطن دونوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ان کی نظم ''سمندر پار پاکستانی'' جو قطعہ بند نظمیہ

ہیئت میں ہے، میں سے ایک بند قابلِ توجہ ہے۔ ویسے بھی سمندر پار پاکستانیوں کے حوالے سے ان کی ناقابلِ بیاں خدمات ہیں۔ جس میں ان کے موقر جریدے ''اوورسیز انٹرنیشنل'' کی بائیس سالہ خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔

وطن کا مان وطن کا وقار ہیں اپنے
دیارِ غیر میں جا کر جو بس گئے وہ لوگ
یہی وہ لوگ ہیں رشتہ ہے جن کا لافانی
ہے اپنی پاک زمیں سے بندھا ہوا سنجوگ

(ص:65)

وہ ہرنوع کی کرپشن اور بدعنوانی کے خلاف ہیں۔ وہ وطنِ مالوف کو ہر طرح کے سماجی و معاشی عوارض سے مبرا و ماورا دیکھنا چاہتی ہیں اور ان مسائل کے مداوے کی خواہش مند ہیں۔ پاکستان کے دکھ درد پر ان کا دل کڑھتا ہے۔

جنہوں نے میرے ملک کی دولت لوٹی ہے
ایسے سیاست دانوں کا ہی رونا ہے
دھرتی ماں جو دیے ہیں تجھ کو دشمن نے
ان زخموں کو اشکوں ہی سے دھونا ہے

(ص:75)

اسی فکری تسلسل کا حامل ان کی ایک اور غزل کا مطلع قابلِ ذکر ہے۔

غمِ وطن سے اگر ہم نڈھال ہوتے ہیں
مزارِ قائد اعظم پہ جا کے روتے ہیں

(ص:85)

اس حوالے سے ان کے ہاں فزوں تر احساسات پائے جاتے ہیں۔

اے رہنماؤ ڈال گئے کس عذاب میں

قرضوں کے بھوت آ گئے نسلوں کے خواب میں

(ص:87)

شاہدہ لطیف کے ہاں اس حوالے سے تنقیدی و احتسابی رویے پائے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ادراکاتی کینوس بسیط و عریض ہے۔

لوٹا ہے اس وطن کو سمجھ کر پرایا مال
اب امن و آتشی کے طلب گار ہو گئے

(ص:88)

قومی آشوب کے حوالے سے ان کی نظم ''ماحول'' لائقِ التفات ہے جو مسدس کی ہیئت میں ہے۔ بحر ہزج مربع مقبوض میں کہی گئی ہے جس کا وزن ''مفاعلن مفاعلن'' ہے۔

نظر نظر سوال ہے
کہاں کہاں یہ جال ہے
شکار ہیں سجے ہوئے
کہ شاطرانہ چال ہے
اب آدمی کے بوجھ سے
زمین ہے تھکی ہوئی

قدم قدم پہ قہر ہے
غموں کی ایک لہر ہے
کٹے ہوئے ہوئے تن بدن
لہو لہو یہ شہر ہے
اب آدمی کے بوجھ سے
زمین ہے تھکی ہوئی

یہ بستیاں لٹی لٹی

نشانیاں مٹی مٹی
ہر آدمی ہے غم زدہ
ہیں سسکیاں گھٹی گھٹی

اب آدمی کے بوجھ سے
زمین ہے تھکی ہوئی

(ص:91)

شاہدہ لطیف کا حب الوطنی کے حوالے سے رجائی اندازِ فکر خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ مستقبل کے حوالے سے انتہائی پر امید نظر آتی ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ فردائی ادوار میں وطنِ عزیز میں خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ مشکلوں کے تمام طوفان تھم جائیں گے۔ ہر طرف ہریالی ہوگی اور سبز انقلاب آئے گا۔ اسی نسبت سے ان کی ایک غزل دیکھیے جو بحر ہزج مثمن سالم میں کہی گئی ہے۔

یقیناً مشکلوں کے یہ سبھی گرداب ٹھہریں گے
تلاطم سادھ لے گا دم ، چمن شاداب ٹھہریں گے
وباؤں کے یہ ریلے دھیرے دھیرے رلتے جائیں گے
معیشت اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے گی آخر
بہاریں دیکھنے والے سخی احباب ٹھہریں گے
یہ جتنی خشک جھیلیں ہیں چھلک اٹھیں گی پانی سے
کنول ہر رنگ کے ہر رخ سرِ تالاب ٹھہریں گے
خدا بارش کی بوچھاڑوں سے صحرا کو بھگو دے گا
سبھی تھرپارکر دنیا میں شہرِ آب ٹھہرے گا
اگر خالق نے چاہا زندگی پھر لوٹ آئے گی
حقیقت میں بدلنے والے اپنے خواب ٹھہریں گے

(ص:92)

شاہدہ لطیف وطنِ عزیز کی آلودگی کے حوالے سے بھی فکر مند ہیں۔ وہ ایک محبِ وطن دانشور کی طرح ہر حوالے سے سوچتی ہیں اور ناگزیر اقدامات کرنے کی خواہاں نظر آتی ہیں۔ آمدہ غزل میں وہ آلودگی کے حوالے سے اکثر و بیشتر تحفظات و تناظرات زیرِ بحث لائی ہیں۔ یہ غزل بحر متقارب مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔ یہ ایک مسلسل غزل ہے جسے عنوان دے کر نظم کی صورت بھی دی جاسکتی ہے۔

زمیں کو بچا لوں ہوا کو بچا لوں
میں آلودگی سے فضا کو بچا لوں
یہ پتھر کچلتی مشینیں اڑا دوں
پہاڑوں کی روتی صدا کو بچا لوں
سمندر، یہ دریا، یہ زہریلے پانی
میں نقصان کی انتہا کو بچا لوں
یہ پژمردہ چہرے، یہ بے خواب آنکھیں
میں ہاتھوں پہ رنگِ حنا کو بچا لوں
مجھے شاہدہ آسماں کا نہیں غم
میں اپنی زمیں کی بقا کو بچا لوں

(ص:95)

اس فکری تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی نظم ''ماحولیات'' زیبِ قرطاس ہے جو گیت کی ہیئت میں ہے اور بحر ہزج مربع مقبوض میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعلن مفاعلن'' ہیں۔

بجھے بجھے ہیں آئینے
عجیب سے ہیں واقعے
گلوں کا رنگ زرد ہے
شجر شجر میں درد ہے

فضاؤں میں غبار ہے
زمین بے قرار ہے
مری زمیں ترے لیے
یہ واقعے یہ حادثے
سمندروں کو فکر ہے
کثافتوں کا ذکر ہے
کہ لہر لہر نزار ہے
زمین بے قرار ہے
دھواں ہوا کو کھا گیا
عجیب وقت آ گیا
نفس نفس اساس ہے
نظر نظر اداس ہے
ہر آنکھ اشک بار ہے
زمین بے قرار ہے

(ص:96)

شاہدہ لطیف کے فکری وفنی کینوس کی سیر حاصل غواصی کے بعد یہ بینہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کے ہاں حب الوطنی کے تمام تر پہلو نمایاں انداز میں پائے جاتے ہیں۔وطن کے حوالے سے ان کا خلوص بے لوث ہے۔اصل میں وطن کی محبت ان کی فطرت میں شامل ہے۔وہ شعوری و لاشعوری اور قلبی و ذہنی ہر نسبت سے ایک محب الوطن پاکستانی ہیں۔جس کا ثبوت ان کا شعری مجموعہ ''میں پاکستانی ہوں'' ہے۔ربِ حرف وصوت سے استدعا ہے کہ ہر پاکستانی کو شاہدہ لطیف کی طرح وطن سے محبت کا جذبہ ودیعت فرمائے۔صرف اسی صورت میں ہی ایک فلاحی وترقی یافتہ ریاست کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔

’’برف کی شہزادی‘‘ ایک بھرپور عمرانی حوالہ

ادبیات کا مطالعہ عمرانی نکتہء نگاہ سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں ادب برائے زندگی کے نظریے کی بازگشت بھی موثر انداز میں سنائی دیتی ہے۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ادب کا عمرانی دبستان معرضِ وجود میں آیا اور عمرانی تنقید نے بھی ایک باضابطہ شعبے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ کسی بھی قاری، محقق اور نقاد کے لیے عمرانی پس منظر سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اگر ادب معاشرے، تہذیب وتمدن اور ثقافت کی نمائندگی نہیں کرتا تو پھر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کیا یہ ادب خلا میں تخلیق کیا گیا ہے؟ کوئی بھی فن پارہ ہو وہ خود میں عمرانی پہلو ضرور رکھتا ہے۔

دیگر اصنافِ ادب کی طرح ایک سفرنامہ چاہے وہ منثور ہو یا منظوم، عمرانی پہلوؤں سے غافل نہیں ہو سکتا۔ شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے چوتھے شعری مجموعہ ’’برف کی شہزادی‘‘ مطبوعہ جنوری 2004ء کے عمرانی امکانات کے حوالے سے اپنا تجزیاتی مطالعہ پیش کر رہے ہیں۔ مجموعہ ھذا کو پیرس کے ایک منظوم سفرنامے کی حیثیت حاصل ہے۔ منظوم سفرنامہ لکھنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس کی مقبولیت و پسندیدگی کا یہ عالم ہے کہ یہ دو بار زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اپنے انتقادی عمل کے لیے ہم کتابِ مذکور کے نصف اول کی منتخب منظومات یا منظومات کے منتخب حصوں کو عمرانی پسِ منظر میں زیرِ بحث لائیں گے۔ دیگر تنقیدی تناظرات بھی محلِ نظر ہوں گے۔

جب انسان دیارِ غیر کا عزمِ سفر کرتا ہے تو اس کے ذہن میں اجنبی معاشرت کے حوالے سے

عجیب و غریب سوال اٹھتے ہیں۔ایک تشویش ختم ہوتی ہے تو دوسری جنم لیتی ہے۔ ہمارے ملک و قوم کے حوالے سے وہ کیا سوچتے ہیں، جدید معاونات نے زندگی کے تمام تر شعبوں کو سہل تر کر دیا ہے۔کلاسیکی ذرائع نقل و حمل زیادہ وقت طلب ہوا کرتے تھے۔سفر کی سہولتیں وقت کا تقاضا کرتی تھیں جبکہ عصرِ حاضر میں ایسی برق رفتاری آ گئی ہے کہ آپ اگر ناشتہ اپنے ملک میں کرتے ہیں تو دن کا کھانا دوسرے ملک میں جا کر کھاتے ہیں۔ جبکہ رات کا کھانا کسی اور ملک میں ہوتا ہے۔ مختلف ممالک کے عمرانی پس منظر میں کچھ نہ کچھ مغائرت کے پہلو ضرور پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام عمرانی پہلو انسان کی وطن سے روانگی کے وقت ذہن میں مختلف سوالات پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ انہی عمرانی ادراکات کی جھلک ان کی آزاد نظم ''وطن سے روانگی'' میں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

ہوا کے دوش پہ اپنے وطن سے دور سفر
خیال و فکر کی شمعیں لرزتی جاتی ہیں
ابھرتی جاتی ہے تاریخ آسماں کی ردا
دیارِ پاک سے پیرس کی سمت جاتے ہوئے
کئی خیال مرے ذہن میں منور تھے
نجانے کیسی زمیں ہو گی، کیسے لوگ وہاں
ہمارے دیس کے بارے میں ان کی سوچوں کے
چراغ کیسے فروزاں ہیں ان کے ذہنوں میں
کئی خیال چمکتے تھے ذہن میں ہر دم
کہ جیسے کاہکشاں ہو سیاہ شب میں عیاں
ہوا کے دوش پہ اڑتے ہوئے خلاؤں میں
کئی چمکتے دمکتے ہوئے نگر دیکھے
سمندروں کی یہ وسعت، سکوت صحرا کا

گزرتے لمحوں کی خاموش چاپ گونجتی تھی
دماغ و دل پہ خیالات کے مناظر تھے
میں سوچتی تھی کہ جب صدیوں قبل انساں کو
ضروریاتِ سفر کے لیے کسی جانب
اٹھا کے زادِ سفر خود نکلنا پڑتا تھا
مویشیوں کے سہارے یا بیل گاڑی پر
کہیں کہیں انہیں پیدا بھی چلنا پڑتا تھا
تو یہ طویل سفر کس قدر کٹھن ہوگا
نجانے کتنے زمانوں کے بعد منزل پر
مسافرانِ طلب مضمحل پہنچتے تھے
بہت سے راہ کی دشواریوں میں مر کھپ کر
کسی چٹان، کسی نہر یا سرِ صحرا
حسین خواب لیے وادیٔ عدم کے مکیں
شکستہ ہڈیوں، بوسیدہ جسم کے انبار
نہ منزلوں کی زیارت انہیں نصیب ہوئی
نہ لوٹ کر وہ وطن اپنے جا سکے راہی
جدید دور نے سب فاصلے سمیٹ دیے
دیارِ پاک میں ہم پی رہے ہیں صبح کی چائے
کہ اپنا اگلا پڑاؤ اک اور ملک ہوا
پھر اس کے بعد ڈنر اور نئے نگر کی ہوا
کہ جس میں تازہ گلابوں کی ہے عجیب مہک
ہمارے دیس کے پھولوں سے مختلف خوشبو

(ص:19 تا 21)

مذکورہ آزاد نظم وسیع تر عمرانی ادراکات رکھتی ہے۔جس میں ان خیالات کا اظہار بھی ہے جو دیارِ غیر کا عزمِ سفر باندھتے ہوئے انسان کے قلب وخرد میں سرگوشیاں کرر ہے ہوتے ہیں۔علاوہ ازیں کلاسیکی اندازِ سفر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ پرانے لوگوں کو کسی ملک کا سفر اختیار کرتے ہوئے کن کن مسائل کا سامنا ہوتا تھا اور کیا کیا صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔پھر دورِ جدید کے جدید سفری معاونات کے حوالے سے بات کی گئی ہے کہ کس طرح نئی ایجادات نے سفر کو سہل تر کر دیا ہے۔گویا نظم ھذا میں سفر نامہ کی مبادیات کے حوالے سے ایجاز واختصار کے انداز میں بات کی گئی ہے۔

ان کی آمدہ نظم ''مہمان کی عزت'' جو قطعہ بند ہیئت میں ہے،اس میں اہلِ پیرس کی مہمان نوازی کو بیان کیا گیا ہے اور ان کے خلوص کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس میں پیرس کے ائر پورٹ کا منظر پیش کیا گیا ہے۔وہاں سامان اٹھانے والے قلی کا کوئی تصور نہیں ہے۔وہ لوگ اپنا سامان خود اٹھاتے ہیں۔

جاتے ہی ائر پورٹ پہ پیرس کے یہ کھلا
حیرت ہوئی کہ کوئی بھی ''لوڈر'' یہاں نہ تھا
رختِ سفر کو خود ہی اٹھاتے تھے لوگ باگ
خدمت گزار کوئی بھی ورکر یہاں نہ تھا

○

میں دنگ رہ گئی کہ اچانک خلوص سے
اہلِ فرانس نے مرا ساماں اٹھا لیا
اس طرز اس سلوک نے اہلِ فرانس کے
ممنون مجھ کو ایک ہی پل میں بنا لیا

○

یورپ میں رسم یہ ہے بلا امتیاز لوگ
سامان اپنا خود ہی اٹھاتے ہیں شوق سے
قلیوں کے منتظر نہیں رہتے، یہ اپنا بوجھ
خود گاڑیوں میں لوڈ کراتے ہیں شوق سے

O

قومیں عروج پاتی ہیں دنیا میں چاہ سے
خود اپنا بوجھ آپ اٹھانے کی راہ سے

(ص: 22-23)

شاہدہ لطیف کی نظم ''تحفہء محبت''، جو غزل کی ہیئت میں ہے، اور بحر ہزج مثمن سالم میں ہے، دراصل یہ ان کا اہلِ پیرس سے خطاب ہے جس میں داخلی احساسات کی صداقت بھی ہے اور خارجی امکانات کی کارفرمائی بھی ہے۔ مزید برآں عمرانی ادراکات کی واضح جھلک بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کا یہ خطاب ان کی ہی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

تمہارے شہر میں ہم اپنی چاہت لائے ہیں لوگو
خدا شاہد ہے جذبوں کی صداقت لائے ہیں لوگو
جہاں ہر بام سے پھوٹتی ہیں بہار کی کرنیں
وہاں ہم دل کے سورج کی تمازت لائے ہیں لوگو
سنا ہے ذرہ ذرہ بولتا ہے خاکِ پیرس کا
ہم اپنے دیس سے شوقِ سماعت لائے ہیں لوگو
ہمیشہ نغمہ گر رہتے ہیں امن و آشتی کے ہم
اسی مقصد سے آئینِ محبت لائے ہیں لوگو
بہل سکتے ہیں دل دنیا میں کاغذ کے گلابوں سے
مگر ہم پیار کی کلیوں کی دولت لائے ہیں لوگو

(ص:24)

شاہدہ لطیف کی نظم ''تقریب سے خطاب'' کا پہلا بند بھی اسی فکری تسلسل کا حامل ہے۔ یہ نظم قطعہ بند ہیئت میں ہے۔ نظم ھذا میں انہوں نے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے جو دبستانِ دہلی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ دہلوی احترام و خلوص اور وضع داری کی علامت ہے۔ عصرِ حاضر کے سخنوروں میں یہ اندازِ سخن شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ پہلے بند میں انہوں نے اپنے وطن کو سرزمینِ اہلِ محبت کہا ہے جس سے ان کے ظاہری و باطنی خلوص کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ وطن اور اہلِ وطن کے کارناموں پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے کہ ہم نے جہالت کی ظلمتوں کو نیست و نابود کر دیا اور ہم نے چراغِ مہر و اخوت جلائے ہیں۔ بند ملاحظہ ہوں۔

ہم کہہ رہے ہیں اہلِ ادب سے کہ دوستو
ہم سرزمینِ اہلِ محبت سے آئے ہیں
تاراج کی ہیں ہم نے جہالت کی ظلمتیں
ہم نے چراغِ مہر و اخوت جلائے ہیں

(ص:25)

شاہدہ لطیف کی نظم ''ارضِ فرانس کے نام'' میں بھی وسیع تر عمرانی ادراکات پائے جاتے ہیں۔ یہ نظم بھی قطعہ بند ہیئت میں ہے۔ اس نظم کا ایک بند نذرِ قارئین ہے۔

سڑکوں کی یہ کشادہ سی باہیں کھلی ہوئی
اور قمقموں کے جال بہ ہرسو بچھے ہوئے
جیسے سیاہ رات کی چادر جا بجا
پھیلا رہے ہیں روشنی جگنو بچھے ہوئے

(ص:27)

ان کی آزاد نظم ''انقلابِ فرانس'' جو بحر ہزج میں ہے، خود میں بہت سے تناظرات سموئے ہوئے ہے جس میں مزاحمتی حوالہ بھی ہے اور جمالیاتی احساس بھی کارفرما ہے۔ تاریخی ادراکات بھی

ہیں۔ دیروز و امروز اور فردائی احوال کی جھلک بھی ہے۔ یہ تمام پہلو مضبوط عمرانی ادراکات کو جنم دیتے ہیں۔

لہو کے سرخ چھینٹوں سے
درو دیوار کے صحرا
ہوئے معمور پھولوں سے
لہو کے ان گلابوں سے
مہکتی اور چٹکتی جاں فزا کلیوں کا
مستقبل ہوا روشن
فرانسیسی جیالوں نے
لکھی تاریخ اپنے خون کے گلنار چھینٹوں سے
عقوبت گاہِ ماضی سے
جمالِ صبح فردا تک
مصائب کی انوکھی داستاں رفتگاں ہے
جسے چشمِ جہاں نے نقش کر رکھا ہے
آئندہ زمانے کی کتابِ زندگی میں سرخ لفظوں سے
یہی الفاظ تابندہ ہیں
تابندہ رہیں گے ہر زمانے میں

(ص:29)

شاہدہ لطیف کی آزاد نظم ''پاکستان اور پیرس کا چاند'' کچھ عمرانی تغیرات کی حامل ہے جنہوں نے ایک تقابلی مطالعہ کی فضا پیدا کر دی ہے۔ نظم ھذا میں چاند، تارے، آسمان اور آفتاب جیسے مظاہرِ فطرت کا استخدام ہوا ہے جس سے ان کا جمالیاتی احساس لائقِ تحسین ہو جاتا ہے۔ نظم شاملِ شذرہ ہے۔

میزباں ہیں ڈاکٹر صاحب کی بیگم خوش مزاج

دھیما لہجہ، خاندانی بردباری اور وقار

میں نے دیکھا چاند جب پیرس میں تو ان سے کہا

بھابی کیا سچ مچ یہی وہ چاند ہے جس کو کہ ہم

اپنے پاکستان میں بھی دیکھتے ہیں چرخ پر

بھابی نے ہنس کر کہا بے شک یہی وہ چاند ہے

چاند اور تارے، درخشاں آفتاب

ان کی کرنیں ساری دنیا کے لیے یکساں ہی ہیں

کچھ کمی بیشی نہیں قدرت کی اس ترتیب میں

چاند پیرس میں نظر آیا جو چمکیلا تمہیں

یہ نظر آئے گا پاکستان میں پیلا تمہیں

فرق گر کچھ ہے وہ ماحول کی ندرت کا ہے

ورنہ سارا کارخانہ ایک سا قدرت کا ہے

(ص:41)

شاہدہ لطیف کی نظم ''پیرس کے چہرے'' خصوصی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ کسی قوم کے چہرے کی شادابی اصل میں اس کی معاشرتی و معاشی خوش حالی کا مظہر ہوا کرتی ہے۔ یہ نظم بحر سریع کے مربع مخبون مکسوف وزن میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''مستفعلن فعولن'' ہے۔

پیرس میں ہم نے دیکھے

تازہ گلاب چہرے

ہنستی ہوئی نگاہیں

اور ماہتاب چہرے

تابندہ عارض و لب

اور پر شباب چہرے

O

چہروں کا اک جہاں تھا
جو رنگ و نور میں گم
غرقاب روشنی میں
کیف و سرور میں گم

O

شاداں تھے اہلِ پیرس
خوش حال زندگی تھی
آنکھیں ستاروں جیسی
چہروں پہ تازگی تھی
پیرس میں ہم نے دیکھے
تازہ گلاب چہرے

(ص:43)

شاہدہ لطیف نے اپنے فرانس کے سفرنامے میں وہاں کی تصویر کشی کی عمدہ کوشش کی ہے۔ وہاں کی زندگی کا ادراک کرنے کے بعد انہوں نے تمام معلومات قاری تک پہنچانے کی خوبصورت کاوش کی ہے۔ گویا انہوں نے ترسیلِ شعور کا کام کیا ہے۔ اسی فکری تسلسل کو برقرار رکھنے کی سعی ان کی نظم ''ایک خیال'' میں بھی موجود ہے۔

دیکھ کر حسیں چہرے
شاہراہِ پیرس پر
دل میں یہ خیال آیا
اس میں شک نہیں کوئی

تیرگی میں ہر جانب
نور کی فشانی ہے
پھر بھی حسن کی دولت
جہاں میں آنی جانی ہے

O

حسن ہی نہیں ہوتا
زندگی میں سرمایا
یہ لطیف سا نکتہ
ان کے ذہن میں آیا
جو یہی سمجھتے ہیں
حسن کامرانی ہے
حسن زندگانی ہے
حسن جاودانی ہے

(ص:44)

نظم ھذا میں شاہدہ لطیف نے ایک فلسفیانہ انداز اختیار کیا ہے جس میں منطقیت و استدلالیت اور استقرائی فضا پائی جاتی ہے۔ایک نظم کے مختصر پیرائے میں انہوں نے اپنا فلسفہء حسن پیش کردیا ہے جس میں اعترافی وانحرافی دونوں خصائص بڑے مدلل طریقے سے بیان کیے گئے ہیں۔گویا ایک گریز کا سا سماں بندھ گیا ہے جس سے ان کی فکر کی گہرائی و گیرائی کا تعین بطریقِ احسن کیا جاسکتا ہے۔

فرانسیسی معاشرت کو سمجھنے کے لیےان کی آزاد نظم ''فرانس کے لوگ'' کا مطالعہ انتہائی ناگزیر ہے۔اس نظم کے توسط سے انہون نے فرانسیسی سماج کے نظم وضبط کو محفوظ کرنے کی سعیِ مشکور کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظم وضبط کو فرانس کی زندگی میں کتنا عمل دخل حاصل ہے۔یہ آزاد نظم بحر

ہزج میں ہے۔

قطاروں میں منظم لوگ
سب خاموش
لب بستہ
مہذب اور شائستہ
ہوائی مستقر ہو ریلوے جنکشن ہو یا پھر
بس ٹرمینل
بہر سو اک منظم قوم کی تصویر
روشن تر
کوئی ہڑ بونگ، جھگڑا، اونچی آواز
کہیں بھی دیکھنے سننے میں
آئی ہی نہیں اب تک
مجھے حیرت سی ہوتی ہے
اگر ہم لوگ بھی یہ طرز
یہ انداز اپنائیں
جہاں میں آبرو بھی
اور اونچا نام بھی پائیں

(ص:45)

شاہدہ لطیف کی آزاد نظم ''پیرس اور پاکستان کے منسٹرز'' دراصل پاکستان اور فرانس کی سیاست کا تقابلی جائزہ ہے اور پاکستانی سیاست پر بھرپور تنقید بھی ہے۔ گویا اس میں تنقیدی رویہ بھی کارگر ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیرس کے وزراء کسی نوع کی ٹھاٹھ باٹھ نہیں رکھتے۔ جس طرح ہمارے وزرا شاہی شان وشوکت رکھتے ہیں۔ گویا ہمارے وزیر ہمارے معاشرے کا

ایک استحصال کنندہ طبقہ ہے۔ اس امر سے یہ بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے وزرا سرکاری وسائل کا اسراف وضیاع کرتے ہیں اور بدعنوانی کے نئے ریکارڈ قائم کرتے ہیں۔ یہ معاملہ باعثِ تعجب بھی ہے اور کرپشن کی نشاندہی بھی کرتا ہے جس کے سبب ہماری معیشت غریب سے غریب تر ہوتی جارہی ہے۔ بیرونی قرضوں کا بوجھ بڑھتا جارہا ہے۔ جبکہ فرانس کے وزرا انتہائی سادگی سے زندگی گزارتے ہیں جبکہ ہمارے وزرا قومی خزانے کو دونوں ہاتھوں سے اڑاتے ہیں۔ ان کی یہ نظم درحقیقت حب الوطنی کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ یہ نظم بحر ہزج میں کہی گئی ہے۔

یہاں دیکھے ہیں میں نے وہ منسٹر بھی
سفر کرتے ہیں جو لوکل بسوں میں عام سیٹوں پر
جو اپنے ملک کے سب شہریوں جیسے
نظر آئے عوامی سے
دلوں کو جیت لیتے ہیں
جو اپنی خوش کلامی سے
عوام الناس کے دل میں
جنہوں نے گھر بنایا ہے
مگر میرے وطن کے محترم اعلیٰ وزیروں کے
نرالے ٹھاٹھ ہیں سب سے
عوامی خود کو کہلانے کے خواہش مند ہیں لیکن
عوام الناس کے دکھ اور مسائل سے ہیں ناواقف
سفر کرتے ہیں یہ ان گاڑیوں میں
جن کے شیشے بھی
سدا تاریک ہوتے ہیں

(ص:48)

شاہدہ لطیف کی آزاد نظم ''فرانس کی عورت'' بھرپور عمرانی تاثر کی حامل ہے کیونکہ کسی بھی معاشرے میں عورت کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ نظم ھذا میں عورت کے مقام و مرتبے کو زمانی تثلیث کے آئینے میں دکھایا گیا ہے۔ مرد و عورت کے مساوی بنیادوں پر حقوق کی بات کی گئی ہے۔ جس میں نسائی بیداری کا حوالہ بھی ہے۔ یہ نظم بحرِ اوفر میں ہے۔

اتنی بات تو تم بھی سمجھو
اے دنیا کے عاقل لوگو
عورت اب مظلوم نہیں ہے
اس کو رحم کی بھیک نہ دو تم
ارضِ خدا پر
مرد اور عورت
دونوں ہم رتبہ ہم منصب
ایک برابر
نہ تو عورت ذات ہے کم تر
اور نہ مرد کی ذات ہے برتر
اک گاڑی کے دو پہیے ہیں
مرد اور عورت
ماضی میں ہر ظلم و ستم پر
عورت لب پر مہر لگائے
بے بس اور خاموش رہی ہے
لیکن اب آکاش کے نیچے
یہاں کی عورت جاگ چکی ہے
عورت کو مظلوم نہ سمجھو

اس کو رحم کی بھیک نہ دو تم
عورت اب مظلوم نہیں ہے
اتنی بات تو تم بھی سمجھو
اے دنیا کے عاقل لوگو

(ص: 50-51)

شاہدہ لطیف کی نظم ''پیرس کے بچے'' نظم و ضبط کی حسین تمثیل ہے۔ اس میں بچوں کی منظم زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ نظم سبق آموزی کی عمدہ مثال ہے۔ نظم ھذا قطعہ بند ہیئت میں ہے اور بحر متدارک مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن'' ہیں۔ چونکہ یہ بحر خلیل بن احمد کے بعد اخفش نے نکالی ہے، اور خلیل کی بحروں میں مل گئی ہے، اس لیے اس کا نام متدارک رکھا گیا ہے۔ اس کو ''رکفل الخیل'' اور ''غریب'' بھی کہتے ہیں۔

ایک چھوٹی سی گڑیا ملی راہ میں
آنکھیں نیلی تھیں اور سرخ رخسار تھے
چہرہ جیسے ٹماٹر چمکتا ہوا
اور سر پر سنہری حسین تار تھے

O

اک قرینے سے اسکول جاتے ہوئے
راہ چلنے میں محتاط اور معتبر
بس کے کیو میں کھڑا ہو کے بستہ لیے
اپنی باری کی تھی وقت پر منتظر

O

دوسرے ننھے بچے اسی کی طرح
اک منظم طریقے سے چلتے ہوئے

اپنے اپنے سفر کے حسیں راہ رو
چل رہے تھے قطاریں بدلتے ہوئے

O

حادثہ ایسا پیرس میں دیکھا نہیں
جس میں بچہ کوئی راہ میں گھائل ہوا
قومیں نظم و سلیقہ سے پاتی ہیں اوج
دل ہمارا اسی فن کا قائل ہوا

(ص:52-53)

شاہدہ لطیف بیان کی مقتضیات کے تحت تشبیہات و استعارات کا استخدام قرینہ کاری سے عمل میں لاتی ہیں۔ عمرانی حوالے سے طنز و تنقید کے نشتر بھی موثر پیرائے میں ملتے ہیں۔ ان کی آزاد نظم ''مہذب کتے'' خود میں ایک استعاراتی فضا رکھتی ہے۔ کسی بھی ملک کے مراعات یافتہ طبقے کو انہوں نے مہذب کتوں سے موسوم کیا ہے۔ اسے ہم اپنا برسرِ اقتدار طبقہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ جنہوں نے مفلوک الحال طبقے کے حقوق پر شب خون مارا ہوا ہے۔ نظم ھذا بیک وقت انسان دوستی اور ترقی پسندی کے شواہد رکھتی ہے۔ اس نظم کا شمار ان کی عمدہ ترین نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم بحر ہزج میں ہے۔

مہذب ملک کے کتے
جنہیں اعزاز حاصل ہے
کہ پسماندہ ممالک کے غریبوں سے زیادہ
عزت و تکریم پائیں گے
جو بوڑھے لوگ ہیں
ان کی رفاقت بھی نبھائیں گے
مہذب اور مودب شہر کے کتے

ادا کرے ہیں مالک بن کے بھاری ٹیکس سالانہ
یہ کتے عام لوگوں سے زیادہ محترم ٹھہرے
کہ ان کتوں کو پسماندہ ممالک کے غریبوں پر
کچھ ایسی فوقیت حاصل ہے
جس کو ہم
نہ کوئی نام دے سکتے ہیں نہ عنوان ہی کوئی

(ص:64)

شاہدؔہ لطیف کی آزاد نظم ''پیرس کے گلی کوچے'' تہذیبی و تمدنی اور عمرانی حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے جس میں قدیم و جدید پیرس کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ نئی اور پرانی تہذیب کے خدوخال اجاگر کیے گئے ہیں۔

جدید پیرس کی اجلی سڑکیں
جدید تہذیب کی علامت
چمک رہی ہے جبینِ شہرِ عروسِ فن پر
یہ قمقموں کی حسیں قطاریں
عمارتوں کا سجل توازن
جدید پیرس کی شاہراہوں کو خوبصورت بنا رہا ہے
قدیم پیرس کی خستہ سڑکیں
گئے دنوں کی کہانیاں کچھ سنا رہی ہیں
وہ بگھی والے
وہ لالٹینیں
حویلیاں وطویل و ویراں، کہیں درخشاں
معززینِ دیارِ خوباں

ٹہل رہے ہیں
مگر زمانہ بدل چکا ہے
عظیم پیرس کی شاہراہیں
نئے فسانے سنا رہی ہیں

(ص:68)

شاہدؔہ لطیف کے اسلوبیاتی ولسانیاتی کینوس میں ایک عمدہ نظامِ مرکبات بھی کارفرما ہے اور لطف آفریں بات یہ ہے کہ کہیں کہیں دوہرے اور تہرے مرکبات کا استخدام قرینہ کاری سے کیا گیا ہے۔ ان مرکبات میں مرکب عطفی ،مرکب اضافی اور مرکب توصیفی شامل ہیں۔ کچھ مرکبات عمومی نوعیت کے ہیں اور کچھ مرکبات اختراعی نوعیات کے ہیں ۔ مذکورہ بالا نظم میں بھی ''جبینِ شہرِ عروسِ فن'' اور'' معزز ینِ دیارِ خوباں'' جیسے دوہرے اختراعی مرکباتِ اضافی برتے گئے ہیں۔

ان کی نظم ''وطن کی یاد'' دراصل فرانس اور پاکستان کے تقابلی عمارنی مطالعہ پر مبنی ہے جہاں دونوں اطراف کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ اگرچہ اس نظم میں کچھ غیر جانبداری کی فضا ہے مگر پھر بھی ان کا جذبہء حب الوطنی غالب رہا ہے۔ یہ نظم بحرِ اوفر مربع سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہیں۔

دیکھ کے پیرس کی شاہراہیں
دلکش چہروں کا بہروپ
مجھ کو وطن کی یاد آتی ہے
اپنے وطن کی خستہ گلیاں
اجڑے ہوئے بے نور سے رستے
جن پر رنگ نہ غازہ کوئی
مجھ کو وطن کی یاد آتی ہے
مشرق ہے خورشید کا مسکن

مغرب میں ڈھل جاتا ہے

مشرق سچا اور مغرب میں

کھوٹا سکہ چل جاتا ہے

مجھ کو وطن کی یاد آتی ہے

میرا وطن بالا اور اعلیٰ

میرے وطن کی شان الگ ہے

بے شک پیرس والے سمجھیں

ان کی آن اور بان الگ ہے

مجھ کو وطن کی یاد آتی ہے

(ص:70)

شاہدؔہ لطیف کا منظوم سفرنامہ ''برف کی شہزادی'' وسیع تر عمرانی ادراکات کا حامل ہے۔ یہ امر کسی بھی سفرنامے کی کامیابی کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ شاہدؔہ لطیف نے فرانس میں رہتے ہوئے بھی مشرقی اقدار و روایات اور حب الوطنی کے تقاضوں کو فراموش نہیں کیا۔

شاہدہ لطیف ایک انسان دوست شاعرہ

کائنات کا سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے جو انس، الفت، پیار، ہمدردی اور مروت سے موسوم ہے۔ ایک اچھے انسان کے یہی اوصافِ جمیلہ ہوا کرتے ہیں۔ زندگی کے تمام تر شعبوں میں ان احساسات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دینِ اسلام میں بھی ان کی فزوں تر اہمیت ہے کیونکہ ان کا تعلق حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں سے یکساں ہے۔ شاعری جیسے فنونِ لطیفہ میں مقبولِ عام کی سند حاصل ہے، زیادہ حساسیت کی حامل ہوتی ہے جس میں انسانیت کے حامل جذبوں کو مقامِ اعتبار حاصل ہے اور ان احساسات کو فوقیت دی جاتی ہے۔

شاہدہ لطیف چونکہ نظریۂ ادب برائے زندگی کی قائل ہیں۔ اس لیے ان کے سخن میں انسان دوستی کا کینوس بسیط و عریض ہے۔ شذرہ ھذا میں ہم ان کے سخن کا تجزیہ انسان دوستی کے تناظر میں کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم ان کے شعری مجموعہ ''محبت ہونہ جائے'' مطبوعہ جون 2006ء جو ترتیب کے لحاظ سے پانچویں نمبر پر ہے، کے نصف اول کی منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ کا تجزیہ اسی تناظر میں کریں گے اور جملہ انتقادی امکانات کو بروئے کار لائیں گے۔

عام طور پر انسان دوستی کے لیے ترقی پسندی کی اصلاح بھی بروئے کار لائی جاتی ہے جو ہماری نظر میں روا نہیں ہے کیونکہ ترقی پسندی میں مادیت کے تصورات در آتے ہیں۔ جبکہ ہمارے خیال میں انسان دوستی مادیت سے ماورا ہے اور انسان دوستی کے سلسلے میں خدا خوفی کا عنصر ناگزیر ہے کیونکہ جس انسان کے اندر خدا کا خوف ہوگا، وہی شخص ہی صحیح معنوں میں انسان دوست ہوگا۔ خدا خوفی کے لیے خدا پر قوی ایمان ہونا بھی ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر انسان دوستی کے فوائد و

ثمرات حاصل نہیں ہوسکیں گے۔ علاوہ ازیں انسان دوستی کے لیے عاجزی وانکساری کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ غروراور تکبر انسان کو انسانیت سے دور کر دیتا ہے۔ مخلص لوگ انسان دوستی میں اپنی جان جیسی پیاری چیز بھی قربان کر دیتے ہیں۔ بسا اوقات انسانی ہمدردی میں اپنے جسمانی اعضا بھی عطیہ کر دیتے ہیں۔

شاہدہ لطیف اپنے بیان کی مقتضیات کے مطابق تلمیحات کو بھی بروئے کار لاتی ہیں۔ انسان کی بے ثباتی اور غرور وتکبر کی مذمت کے حوالے سے انہوں نے سکندر کی تلمیح کا استخدام کیا ہے جو خالصتاً انسان دوستی کے تناظر میں ہے۔ ان کا کلام خلوص کی دولت سے معمور ہے۔ ان کی غزل کے تین اشعار مذکورہ بالا پس منظر میں قابلِ ذکر ہیں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہیں جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

خدا کو سامنے ہر آن رکھ لیں
اگر اس پر قوی ایمان رکھ لیں
اتر جائیں گے سینے میں زمیں کے
سکندر جیسی چاہے شان رکھ لیں
جو میرے بعد کام آئیں کسی کے
مری آنکھیں ہیں حاضر دان رکھ لیں

(ص:20)

وہ حقیقت کی قائل ہیں اور ان کے خیالات پر حقائق کا تسلط رہتا ہے۔ وہ حقیقی اور مثالی زندگی کی تمنائی ہیں۔ خلوص ومروت اور محبت کو زندگی کا اصل حسن قرار دیتی ہیں۔

حقیقتوں کے فسانے مرے خیال میں ہیں
محبتوں کے زمانے مرے جمال میں ہیں

(ص:23)

اس کرۂ ارضی پر فکری وذہنی اعتبار سے انواع واقسام کے انسان آباد ہیں اور یہ امر اس کی

قدرتِ کاملہ کا کرشمہ ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں غرور وتکبر پسند ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو بالا و برتر مخلوق خیال کرتے ہیں۔ ان کے برعکس اللہ کے نیک بندے عاجزی وانکساری کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں اپنے دیس کی مٹی سے پیار ہوتا ہے اور یہی امران کی انسان دوستی کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ ان کی غزل کا ایک شعر اسی حوالے سے قابلِ ذکر ہے جس میں نادر قوافی اور ردیف کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ یہ شعر بحر ہزج مثمن سالم میں ہے۔

کسے ہے فخر کہ بالا نشینوں سے تعلق ہے
مجھے تو ناز ہے میرا زمینوں سے تعلق ہے

(ص:25)

فطری طور پر ہر انسان کو بچپن کی یادیں بہت عزیز ہوا کرتی ہیں جنہیں وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ان یادوں سے وابستہ کچھ بچپن کے کھلونے بھی ہوا کرتے ہیں۔ ایک انسان دوست شخص کے لیے محبت، خلوص و مروت اور انسان دوستی بچپن کے کھلونوں کی طرح اہم ہوتے ہیں۔ شاہدہ لطیف نے اپنے ایک شعر میں محبت کو بچپن کے کھلونے سے تشبیہہ دی ہے جسے پا کر وہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔ آمدہ شعر بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

محبت جیسے بچپن کا کھلونا
جسے پا کر مچلتی جا رہی ہوں

(ص:31)

شاہدہ لطیف محبت میں گہرائی و گیرائی کی قائل ہیں۔ وہ خلوص کی دولت سے مالا مال ہیں اور شرافت کی قائل ہیں۔ اس لیے ان کا سخن وسیع تر تشبیہاتی آفاق رکھتا ہے۔ وہ محبت کو سمندر کی گہرائی سے تشبیہ دیتی ہیں۔ بحر ہزج مثمن سالم میں ان کا یہ شعر دیکھیے۔

سمندر کی طرح گہری محبت کام آتی ہے
حقیقت ہے کہ اب تیری شرافت کام آتی ہے

انسان دوستی ان کی شاعری کا کلیدی پیغام ہے جسے وہ نظامِ حیات کی اساس قرار دیتی ہیں کیونکہ پیار ہی ایک ایسا جذبہ ہے جس پر خدا کی خدائی کا انحصار ہے اور شاعرا سے لائقِ اظہار سمجھتے ہیں۔ مذکورہ بالا بحر و وزن میں ان کی غزل کا مطلع قابلِ ذکر ہے جو اسی تاثر کی نمائندگی کر رہا ہے۔

خدائی جس پہ قائم ہے اسی کو پیار کہتے ہیں
اسی جذبے کو شاعر لائقِ اظہار کہتے ہیں

(ص:47)

انسان دوستے کے بہت سے تقاضے ہیں جن میں ایک ناگزیر تقاضا یہ بھی ہے کہ کمزور و ناتواں اور مفلس و ناچار انسانی طبقے سے بے لوث محبت کی جائے۔ یہی جذبہ اصل میں انسانیت کی معراج ہے۔

سر اٹھائے کھڑے تھے پختہ مکاں
گھر جو کچے تھے زیرِ آب آ گئے

(ص:51)

انسانی خدمت کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ اس کی مسرتوں کے لیے کوشاں رہا جائے کیونکہ ایک انسان کی خوشی پوری انسانیت کی خوشی ہوا کرتی ہے۔ جیسے فارسی میں کہتے ہیں ''یک دل از ہزار کعبہ بہتر است'' یعنی ایک دل کی خوشی کعبہ کے ہزار حج سے بہتر ہے۔

کوئی تو کارِ ہنر زندگی میں کر جائیں
اگر اداس سے چہرے ذرا نکھر جائیں

(ص:52)

شاہدہ لطیف کے بیان میں منطقیت کا پہلو ان کے شعری موقف کو باور کراتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ تشبیہات کا فزوں تر استعمال کرتی ہیں۔ کیونکہ تشبیہ علمِ بیان کی ایک ایسی صنعت ہے جس سے بات بہ آسانی سمجھ آ جاتی ہے۔

محبتوں میں خیالِ وفا ضروری ہے

گھٹن میں جیسے تازہ ہوا ضروری ہے

(ص:54)

محبت ان کے رگ و پے میں سرایت ہے جسے مضبوط و مستحکم روایات کا درجہ حاصل ہے۔ اس روایت سے انحراف انہیں کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ ان کی غزل کا مطلع اسی حوالے سے ہے اور بحر متدارک مثمن سالم میں کہا گیا ہے۔ وہ محبت سے انحراف کو انسان دوستی کے خلاف بغاوت قرار دیتی ہیں۔

اتنی اعلیٰ روایت سے باغی نہ کر
مجھ کو میری محبت سے باغی نہ کر

(ص:55)

وہ زیست کے مصائب و آلام اور تمام تر صعوبتوں کے باوجود پریم جذبوں کی پالنا کرتی ہیں۔ کوئی بھی رکاوٹ ان کا راستہ مسدود نہیں کر پاتی۔ جس سے ان کی مضبوط قوتِ ارادی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

آندھیاں ہوں کہ برق و باراں ہو
چاہتوں کا دیا جلانا ہے

(ص:70)

شاہدہ لطیف وسیع تر شعری کینوس رکھتی ہیں۔ انسان دوستی کے حوالے سے ان کے ہاں فزوں تر شواہد موجود ہیں۔ طولِ بیاں کا خوف مانع تھا کہ کہیں قاری کی طبع ناز کو مکدر نہ کر دے، اس لیے ہم نے ایجاز و اختصار کے تقاضے نبھائے۔ مذکورہ بالا استشہادات بھی اس موضوع کے حوالے سے عکسِ خفیف کا درجہ رکھتی ہیں۔ البتہ ان کے انسانی دوستی کے آدرش کو سمجھنے میں مدد ضرور فراہم کریں گے۔

منظوم سفر نامہ ''اف یہ برطانیہ'' اور برطانوی معاشرت

سفر وسیلہء ظفر ہوا کرتا ہے۔اس سے بہت سے امکانات کے ابواب وا ہوتے ہیں۔انسانی ادراکات میں اضافہ ہوتا ہے اور معلومات کا گنجِ گراں مایہ ہاتھ آتا ہے اور سفر بھی اگر کسی دوسرے ملک کا ہو تو وہ زیادہ معلومات افزا ہوتا ہے۔ وہاں کی معاشرت کے خدوخال کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور کسی قوم کے عروج وزوال کے اسباب کا اندازہ ہوتا ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدؔہ لطیف کے چھٹے شعری مجموعہ ''اف یہ برطانیہ'' مطبوعہ فروری 2009ء جو برطانیہ کا ایک منظوم سفر نامہ ہے، کا تجزیاتی مطالعہ برطانوی معاشرت کے تناظر میں کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم کتابِ مذکور کی منتخب منظومات یا منتخب منظومات کے منتخب حصوں کو شاملِ استشہادات واستخراجات کریں گے۔موضوع کی پاسداری کے پہلو بہ پہلو دیگر انتقادی تناظرات بھی محلِ نظر ہوں گے۔

کسی بھی قوم کی معاشرت کو سمجھنے کے لیے اس قوم کے عوامی مقامات جن میں بس اسٹاپ، ریلوے اسٹیشن اور ہوائی اڈوں کا مطالعہ انتہائی ناگزیر ہے۔جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ قوم کتنی مہذب اور کتنی ترقی یافتہ ہے۔شاہدؔہ لطیف نے بھی اپنے منظوم سفر نامے میں برطانوی معاشرت کی تصویر کشی کی عمدہ کوشش کی ہے۔انہوں نے اپنی آزاد نظم ''برٹش ائرویز'' میں کرسمس ڈے کا احوال بیان کیا ہے جس سے عیسائیوں کی مذہبی رواداری بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس نظم کا ایک اقتباس دیکھیے۔

یہ ماہِ دسمبر کے دن تھے

دورانِ سفر بھی حیراں تھے
عملے نے ہر مسافر کو
بانٹے تھے تحفے ان گنت
فضا میں تھی اک تقریب وہاں
تخصیص نہ تھی مذہب و رنگ کی
اور خوشی ہماری دو چند تھی
یہ دن تھا کرسمس کا لیکن
تھی سالگرہ اپنے قائد کی بھی

(ص:21)

کسی بھی معاشرت میں ماحولیات کا کردار کلیدی ہوا کرتا ہے کیونکہ عوامی خدوخال مرتب کرنے میں ماحول یا آب وہوا کا ایک اہم کردار ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ موسم انسانی صحت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انسانی اور نباتاتی نشوونما میں یہ عوامل اہم ہوا کرتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی خوش حالی میں یہ عناصر ناگزیر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''ماحولیات'' قابلِ ذکر ہے جو غزل کی ہیئت میں ہے اور بحر متقارب مثمن سالم میں کہی گئی ہے۔ اس کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہیں۔

نکھرتی ہوئی یہ فضا چاندنی ہے
یہاں کی تو گویا ہوا چاندنی ہے
یہ چاندی سے چہرے اجالوں کے جیسے
نظاروں پہ جیسے لکھا چاندنی ہے
ہے ماحول اجلا ہیں موسم دھلے سے
خراماں خراماں صبا چاندنی ہے
ہیں پودے پرندے یہ پھولوں کے چہرے

سمندر ہوائیں گھٹا چاندنی ہے
زمیں پر ہی دیکھی یہ جنت مثالی
یہ برطانیہ شاہدؔہ چاندنی ہے

(ص:29)

شاہدؔہ لطیف کی آزاد نظم ''پوری قوم متحرک'' میں برطانوی روزمرہ زندگی کا عکس بہ حسن وخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

زندگی کرنے کی خاطر
صبح دم سارے رواں
مردو زن، پیر و جواں
کارواں سارے رواں
دم قدم ہیں شادماں
شاید یہی اک راز ہے
ان کی ترقی میں نہاں
اے کاش سب یہ دیکھتی
اپنے وطن میں بھی یہی
آدھے سے بڑھ کر مردو زن
جیسے گھروں میں خیمہ زن
عضوِ معطل کی طرح
کیسے ترقی ہو وہاں؟
بے کار ہوں آدھے جہاں

(ص:36)

اس نظم میں انھوں نے جہاں برطانوی معاشرت کی تصویر کھینچی ہے، وہاں ایک المیہ یہ بھی

بیان کیا ہے کہ ہماری نصف آبادی گھروں میں بیکار رہتی ہے اور معاشی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔ ایسی صورتِ حال میں ایسی قوم کا ترقی کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتا۔ گویا شاہدہ لطیف نے برطانوی اور پاکستانی معاشرت کے حوالے سے ایک تقابلی مطالعے کی فضا پیدا کر دی ہے۔

برطانوی قوم کی خوش مزاجی کی کیفیات ان کی نظم ''دل آویز مسکراہٹ'' کے ایک بند میں ملاحظہ کریں۔

ہیں تمام برطانوی خوش طبائع، خوش رخسار
خوش مزاج وخوش اخلاق اور سارے خوش اطوار
دیکھ کر ہمیں سب مسکرتے رہتے ہیں
دل کشی کے آئینے جگمگاتے رہتے ہیں

(ص:38)

کسی بھی ملک کی تعمیر وترقی کا انحصار اس کی افرادی قوت پر ہوا کرتا ہے جس میں طبقۂ ذکور کا کردار کلیدی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''برطانیہ کے مرد'' جو غزل کی ہیئت میں ہے، خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

اپنی دھرتی کی مہکتی ہوئی پھلوار ہو تم
امنِ عالم کے لیے اک حسیں معیار ہو تم
تم نے تاریخ سے سیکھا ہے سبق اہلِ خرد
ظلم کی دھوپ میں بھی سایۂ دیوار ہو تم
دیکھ کر تم کو خوشی ہوتی ہے بے حد مجھ کو
کتنے خوش ذوق، خوش اعمال وخوش اطوار ہو تم
خواب کو کرتے ہو تعبیر کے قالب میں عیاں
اپنے آدرش کی نصرت کے طلب گار ہو تم

برق یا موجِ رواں، رقص میں ہر دم مصروف
اپنے افلاک کے ثابت نہیں سیار ہو تم
بے جھجک کہتے رہے اہلِ تمدن حق بات
ان کے ہر خواب کی تعبیر کا معیار ہو تم

(ص:40)

مردوں کے ساتھ معشر اناث بھی شانہ بشانہ ملکی خوشحالی میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔اس سلسلے میں ان کی نظم ''عورت'' کے تین بند قابلِ توجہ ہیں۔ یہ نظم قطعہ بند ہیئت میں ہے اور بحرِ وافر کے مربع وزن میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہیں۔ اس بحر کا شمار بحورِ مستحد ثہ میں ہوتا ہے۔ ان بحور سے مراد ایسی بحور ہیں جن کے اوزان دوسری بحور سے حاصل کیے گئے ہوں۔

آؤ دیکھو انگلستان میں
مردوں سے مضبوط ہے عورت
اور یہاں کی خوش حالی سے
کامل اور مربوط ہے عورت

مردوں سے بھی کہیں زیادہ
ہر وقت ایک لگن رہتی ہے
اپنے کام دھیان میں ہر دم
مصروف اور مگن رہتی ہے

اس کو حقوق ملے ہیں سارے
اور تحفظ سرکاری ہے

ایسی ہے تہذیب یہاں کی

عورت مردوں پر بھاری ہے

(ص:41)

شاہدہ لطیف کی آزاد نظم ''معصوم فرشتہ'' برطانوی بچوں کے حوالے سے ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہاں بچوں کی جبری مشقت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ نظم مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہی گئی ہے۔

جس جانب بھی دیکھا ہم نے

پھولوں سے معصوم فرشتے

ہنستے کھیلتے سارے بچے

پرتو ہیں سب بے فکری کے

پورے انگلستاں میں ہم نے

درزی، ہاکر یا شومیکر

ورکشاپ یا کارخانے میں

کوئی بھی معصوم فرشتہ

پھولوں جیسا کوئی چہرہ

زنگ آلود نہ ہوتے دیکھا

(ص:48)

برطانوی تہذیب کی عکاسی کے حوالے سے ان کی آزاد نظم '' تہذیب'' لائقِ توجہ ہے۔

نظم سے اور ترتیب سے قومیں

بے شک زندہ رہتی ہیں

ہم نے انگلستاں میں اس کے

ان گنت مناظر دیکھے

ائرپورٹ ہو
یااسٹیشن
ریسٹورنٹ یا کوئی جگہ
اپنی ہی ترتیب ہے سب کی
گویااک تہذیب ہے سب کی
اپنی اپنی باری پر سب
اپنے کام نپٹاتے ہیں
نہ شکوہ نہ کوئی شکایت
سب میں ہے اک انسانیت
نظم اور ترتیب سے قومیں
بے شک صدیوں جیتی ہیں

(ص:52)

عورت کی عمومی و خصوصی فطرت کے حوالے سے ان کی نظم ''مغرب کی عورت'' قابلِ ذکر ہے جس میں ایک روزمرہ واقعہ کو منظوم کیا گیا ہے۔ یہ نظم خود میں ایک نفسیاتی تاثر بھی رکھتی ہے جس میں جنسِ مخالف سے ایک موانست کا فطری جذبہ کارفرما ہے۔نظم ھذا مثنوی کی ہیئت میں ہے اور بحر رمل مثمن محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔

مشرقی عورت ہو یا مغرب کی، فطرت ایک ہے
دونوں میں نفرت، محبت اور خصلت ایک ہے
ہم نے لندن میں کسی جوڑے سے پوچھا راستہ
مشرقی عورت سے مل کر آدمی کچھ کھل اٹھا
گفتگو ہوتی رہی اس آدمی سے باہمی
اور اس عورت کی حالت ہو گئی کچھ دیدنی

مشرقی عورت کی صورت جل اٹھی وہ مہ جبیں
آدمی سے بحث کرنے لگ گئی وہ بے یقیں
اس قدر حیرت ہوئی مغرب میں مشرق دیکھ کر
غیر کے آنگن میں گویا یاد آیا اپنا گھر
شاہدؔہ مغرب کی عورت فطرتاً حاسد لگی
ہے طریقِ مغربی، گویا طریقِ مشرقی

(ص:81)

شاہدؔہ لطیف نے اپنے منظوم سفرنامے میں برطانوی معیشت اور معاشرت کو اجاگر کرنے کی سعیِ جمیل کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمِ معریٰ ”غربت کی لکیر“ ملاحظہ کیجیے جو بحرِ اوفر کے مربع وزن میں ہے۔

کتنے برسوں سے ہے ہمارا
آنا جانا انگلستاں میں
رشک ہے ان کی خوشحالی پر
جن کے دیس میں بھوک نہیں ہے
آسودہ سے چہرے سارے
جیسے سورج چاند ستارے
ہر دم جگمگ اور دمکتے
سوچ رہی ہوں انگلستاں میں
غربت کی لکیر نہیں ہے
غم جیسی تصویر نہیں ہے

(ص:112)

کسی بھی ملک کے معروف اور تاریخی شہر وہاں کی معاشرت کے نمائندے ہوا کرتے ہیں۔

اسی نسبت سے لندن جسے برطانیہ کا دارالخلافہ ہونے کا درجہ حاصل ہے، شاہدہ لطیف کا لندن کے حوالے سے اظہارِ خیال قابلِ ذکر ہے۔ ان کی نظم ''لندن'' جو مثنوی کی ہیئت میں ہے، نذرِ قارئین ہے۔

لندن ہے ایسا شہر کہ ہے شہرِ بے مثال
ہیں صاحبانِ ذوق، یہاں لوگ باکمال

دنیا میں یوں تو شہر بھی روشن ہیں بے شمار
لیکن فرنگ دیس ہے مانندِ لالہ زار

گلیوں میں ایک خاص تمدن کی ہے جھلک
سڑکوں کی اپنی شان ہے اپنی چمک دمک

پوشاک اہلِ شہر کی اتنی حسین ہے
پھولوں سے جیسے صحنِ چمن کی زمین ہے

تہذیب کا خیال ہے ہر شخص کو یہاں
لہجہ تمیز دار ہے شائستہ ہے زباں

دھیمے سروں کا شہر ہے جیسے ندی کا گیت
آہستگی ہے جیسے زمانوں سے اس کی ریت

اے شہرِ بے مثال تری کیا مثال دیں
اتنا کریں گے بس تجھے لفظوں میں ڈھال دیں

(ص:14)

انگلستان کی خوشحالی کے حوالے سے ان کی نظم ''خوش حال انگلستاں'' ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ نظم ھذا قطعہ بند ہئیت میں ہے۔ اس میں سے ایک بند شاملِ شذرہ ہے۔

ہر شہر وہاں کا دیکھا ہے
ہر اک خوش حال نظر آیا

سب کچھ ہی وہاں آسودہ ہے
کچھ بھی نہ ملال نظر آیا

(ص:115)

کسی بھی معاشرت کی طعام گاہیں وہاں کی تہذیب وتمدن کی عکاس ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''لندن کے ہوٹلز'' قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ نظم غزل کی ہیئت میں ہے جس میں قافیہ اور ردیف کے اشتراک نے شعریت کی ایک دلچسپ چاشنی پیدا کر دی ہے۔ نظم ھذا بحر سریع مثمن مخبون مکسوف میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن'' ہے۔

جیسے کھنچی ہوئی ہے تصویر ہوٹلوں کی
آپس میں یوں ملی ہے زنجیر ہوٹلوں کی
توصیف کے جلو میں روشن ہیں کچھ دریچے
کچھ لوگ کر رہے ہیں تفسیر ہوٹلوں کی
کچھ سرمئی سی آنکھیں ہر سو چمک رہی ہیں
جن میں لکھی ہوئی ہے تعبیر ہوٹلوں کی
آپس میں مل رہے ہیں لندن میں گاہے گاہے
قسمت مسافروں کی تقدیر ہوٹلوں کی
گائیڈ ہیں چاق و چوبند ہر سمت ہر گلی میں
مقصد بہ حسن و خوبی تشہیر ہوٹلوں کی

(ص:118)

کسی بھی ملک کے قبرستان اس کے مذہب اور تہذیبی وتمدنی عوامل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شاہدہ لطیف کی نظم '' قبر گاہیں'' اس حوالے سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نظم قطعہ بند ہیئت میں ہے۔ بحرِ اوفر کی مربع وزن میں کہی گئی اس نظم کے آخری تین بند قارئینِ سخن کی نذر ہیں۔

لیکن انگلستان میں دیکھا

قبریں جیسے پھول کیار ی
سبزے سے ہر چیز ہری ہے
گورکن کرتے ہیں آبیاری

O

ہر کتبے پر نام اور نمبر
چاروں جانب ایک سلیقہ
کیسی ہے ترتیب یہاں کی
دفنانے کا یہ ہے طریقہ

O

زندوں میں تہذیب ہے کتنی
مر جائیں تو پھر بھی عزت
لگتا ہے یہ سیر گاہیں ہیں
کوئی خوف ہے نہ کچھ وحشت

(ص:125-126)

شاہدہ لطیف کی نظم ''مردوزن'' خود میں ایک بھرپور معاشرتی حوالہ رکھتی ہے۔ معاشی فعالیت کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔نسائی حسن کا بھی پروقار اظہار ہے۔

انداز ہ یہ ہوا یہاں آ کر کہ عورتیں
دل کش بھی ہیں حسین بھی اور پروقار بھی
خوشبو سے ان کے انگ مہکتے ہیں ہر گھڑی
لگتا ہے جیسے موجِ صبا ہے بہار کی
شانہ بشانہ مردوں کے کرتی ہیں کام یہ
رہتی ہیں زندگی میں سدا شاد کام یہ

ہر کام میں شریک زن و مرد ہیں یہاں
کار آمد و عظیم سبھی فرد ہیں یہاں

(ص:130)

کسی ملک کی بزرگ آبادی وہاں کے تہذیبی خدوخال کی نمائندہ ہوتی ہے۔ ان کی نظم ''برطانیہ میں بزرگ'' وہاں کے بزرگوں کی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے۔ جس میں ان کے اوصاف اورمحرومیوں کا مذکور ہے۔ یعنی ان کے ہاں حزن وطرب کی ملی جلی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ ان بزرگوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ عمر رسیدہ جوڑے ایک ساتھ نہیں رہ پاتے۔ کیونکہ وہاں کی روایت یہ ہے کہ بوڑھوں کو اولڈ ہاؤس میں جمع کرا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ شدید قسم کے احساسِ تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں کچھ نہ کچھ عافیت کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے اس نظم میں مغربی و مشرقی بزرگوں کا تقابلی مطالعہ بھی پایا جاتا ہے۔ نظم ھذا مثنوی کی ہیئت میں ہے اور بحر رمل مثمن محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان'' فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔

خوبیاں ہیں ان گنت لیکن ہیں کچھ محرومیاں
ہیں اگر شادابیاں تو کچھ یہاں ویرانیاں
گرچہ ہیں بوڑھے، یہاں کے چاق و چوبند ہوشیار
مسکراتے جگمگاتے ، پر امید و پر بہار
ہے مگر افسوس پھرتے ہیں سبھی تنہا یہاں
ایک بھی جوڑا بزرگوں کا نہیں ملتا یہاں
اس سبب سے ہے اداسی اور تنہائی بہت
اور میرے دیس میں بوڑھوں سے رعنائی بہت
خوش و خرم زندگی پوری نبھاتے ہیں سبھی
اس سبب سے محترم مشرق ہے مغرب سے ابھی

(ص:142)

اگر نظریہءادب برائے زندگی کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہی سفر نامہ کامیاب ترین خیال کیا جاتا ہے جو معاشرت کی بھرپور نمائندگی سے مملو ہو۔ اس اعتبار سے شاہدہ لطیف کا منظوم سفر نامہ ’’اف یہ برطانیہ‘‘ ایک عمدہ ترین سفر نامہ ہے جو برطانوی معاشرت کی ہو بہو تصویر پیش کرتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف برطانوی معاشرت کی عکاسی کی بلکہ اپنی معاشرت کے خدوخال بھی نمایاں کیے ہیں۔

شاہدہ لطیف کا نظریہ ادب برائے زندگی

معاصر ادبیات میں آج کل دو نظریوں یعنی ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کی بازگشت سنائی دیتی ہے لیکن موخر الذکر نظریے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ وہ تمام موضوعات جن کا تعلق حیات و کائنات سے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ہے، وہ سب نظریہ ءادب برائے زندگی کے زمرے میں آتے ہیں۔کائنات کا حوالہ اس لیے شامل ہے کیونکہ کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے اور انسان کا تعلق حیات و کائنات دونوں سے ہے۔ان سخن وروں کا کلام زیادہ معتبر و وقیع خیال کیا جاتا ہے جو نظریہ ءادب برائے زندگی کا حامل ہو۔ کیونکہ عمرانی و سماجی حوالے سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔اور اسی ادب سے انسان اپنی زندگی میں استفادہ کرتا ہے۔ اگر اقدار و روایات کی رو سے دیکھا جائے تو اس کی عمرانی قدریں بسیط و عریض ہیں۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے سخن کا تجزیہ ادب برائے زندگی کے تناظر میں کر رہے ہیں۔اس سلسلے میں ہم ان کے نویں اردو شعری مجموعے ''خواب سونے نہیں دیتے'' مطبوعہ ستمبر 2017ء کے نصف دوم کی منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ کے پس منظر میں کر رہے ہیں۔اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو مجموعہ ھذا کا نام بھی نظریہ ء ادب برائے زندگی سے نسبت رکھتا ہے کیونکہ بیداری زندگی کی علامت ہے اور عمل سے عبارت ہے۔ بین الشذرہ ہماری کوشش رہے گی کہ جملہ انتقادی تناظرات کو بروئے کار لائیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی انواع و اقسام کے مصائب و آلام سے مربوط ہے۔اس لیے ہمیں ہر طرف مہیب صورتِ حال نظر آتی ہے۔ یوں انسان حیرت و استعجاب میں مبتلا ہے کیونکہ

زندگی کی وہ تلخ حقیقت ہے جسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس میں ایک مصلحت کا پہلو بھی پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہمیں زندگی ہماری توقع کے مطابق مل جائے تو ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو اور یوں ہم سستی و کاہلی کا شکار ہو جائیں۔ ان مسائل و مشکلات کی بدولت ہماری زندگی سعیِ پیہم سے مربوط ہو کر محوِ تگ و تاز رہتی ہے۔ اسی نوع کی عکاسی شاہدہ لطیف نے اپنی غزل کے مقطع میں کچھ یوں کی ہے جو بحر ہزج مثمن مقبوض میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن'' ہیں۔

تلاطمِ حیات شاہدہ ہمیں عجب ملا
سفینے بھی شکستہ، بادبان میں بھی کچھ نہیں

(ص:80)

ان کی تخلیقیت کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ قوافی و ردیف کا استخدام فطری پیرائے میں کرتی ہیں۔ یوں ان کا کلام فطری رچاؤ سے ہم آغوش ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے شعری کینوس میں جا بجا نظریہء ادب برائے زندگی بہار افشاں نظر آتا ہے۔ وہ زیست کے ارتقا کے لیے طنز و تنقید کو بھی ضروری خیال کرتی ہیں۔ یوں ان کے ہاں ایک صحت مند زندگی کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔ وہ گویا ہیں کہ اگرچہ آج کا انسان ثریا پر کمندیں ڈال رہا ہے اور مریخ پر رسائی کو بھی یقینی بنا لیا ہے، مگر انسان غمِ حالات اور غمِ ذات سے تا حال رستگاری حاصل نہیں کر پایا۔ یہ امر جہاں انسانی ارتقا کے لیے ایک استفہامیہ نشان رکھتا ہے، وہاں غمِ حالات اور غمِ ذات کے مستقل اور دیرپا ہونے کی علامت بھی ہے۔

آج انسان جو مریخ پہ پہنچا بھی تو کیا؟
غمِ حالات، غمِ ذات ابھی باقی ہے

(ص:82)

شاعری خود کلامی کا دوسرا نام ہے اور شاہدہ لطیف اس خود کلامی سے ترسیلِ شعور کا کام لیتی ہیں۔ وہ مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہیں۔ توکل و استغنا ان کی سرشت میں ہے۔ وہ حیات و

کائنات کی مصلحتوں سے آشنا ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا ادراک بھی رکھتی ہیں اور ان سے رہنمائی بھی لیتی ہیں۔اس لیے وہ انسان کو سعیِ پیہم کا حسین آدرش دیتی ہیں۔ وہ پریشان وملول ہونے سے گریز اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ایک الہامی طاقت ہمہ وقت ہمارے ساتھ ہے جو ہماری مدد وراہنمائی بھی کرتی ہے۔

آفاتِ زمانہ پہ نہ رو، ان سے سبق سیکھ
کیا غیب سے انساں کو اشارے نہیں ملتے

(ص:83)

شاہدہ لطیف کے ہاں استفہامیہ اشارات کا استخدام شدتِ احساس اور زورِ بیاں کا مظہر ہے۔ان کے ہاں حزنیہ عوامل کے پہلو بہ پہلو طربیہ احساسات بھی اپنی بہار دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ زندگی کو زندہ دلی سے گزارنے کی قائل ہیں اور مصائب وآلامِ حیات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ان کا یہی آدرش اپنے قارئین کے لیے بھی ہے۔ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے۔

تمھیں زندگی کی کوئی رت خوش رکھ نہیں سکتی؟
بتاؤ بھی سرِ گلشن سرِ بازار چپ کیوں ہو؟

(ص:84)

ان ے ہاں بھرپور تنقیدی رویے ایک صحت مند زندگی کے تصور کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ قاری کو عمل کی دعوت وتحریک دیتی ہیں۔ اس کا عزم وحوصلہ بڑھاتی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ زیست سعیِ پیہم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔اسی لیے اگر انہیں جواں جذبوں کی شاعرہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔مذکورہ بالا بحر ووزن میں ان کا ایک شعر دیکھیے۔

ابھی تو ریگ زارِ عمر پر دو ہی قدم رکھے
ابھی تو بجھ گئے پاؤں کے چھالے ساتھ کیا دیں گے؟

(ص:88)

ان کے فحوائے بیان میں ایک بھرپور نوعیت کی وضع داری ہے۔ وہ ایک زبردست پندارِ انا کی حامل ہیں۔ وہ کسی نوع کے احسان اور ندامت کی قائل نہیں ہیں اور یہی پیغام اپنے قاری کو بھی دیتی ہیں۔ گویا وہ ترسیلِ ادراک کا کام کرتی ہیں۔ بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ان کا ایک شعر قابلِ ذکر ہے۔

قرض خواہوں کی طرح تیرا تعاقب جو کرے

ایسا احسان نہ لے، ایسی ندامت نہ اٹھا

(ص:90)

وہ معاشرتی ناہمواریوں کو بے نقاب بھی کرتی ہیں اور ان پر بھرپور تنقید بھی کرتی ہیں۔ خیر کے جذبوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور انہیں زبردست خراجِ تحسین بھی پیش کرتی ہیں۔

جھولے میں کوئی ڈال گیا تھا اس کو

فہرست کے خانے میں پدر غائب ہے

ایدھی سا بھی درویش ہے خورشید مثال

اک سمت ابھرتا ہے ، ادھر غائب ہے

(ص:91)

شاہدہ لطیف لالچ اور لوبھ جیسے سماجی عوارض سے مبرا و ماورا ہیں۔ وہ مادیت پسندی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتیں،توکل اور استغنا ان کی سرشت میں شامل ہے۔ وہ صبر وشکر میں ہی عافیت کا پہلو تلاش کرتی ہیں۔ یہی امران کی درویشی کی بین دلیل ہے۔

مرے خدا سے قناعت ہوئی ہے عطا مجھے

کسی بھی قسم کا لالچ مرے نفس میں نہیں

(ص:94)

وہ خلوص ومروت کے جذبات کو سماج کی بقائے باہمی کے لیے ناگزیر خیال کرتی ہیں۔ اگر وقت نے مہر ومحبت کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تو پھر اخلاص و وفا کا نام ونشاں نہیں رہے گا۔ لہٰذا

وقت کو خود ان کی حفاظت کرنا ہو گی۔ ان کی غزل کا مطلع لائقِ التفات ہے۔

وقت کو کرنا پڑے گی پاسبانی پیار کی
ورنہ تو ہو جائے گی ہر بات فانی پیار کی

(ص:103)

انسانی زندگی بہت سی خواہشوں، امنگوں اور آرزوؤں سے عبارت ہوا کرتی ہے جس میں بہت سے ارمان پنہاں ہوتے ہیں مگر انسان کا سب سے زیادہ غموں سے ہی پالا پڑتا ہے۔ شاید ان سب کے امتزاج کا نام ہی زندگی ہے۔

جینے کے ارمان بہت ہیں
غم کے مگر سامان بہت ہیں

(ص:106)

شاہدہ لطیف دوہرے سماجی رویوں کو سخت ناپسند کرتی ہیں اور ان رویوں پر انہیں تعجب بھی ہوتا ہے جس کے باعث وہ شدید صدمے سے بھی دوچار ہو جاتی ہیں۔ مگر ان رویوں کی نقاب کشائی ان کا ایک طرح کا طرزِ تنقید ہے جو نہایت دھیما اور مہذب انداز کا حامل ہے۔

جب کھلی ان کی حقیقت تو بہت قلق ہوا
میں نے کچھ لوگوں کو انسان سمجھ رکھا تھا

(ص:107)

لاحاصلی کا دکھ کسی نہ کسی صورت میں ہر کسی کو ہوتا ہے اور یہی احساسِ زیاں سے عبارت ہوا کرتا ہے۔ اس احساسِ زیاں کے شواہد وہ اپنے اردگرد مشاہدہ کرتی ہیں جن کی بدولت ان کے سخن کے نفسیاتی امکانات کے ابواب وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا یہی وصف ان کی بالیدہ فکری کی علامت ہے۔

کچھ نہ کچھ تو رنجِ عمر رائیگاں تجھ کو بھی ہے
ایسا لگتا ہے کہ احساسِ زیاں تجھ کو بھی ہے

(ص:108)

وہ اپنے سماج میں موجود مادیت آمیز رویوں کی مذمت کرتی ہیں کیونکہ مادیت پسندی ہی انسان کی کردارکشی کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ان کی شاعری کا یہی وصف انہیں ایک دیدہ ور شاعر کے طور پر سامنے لاتا ہے۔

جو دل میں چھپے لاکھ مفادات رکھیں گے
وہ خاک مری عزتِ جذبات رکھیں گے

وہ اپنے فحوائے بیاں میں کہیں بھی نظریہء ادب برائے زندگی کو فراموش نہیں کرتیں بلکہ اسے شاعری کی اساس قرار دیتی ہیں۔اس لیے زندگی چاہے جتنی بھی ہے،اسے وہ غنیمت سمجھتی ہیں اور عمرِ دراز کی خواہش نہیں رکھتیں۔

جو سانس تم کو ملے ہیں وہی غنیمت ہیں
طویل عمر نہ مانگو جہانِ فانی میں

(ص:112)

شاہدہ لطیف ایک شعر کے مختصر پیمانے میں اپنے قاری کو بہت سی مصلحتیں سکھا جاتی ہیں جس کی بدولت زندگی بسر کرنے کا قرینہ اس کے ہاتھ آتا ہے۔وہ حیات میں حماقتوں کی روادار نہیں ہیں کیونکہ حماقتیں سراسر خسارے کا باعث ہوا کرتی ہیں۔

تمہیں تمہاری حماقتوں نے ڈبو دیا ہے
بہت کہا تھا ادھر کی باتیں ادھر نہ کرنا

(ص:118)

ان کے فحوائے شعر میں رموزِ حیات کی کارفرمائی ہے۔وہ اپنے قاری کو زیست کے قرائن سے آشنا کرتی ہیں اور آدابِ گفتگو بھی سکھاتی ہیں۔ان کے ہاں ایک بالیدہ فکری کی فضا ہے جو سنجیدگی سے عبارت ہے۔لایعنیت سے گریز کی ایک شعوری صورت ہے جو کارگر دکھائی دیتی ہے کیونکہ انہیں اپنے اور اپنے قاری کے قیمتی وقت کا احساس بھی ہے۔وہ آدابِ گفتگو سے واقف ہیں

اور اسی شعور کی ترسیل کا مقصد ان کے سخن میں بھی کارفرما ہے۔

پہلے تو لفظ لفظ کرو جمع اپنی بات
سوجھے نہ اچھی بات تو بولا نہیں کرو
میں اس کو کیا بتاتی رموزِ رہِ سلوک
بس یہ کہا کہ چپ رہو بولا نہیں کرو

(ص:122)

وہ علم و ادب دوست شاعرہ ہیں۔ مادی دولت انہیں مرغوب نہیں ہے۔ اس لیے وہ مادیت آمیز رویوں کی مذمت کرتی ہیں کیونکہ اس سے خود غرضی، بے حسی اور بے رحمی کو فروغ ملتا ہے اور فلاحی معاشرے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتا۔ اس لیے ان کے نزدیک کتابوں کی دولت ہی اصل خزنہ ہے جو انسان کو مادیت کی بھینٹ چڑھنے سے محفوظ و مامون رکھ سکتا ہے۔

اپنا جانا ہی نہیں دولتِ دنیا کو کبھی
میں نے جانا تو کتابوں کو خزانہ جانا

(ص:127)

شاہدہ لطیف کے سخن میں بھرپور رجائی جذبے بہار افشانی کر رہے ہیں۔ وہ ان کی اہمیت سے آشنا ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر دنیا و عقبیٰ کی کامیاب زندگی کا خواب ادھورا رہ جاتا ہے اور زندگی بیم و یاس کے احساسات میں مقید ہو کر رہ جاتی ہے جن سے فرار کی کوئی صورت میسر نہیں آتی۔ اس لیے وہ زندگی کو زندہ دلی کے انداز میں گزارنے کی قائل ہیں۔

اگر نہ ہوتی بہاروں کی آرزو مجھ کو
یہ زندگی مجھے برقِ خزاں بنا لیتی

(ص:131)

وہ خلوص و وفا اور صدق و صفا کی قائل ہیں۔ کذب سے انہیں کدورت ہے۔ صدق سے انہیں محبت ہے۔ وہ معاشرے میں صداقت کے عمومی چلن کی خواہاں ہیں۔ وہ ایک دائیں بازو کی

شاعرہ ہیں اور سچائی ان کی سرشت میں ہے۔

کتنے اچھے ہیں وہ احباب جو سچ بولتے ہیں
یہ چلن کاش ہر ایک دل کو گوارا ہوتا

(ص:130)

ان کے ہاں کلاسیکی معیارات کی بازیافت کا عمل شدید تر ہے۔ وہ عصرِ حاضر میں قحط الرجال کی کیفیت محسوس کرتی ہیں۔ رجولیت کے فقدان کا احساس انہیں ہر وقت کچوکے لگاتا رہتا ہے جو احساسِ زیاں کا روپ دھار لیتا ہے۔گزشتہ ساعتوں کی روایات انہیں عزیز ہیں ۔اہلِ وفا اور اپنے قول کی پابندی کرنے والے لوگ انہیں پسند ہیں ۔

اب تو کوئی شاہدہ وعدہ وفا ہوتا نہیں
اب کہاں پاسِ وفا، پاسِ زیاں موجود ہے

(ص:146)

وہ سماج کے منفی رویوں کی بھرپور انداز میں مذمت کرتی ہیں اور ان کے فروغ پر انہیں قدغن مطلوب ہے۔ان کے ہاں قاری کے لیے صبر کرنے کا ایک حسین سندیس موجود ہے۔

برا نہ مان اگر تجھ کو کہہ رہے ہیں برا
ہے کارِ شہر کہ دستار کو اچھالنا تھا

(ص:147)

عہدِ ماضی کی بازیافت کا عمل ان کے ہاں بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے کیونکہ عصرِ حاضر میں مرگِ اقدار و روایات کی روش انہیں سخت ناپسند ہے۔اس لیے وہ کہیں کہیں زندگی سے شاکی بھی نظر آتی ہیں اور ان کے ہاں نئے فلسفیانہ اور نفسیاتی آفاق و اعماق کے نئے ابواب وا ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

دو چار سال گزرے ہوئے مجھ کو دے سکے
یہ زندگی تو اتنی سخی بھی نہیں لگی

(ص:148)

شاہدؔہ لطیف کے ہاں عصری رویوں کی بازگشت کا عمل تیز تر نوعیت کا ہے۔ یہی عمرانی اطوار ہی ذہن سازی اور کردار سازی میں سنگِ میل ثابت ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہر تخلیق کار اپنے عہد سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے اثرات مرتب بھی کرتا ہے۔

گو داستاں سناتا رہتا ہے وقت ہم کو

بنتی ہے ذہن میں اک تحریر رفتہ رفتہ

(ص:149)

وہ بے لوث اور بے ریا جذبوں کو اپنے ہاں جذب کر لیتی ہیں۔ یہی انجذاب کا عمل ان کی شاعری میں جابجا محسوس ہوتا ہے۔ خلوص و مروت کی وہ تہِ دل سے تحسین و ستائش کرتی ہیں۔

شاہدؔہ اتنی تو گنجائشِ دل رکھتی ہوں

بے ریا جو ہے سما جائے ہمارے دل میں

(ص:150)

انہیں مذہبی ذہن و تربیت حاصل ہے۔ اس لیے وہ لمحہ بہ لمحہ شاکر و قانع رہتی ہیں۔ وہ اپنے رازقِ حقیقی کے ہر نوالے کی شکر گزار ہیں اور ہر لقمے کو ایک قرض خیال کرتی ہیں، جس کا ادا کرنا عبادت و ریاضت کی صورت میں ناگزیر ہے۔

ہر ایک لقمۂ تر پر ہے شکر کا سجدہ

کہ قرض دار ہیں ہم ایک ایک دانے کے

(ص:153)

جب اہلِ ذوق میں ذوق ہی باقی نہ رہے تو پھر اہلِ فن مادیت کے حصار میں مقید ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر ان کا مقصدِ حیات حصولِ دولت ہی رہ جاتی ہے۔ کچھ اسی نوع کی شکایت انہوں نے بھی کی ہے۔

جب لوگ اپنے ذوق سے بیگانے ہو چلے

پھر اہلِ فن تعاقبِ دولت میں پڑ گئے

(ص:154)

خوفِ خلقِ خدا بھی خدا خوفی کے پہلو بہ پہلو ضروری ہوا کرتا ہے۔ بصورتِ دیگر سفاکیت کے فروغ پانے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ ان کا یہ پیغام ادب برائے زندگی کے زمرے کا حامل ہے جس میں انسانیت کا احترام سکھایا جا رہا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ دوسروں سے خدمت لینے کی بجائے خود کام کرنے کو ترجیح دے۔ انسانیت کی عظمت کی معراج اسی میں ہے۔ بنی نوعِ انسان دنیا میں آنے کے بعد اس حقیقت کو قطعاً فراموش کر چکا ہے کہ اس کی آفرینشِ حیات کا مقصدِ اولیٰ کیا ہے۔

خلقِ خدا کا خوف بھی رکھیں خدا کے ساتھ
کہنا یہ چاہتی ہوں بڑے احترام سے
کیا بات ہے کہ آپ اپاہج نہیں مگر
دھلوا رہے ہیں ہاتھ کنیز و غلام سے
الجھا لیا ہے لفظوں کی دنیا نے شاہدہؔ
دنیا میں آئی تھی میں کسی اور کام سے

(ص:155)

حضرتِ انسان حیات و کائنات کے جھمیلوں میں یوں کھو کر رہ گیا ہے کہ اسے اپنی ذات کی بازیافت کے عمل کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ مصائب و آلام کے باعث وہ شدید نوعیت کی تحلیل نفسی کا شکار ہے۔ یہ صورتِ حال اسی وقت پیش آتی ہے جب انسان اپنی ذات سے انحراف کرتا ہے۔ بقول راقم:

مجھے خود سے ملنے کی فرصت نہیں ہے
حقیقت میں خود سے محبت نہیں ہے

پھر زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب انسان کو اپنی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی

کیفیت کچھ شاہدہ لطیف کی بھی ہے۔

میں کھو گئی ہوں یہیں شاہدہ لطیف کہیں
چلو اب اپنی خبر ڈھونڈتی ہوں شہر کے بیچ

(ص:156)

ان کا کمالِ فن یہ بھی ہے کہ وہ مشکل قوافی کو بہ حسن وخوبی بروئے کار لاتی ہیں۔مختصر،متوسط اور طویل نوعیت کی ردیفوں کا استخدام بھی فطری پیرائے میں ملتا ہے۔ان کی یہی خصوصیت انہیں معاصر شاعرات سے ممتاز ومنفرد کرتی ہے۔

توکل واستغنا اور درویشی ان کی شخصیت کے اوصافِ حمیدہ ہیں اگرچہ چہار سو ظلمتوں کا راج ہے اور تاریکیوں نے اپنی دہشت پھیلا رکھی ہے مگر وہ رجا کی شمعیں فروزاں کیے ہوئے ہیں جنہیں وہ غنیمت خیال کرتی ہیں۔اپنے وطن سے وہ بے انت محبت کرتی ہیں۔وطن کی خاک کو وہ عافیت آمیز ردا گردانتی ہیں۔ جسے وہ روح پرور سمجھتی ہیں اور انہیں کوئی خلعت زیبا نہیں ہے۔وہ وطن کے پرچم کو ردا سمجھتی ہیں۔ان کے نزدیک یہی مغتنم ہے۔

اندھیری شب ہے مگر اے خدائے عز و جل
مرے لیے مرے دل کا دیا ہی کافی ہے
برائے روح یہی خاک ہے ردا میری
برائے قلب وطن کی فضا ہی کافی ہے
نہیں ہے شاہدہ پوشاک اور کوئی عزیز
یہ سبز رنگ کی روشن ردا ہی کافی ہے

(ص:157)

وطن سے محبت کا ایک اور انداز ان کے ہاں ملاحظہ کریں:

چاہے تو خوں کا آخری قطرہ نچوڑ لے
اے میری سرزمین تجھے اختیار ہے

کب شاہدہ میں قرضِ وطن کر سکوں ادا
اس ساعتِ حسیں کا مجھے انتظار ہے

(ص:158)

شاہدہ لطیف کی شخصیت میں متانت وسنجیدگی کے پہلو بہ پہلو ادب واحترام کے خصائص بھی پائے جاتے ہیں۔اس لیے ان کے ہاں ایک تہذیب بھی ہے اور وضع داری بھی ہے۔وہ اپنے بزرگوں کو عصرِ جدید کا اثاثہ قرار دیتی ہیں اور گویا ہیں کہ ان خمیدہ کمر کے حامل لوگوں کا احترام کیا جائے،انہیں عزت وتوقیر سے نوازا جائے۔

ان کے ہاں سماجی رویوں پر بھی ایک ردعمل کی صورت پائی جاتی ہے۔وہ نازیبا رویوں کو سخت ناپسند کرتی ہیں اور کسی کا اپنی تعریف خود کرنا بھی معیوب لگتا ہے۔یہ ایک ایسی خوبی ہے جو ہر عظیم شخص میں پائی جاتی ہے۔حضرت علامہ اقبال کے سامنے جب ان کی تعریف کی جاتی تھی تو غصے کے باعث ان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو جایا کرتا تھا۔عصرِ حاضر کا المیہ یہ ہے کہ آج کل اپنی تعریف خود کرنا بھی معمول کا ایک رویہ بن چکا ہے۔

سچ پوچھ یہ اثاثہء عصرِ جدید ہیں
میرے بزرگ لوگ خمیدہ کماں سے لوگ
کیا کیا ستم ظریفیء حالات دیکھیے
تعریف اپنی کرتے ہیں اپنی زباں سے لوگ

زندگی حسنِ توازن سے عبارت ہوا کرتی ہے۔کچھ لوگ افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اور کچھ راہِ اعتدال اختیار کرتے ہیں۔جو راہِ اعتدال اختیار کرتے ہیں،ہمیشہ فائدے میں رہتے ہیں۔ہمیشہ وہی لوگ کامیاب وکامران رہتے ہیں اور سماج میں عزت وتوقیر حاصل کرتے ہیں۔جنوں وخرد دونوں کا ساتھ نبھاتے ہیں۔بقول راقم:

اس لیے تو ہے بے باک میرا جنوں
مجھ کو بخشی گئی ہے نڈر آگہی

کچھ اسی طرح کا معاملہ محبت اور دنیا کے حوالے سے بھی ہے۔ کچھ لوگ صرف ایک طرف جھکاؤ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ناکام و نامراد رہتے ہیں۔ جو دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی ہے۔ اسی توازن کا رنگ شاہدہ لطیف کے ہاں دیکھیے۔

کچھ عزیز لوگوں کو یہ شرف بھی حاصل ہے
صاحبِ جنوں بھی ہیں، صاحبِ خبر بھی ہیں
اک طرف محبت ہے، اک طرف ہے یہ دنیا
نصف ہم ادھر بھی ہیں، نصف ہم ادھر بھی ہیں

مشمولہ استشہادات و استخراجات شاہدِ عادل ہیں کہ شاہدہ لطیف ادب کی مقصدیت کی قائل ہیں۔ وہ اسے محض تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتیں بلکہ اسے زندگی کے لیے سبق آموز بنانا چاہتی ہیں۔ وہ ایک ایسے ادب کی تخلیق چاہتی ہیں جس میں قاری کے لیے اکتسابِ فیض کا ساماں موجود ہو۔ جو اسے زندگی کرنے کے ہنر سے آشنا کرے اور وسعتِ ادراک میں معاون ثابت ہو۔ اس لیے وہ ادب برائے زندگی کی سنجیدگی سے قائل و مائل ہیں۔

شاہدہ لطیف اور عصری رویے

اقلیمِ سخن عصری رجحانات ومیلانات اور رویوں سے ہم آہنگ ہوا کرتی ہے۔ یہ رویے جغرافیائی اعتبار سے متنوع بھی ہوتے ہیں اور ان میں ہمہ گیری کی فضا بھی ممکن الوقوع ہوسکتی ہے۔ ہر عہد اپنے تخلیق کاروں پر اپنے اثرات مرتسم کرتا ہے اور ایک بالیدہ فکر سخنور اپنے عہد پر اپنے اثرات مرتب بھی کرتا ہے۔ گویا دونوں میں ایک اثر پذیری کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ جس سخنور کے ہاں بھرپور عصری رویے نمایاں ہوں، اس کا کلام مقامِ اعتبار اور نگاہِ استحسان کا مستحق قرار پاتا ہے۔ گویا ایک اچھا اہلِ سخن روحِ عصر کا نمائندہ ہوا کرتا ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے سخن کا تجزیہ عصری رویوں کے تناظر میں کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کے پانچویں شعری مجموعہ ''محبت ہو نہ جائے'' مطبوعہ جون 2006ء کے نصف دوم کے حوالے سے کر رہے ہیں۔ مجموعہ ھذا میں حمد ونعت، آزاد نظمیات اور زیادہ تر غزلیات شامل ہیں۔ ہم ان کی منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ برائے استشہادات واستخراجات لائیں گے۔ مذکورہ موضوع کے پہلو بہ پہلو دیگر فکری وفنی معاملات بھی زیرِ بحث آئیں گے۔

شاہدہ لطیف کے ہاں متنوع ومستقل نوعیت کے عصری رویے کارفرما نظر آتے ہیں۔ ان رویوں میں کچھ متغیر اور ہمہ گیر نوعیت کے رجحانات بھی بہار افشانی کر رہے ہیں۔ وہ مثبت طرزِ فکر کی شاعرہ ہیں۔ اس لیے اگر انہیں دائیں بازو کی شاعرہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ مثبت اقدار وروایات کے احیا کی قائل ہیں اور ان کی تجدیدِ نو چاہتی ہیں۔ وہ اپنے سماج میں مثبت افکار کی آبیاری کی خواہاں ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ایسے لوگ کامیاب وکامران بھی ہوتے ہیں اور خوش

وخرم بھی رہتے ہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے اپنے سخن میں کچھ رموز وعلائم کا استخدام انتہائی عمدگی سے کیا ہے۔اس حوالے سے وہ مظاہرِ فطرت اور فطری نوعیت کی امثال کو بروئے کار لاتی ہیں ۔کبھی وہ پیڑ اور ثمر کی علامتوں کا التزام کرتی ہیں۔ یوں اپنے شعری موقف کو باور کراتی ہیں کہ مثبت سوچ کے حامل افراد پر تمکنت زیست بسر کرتے ہیں۔ان کے برعکس لوگ پریشان وملول اور ناکام ونامراد رہتے ہیں ۔اسی پسِ منظر میں ان کی غزل کا ایک شعر دیکھیے جوکہ بحر سریع مثمن مخبون مکسوف میں کہا گیا ہے۔ اس کے عروضی ارکان"مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن'' ہیں۔ یہ ایک مرکب مزاحف بحر ہے۔

جنہیں پیڑ کو اگانے کا شعور ہے وہ خوش ہیں
جو نہ پا سکے ثمر کو وہی ہاتھ مل رہے ہیں

(ص:73)

محبت کائنات کا سب سے بڑا اور عالمگیر عصری رویہ ہے اور محبت میں لمحہء وصال کی آرزو خود میں بے پناہ شدتِ وحدت رکھتی ہے مگر اس کے حصول کے لیے کبھی کبھی اظہاری بیانیے کی ضرورت ہوتی ہے جس کی مقتضیات میں احوالِ دل کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر جراتِ اظہار نہ ہو تو لمحہء وصال کی آرزو محض ہی رہ جاتی ہے جو انسان سے ہمیشہ دست وگریباں رہا کرتی ہے۔اسی حوالے سے شاہدؔہ لطیف کی غزل کا ایک مطلع شاملِ شذرہ ہے جو بحر ہزج مثمن مقبوض میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن'' ہے۔ واضح رہے کہ ''مفاعلن'' مفاعیلن کی مقبوضی حالت ہے۔

گرفت میں وہ لمحہء وصال آ نہیں سکا
ہمارے لب پہ اپنے دل کا حال آ نہیں سکا

(ص:78)

اس جہانِ آب وگل میں کارِ ابلیس جاری وساری ہے۔خیر وشر کی قوتیں برسرِ پیکار ہیں۔کبھی خیر غالب آجاتا ہے تو کبھی شر مستولی ہوجاتا ہے۔مگر اخروی سرخروئی خیر کے حصے میں آتی ہے۔شر

کے کردار وقتی بالا دستی کے باوجود صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتے ہیں ۔اور تاریخ انہیں قصہ پارینہ سمجھ کر ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیتی ہے۔جبکہ اس کے برعکس خیر کے کردار لافانی اور ابدی ہوتے ہیں جنہیں تاریخ ہمیشہ اپنے اوراق کی زینت بنا کر رکھتی ہے۔شاہدہ لطیف کا شمار اہلِ خیر میں ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے حصے کی شمعیں فروزاں رکھتی ہیں۔ یہی تسلسل انہیں تگ و تازِ حیات ودیعت کرتا ہےاور وہ سعیٔ پیہم سے مربوط رہتی ہیں۔یہی ان کی کامیاب کا راز بھی ہے۔

ہر رہ گزر پہ شمع جلاتے چلے گئے
اک روشنی سی ہر سو بچھاتے چلے گئے

(ص:79)

سماج میں طاغوتی طاقتیں سرگرمِ عمل ہیں اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے درپے ہیں ۔رسوائی کو اہلِ حق کا مقدر بنانا چاہتی ہیں۔ان کی خواہش ہے کہ انہیں انصاف سے محروم کر دیا جائے مگر اہلِ جسارت اپنے حق پر کسی نوع کا سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے۔بھرپور مزاحمت کے بعد غلبہ اور کامیابی حاصل کرتے ہیں۔اسی عصری رویے کی ترجمانی شاہدہ لطیف کی زبانی کچھ یوں ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم میں ان کی غزل کا مطلع قابلِ ذکر ہے۔

مری رسوائی کو مقسوم رکھنا چاہتا ہے وہ
مجھے انصاف سے محروم رکھنا چاہتا ہے وہ

(ص:83)

ان کا وصفِ خاص یہ ہے کہ وہ انتقامی رویوں سے مبرا و ماورا ہیں اور صلح پسند طبیعت کی مالک ہیں ۔یہیں ان کی عظمت کی معراج بھی ہے۔اگر نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ ایغو کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں ۔یہ وہ مقامِ انسانیت ہے جہاں انسان اپنی ذات کی نفی کرتا ہےاور دوسروں کی فلاح و خیر خواہی چاہتا ہے۔اس مرتبے پر پہنچنے کے بعد ہی انسان اشرف المخلوقات کے شرف کا اہل قرار پاتا ہے۔وہ اپنے قاری کو زندگی کی تمام تر مصلحتوں سے آشنا کرتی ہیں۔ترسیلِ ادراک کا یہ عمل تواتر سے ان کے ہاں روبہ کار رہتا ہے۔حتیٰ کہ وہ اپنے قاری کو گفتگو کا قرینہ بھی سکھا دیتی

ہیں ۔اسے زندگی کرنے کے رموز سے ہم آہنگ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔اعلیٰ وارفع سخن کے یہی خصائص ہوا کرتے ہیں۔

گر ظلمتوں سے لینا پڑے تم کو انتقام
تم روشنی بکھیرو، جہاں میں ضیا کرو
سب کی سنو یہ دانشِ فن کا سوال ہے
خاموش انجمن میں ہمیشہ رہا کرو

(ص:85)

شاہدہ لطیف اپنے قاری کو خود کفیل اور ذمہ دار دیکھنا چاہتی ہیں کیونکہ وہ زندگی اپنے بھروسے پر گزارنے کی قائل ہیں نہ وہ خود کسی کی دستِ نگر بننا چاہتی ہیں اور نہ ان کی خواہش ہے کہ کوئی ان کا دستِ نگر بن کر رہے۔حقیقت میں یہی باشعور زندگی کا منشور ہوا کرتا ہے۔بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں کہا گیا ان کا مقطع لائقِ توجہ ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن مفاعلن فعلن''ہیں۔

ہر کوئی اپنا غم سہے خود ہی
ہر گھڑی شاہدہ یہ کہتی ہے

(ص:86)

ایک عصری رویہ یہ بھی ہے کہ بسا اوقات انسان بیم و یاس کا شکار ہو جاتا ہے۔اس کی تلخ حقیقت پسندی رجائی شمعوں کو گل کر دیتی ہے حالانکہ انسان کو''لاتقنطوا من رحمۃ اللہ'' کے ارشادِ خداوندی پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔فطرت اور مظاہرِ فطرت انسان کے محافظ و معاون ہوا کرتے ہیں۔اسی نوع کی خیال آرائی ذرا ان کے ہاں ملاحظہ کریں۔

یہ بے گھری کے فسانے کہاں سے نکلے ہیں
سروں پہ پھیلے ہوئے آسماں کے ہوتے ہوئے

(ص:87)

انسان کو زندگی میں ہر نوع کے حالات و واقعات کے لیے تیار و مستعد رہنا چاہیے اور کامیاب زندگی گزارنے کا دستور بھی یہی ہے جو ہمیشہ یہی روش اختیار کرتے ہیں، وہ کبھی بھی پریشان و مضطرب نہیں ہوا کرتے۔ زندگی کو جس بھی زاویے سے دیکھا جائے تو یہ محبت کی روشنی ہے۔ محبت کا دائرہ کار بسیط و عریض ہے۔ یہ صرف مجاز تک محدود نہیں ہے بلکہ آفاق تک پھیلا ہوا ہے مگر کبھی کبھی زندگی ظلمتوں اور صعوبتوں کا شکار بھی ہو جایا کرتی ہے۔ یہ بھی زیست کے اطوار میں سے ایک طرز ہے۔ گویا شاہدہ لطیف نے ایجاز و اختصار کے تقاضے نبھاتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی سعیِ مشکور کی ہے اور زندگی کو ایک جامع تعریف سے بھی نوازا ہے۔

مانا کہ زندگی ہے محبت کی روشنی
ہوتی ہے ظلمتوں میں بسر بھی کبھی کبھی

(ص:89)

آزادی ایک بہت بڑی خدا داد اور ایک عظیم نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ آزادی کی حقیقی قدر و قیمت صرف غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اقوام جانتی ہیں لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہمارے سماج میں کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو آزادی کے بنیادی مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ اس سے ہماری مراد ہمارے معاشرے کا ناخواندہ طبقہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ ناخواندہ حضرات و خواتین تو خلوص و مروت کا استعارہ ہوا کرتے ہیں۔ ہماری مراد ہمارے غیر مخلص احباب ہیں جو وطن سے مہر و وفا کا جذبہ نہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں ہم ایک واقعہ رقم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ ہماری حب الوطنی ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ایسے افراد جو وطن سے غیر معمولی محبت نہیں رکھتے، ان کے اندر اپنے پیارے دیس کی الفت کا بیج بو یا جائے جو ایک دن ایک تناور درخت ہو گا جس کے ٹھنڈے سائے میں ہماری آئندہ نسلیں استراحت محسوس کریں گی۔ قارئین کرام! واقعہ یہ ہے کہ ایک دن یومِ آزادی کے باسعادت موقع پر ہمیں ایک پروفیسر صاحبہ کی کال آئی۔ ہم نے حسنِ اتفاق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں یومِ آزادی مبارک کہہ دیا۔ ہمارے ان بابرکت الفاظ کو سن کر موصوفہ آگ بگولہ ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ ہم آزاد ہیں یا نہیں۔ پھر وہ خاتون مسلسل

غربت، مہنگائی، لاقانونیت اور دہشت گردی جیسے عالمگیر مسائل پر محوِ گفتگو ہوئی۔ ہمیں اس کی گفتگو سخت ناپسند ہوئی۔ ہمارے اندر کے پاکستانی اور عسکری خون نے جوش مارا اور پھر ہم گویا ہوئے کہ کاش! آپ مقبوضہء کشمیر، فلسطین یا بوسینیا میں ہوتیں اور دشمن کی افواج آپ کو تواتر سے مشقِ ستم بناتی تو پھر آپ کو معلوم ہوتا کہ آزادی کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے۔ ایک لاکھ سے زائد سرکاری مشاہرہ لینے والی ملازمہ کو مہنگائی کا شکوہ زیبا نہیں ہے۔ پھر وہ پروفیسر صاحبہ ہم سے مسلسل معافی مانگ رہی تھی مگر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک ہمارے غصے کا مکمل کتھارسز نہیں ہوتا، اتنے تک ہم آپ کو معاف نہیں کر سکتے۔ یہ صرف صحیح معنوں میں محبِ وطن احباب ہی بتا سکتے ہیں کہ ہمارا یہ طرزِ عمل کیسا تھا؟

جنہوں نے فطرت کے خوبصورت پرندوں سے لطفِ آزادی مشاہدہ کیا ہو اور ان سے نغماتِ آزادی سنے ہوں، وہ بھلا کیسے آزادی جیسی روح پرور نعمت کو فراموش کر سکتے ہیں۔

پرندے اڑ کے بتاتے ہیں لطفِ آزادی
طیورِ شوق کی تانیں اڑانے لگتے ہیں

(ص:91)

عصری رویوں میں تغیرات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ لامحالہ طور پر دوہرے رویے بھی سامنے آتے ہیں جو کمزور شخصیت و کردار کی عکاسی سے عبارت ہیں۔ جنہیں وہ سخت ناپسند کرتی ہیں۔ زمانہ لاکھ تبدیل ہو جائے، کچھ مستقل مزاج لوگ نہیں بدلتے۔ وہ اہلِ جہاں کے نازیبا رویے اختیار نہیں کرتے۔

لوگ پل بھر میں بدل لیتے ہیں چہرہ اپنا
شاہدہ ہم بھی بدل جائیں گے ممکن تو نہیں

(ص:97)

شاہدہ لطیف کا سخن رجائی جذبات و احساسات کا مخزنِ بے بہا ہے۔ ان کے ہاں امید کی شمعیں ہر وقت فروزاں رہتی ہیں۔ ان کے اظہاری بیانیے میں فطری رموز و علائم کو خصوصی اہمیت

حاصل ہے۔اس حوالے سے وہ مظاہرِ فطرت کا استخدام عمدگی کے پیرائے میں کرتی ہیں۔ان کے ہاں کلاسیکی شاعری کے بہار یہ خصائص بھی ملتے ہیں جن میں جمالیاتی احساس بہار افشانی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اسی فکر کا مظہر ان کی غزل کا یہ مطلع ہے۔

کوئی گلاب کسی شاخ پر کھلا تو رہے
خزاں کی رت میں تمنا کا سلسلہ تو رہے

(ص:99)

اہلِ دنیا ظاہر پر یقین رکھتے ہیں اور باطنی معاملات سے بے خبر ہوتے ہیں۔بصیرت کی بجائے بصارت کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ بصیرت کا ادراک کرنے کے لیے جس فہم وشعور کی ضرورت ہوتی ہے، اہلِ جہاں اس سے بے بہرہ ہیں۔بحر ہزج مثمن سالم میں ان کا یہ شعر دیکھیے۔

بظاہر جن کو یہ دنیا دکھائی بھی نہیں دیتی
ان آنکھوں میں بھی بینائی ہے لیکن کون مانے گا؟

(ص:101)

جہانِ سخن کا سب سے بڑا موضوع احترامِ آدمیت ہے جو خلوص و وفا سے مربوط ہے اور روحِ الفت سے وابستہ ہے۔انہوں نے انہی عوامل کو استفہامیہ انداز میں اجاگر کیا ہے جس سے ان کے کلام کا فلسفیانہ اور نفسیاتی گراف بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔بحر ہزج مثمن سالم میں یہ شعر ملاحظہ کریں۔

وفا کیا چیز ہے اور احترامِ آدمیت کیا؟
تمہیں ہم کیا بتائیں روحِ الفت کس کو کہتے ہیں؟

(ص:110)

شاہدہ لطیف نفسا نفسی کے اس عہدِ ناپرساں میں بھی مطلب پرستی اور خودغرضی جیسے سماجی عوارض سے مبرا وماورا ہیں کیونکہ وہ انہی عناصر کو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتی ہیں۔عہدِ موجود کا انسان جو سفاکیت کی تمام حدود و قیود کو پھلانگ چکا ہے اور سماج میں جنگل کا قانون رائج

العمل ہے۔ سنگین عصری صورت حال کے اسباب وعلل میں بے حسی اور خودغرضی بنیادی تلازمات میں شامل ہیں۔

ذات کی جنگ نے کیا کیا نہ اٹھائے طوفاں
ظلم انسان نے انسان پہ ڈھائے کیا کیا

(ص:125)

عصری رویوں کے ضمن میں سماجی رواجوں اور عمرانی رشتوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جن میں خلوص و وفا معدوم ہے۔ دوہرے معیار کی روش عام ہے۔ خون سفید ہو چکے ہیں۔ رشتوں میں اب اخلاص باقی نہیں ہے۔ دھوکہ دہی اور منافقت کا چلن عام ہے۔ انہی احساسات سے وہ اپنے قاری کو باخبر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس سے اس امر کا بخوبی ادراک ہوتا ہے کہ وہ اپنے قاری سے کس درجہ مخلص ہیں۔

رواجوں میں روا داری بہت ہے
یہاں رشتوں کی بیماری بہت ہے
کہیں پہچان میں دھوکہ نہ کھانا
کہ چہروں پر ریاکاری بہت ہے

(ص:134)

ان کے ہاں یقین اور اعتماد کی ایک فضا پائی جاتی ہے جو ان کی کامیابی کی دلیل بھی ہے مگر اس مقام پر پہنچنے کے لیے انہیں بہت سی قربانیاں بھی دینا پڑی ہیں۔ ان تمام معاملات کا اظہار ان کے ہاں شاعرانہ تعلیات کے صدور کی صورت میں ہوا ہے۔

خدا کے فضل سے حاصل سدا عروج رہا
ہماری سوچ کے سورج کو کب زوال آیا ؟
ہنر کی دولتِ بے مثل یوں ہی نہیں پائی
جلا ہے خونِ جگر تب کہیں کمال آیا

اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کا ادراک صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور تمام فیصلوں کا اختیار اس کے قبضہء قدرت میں ہے۔ وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ خیر وشر کی تمام طاقتیں اس کے تصرف میں ہیں۔ کسی کے عمل دخل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسے اہلِ ایمان کے ہمہ گیر عصری رویے سے تعبیر کرنا چاہیے۔

خدا خود بستیوں کے فیصلے کرتا ہے حکمت سے
کسے آباد رکھنا ہے، کسے برباد رکھنا ہے

انسانیت کے دکھ درد اور احساسِ محرومی کے مداوے کی فکر ہی اصل میں انسان دوستی کی دلیل ہوا کرتی ہے کیونکہ یہ عظیم فریضہ بھی کچھ قربانیوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ بقول الطاف حسین حالؔی:

یہی ہے عبادت یہی ہے دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

انسانیت کی معراج یہ ہے کہ زندگی دوسروں کی خدمت کے لیے وقف کر دی جائے۔ اپنی ذات کے حصار میں مقید رہنا کوئی نیک عمل نہیں ہے۔

ہاتھ کتنے ہیں جو بے رنگ ہیں اس بستی میں
میں فقط اپنے لیے رنگِ حنا کیا مانگوں؟

(ص:143)

شاہدؔہ لطیف کی شعری کائنات میں عصری رویے وفور سے پائے جاتے ہیں۔ وہ تعمیری و فلاحی سوچ کی حامل ہیں۔ ان کے ہاں تنوع وتلون کے خصائص آشکار ہوتے ہیں۔ یکسانیت اور لایعنیت سے گریز کی شعوری ولاشعوری کاوشیں ہیں۔ ان کے افکارِ حیات وکائنات کا احاطہ کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں عصری رویوں کا عکس واضح اور بلیغ صورت میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا ان کا کلام روحِ عصر کی ترجمانی سے عبارت ہے۔

شاہدہ لطیف کا عمومیت آمیز سخن

جمہوری نظریہءتنقید یہی ہے کہ دنیا میں اکثریت عام انسانوں کی ہے جو عام انداز میں سوچتے اور اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ عمومی طرز کی سوچ اور عمومی اظہار کو ترجیح دیتے ہیں۔ جسے ہم عوامی سوچ اور عوامی طرزِ اظہار سے عبارت کر سکتے ہیں۔ عمومیت آمیز سخن سے مراد ایسا کام ہے جس میں فکری ولسانی اور صنائع بدائع کے اعتبار سے کسی نوع کی دقیقہ سنجی نہ ہو۔ یہ ایک ایسا شعری اظہار ہے جو اکثر و بیشتر شعرا کے ہاں شاعری کے ہر دور میں کمی بیشی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس لیے عمومی شاعری کی اہمیت سے فرار کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہے۔

زندگی کے تمام شعبوں میں ہر عہد میں کچھ نہ کچھ نازیبا رویے فروغ پاتے رہتے ہیں جن کے ارتقا میں ناجائز معززین حضرات وخواتین کا کردار کلیدی ہوا کرتا ہے جن کا مقصد سستی شہرت کا حصول اور ذاتی نمود و نمائش بھی ہوتا ہے۔ عمومی شاعری کی ناپسندیدگی کے اسباب و علل میں بھی یہی عوامل روبہ کار ہیں۔ بہت سے احباب اس معاملے کی تفہیم سے خود کو عاری سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو قطعی طور پر فراموش کر دیتے ہیں کہ شاعر کسی خاص طبقے کا علمبردار نہیں ہوتا بلکہ پورے سماج کی نمائندگی پر مامور و متعین ہوتا ہے۔ بہت سے حضرات جن میں شاعر و نقاد اور قارئین بھی شامل ہیں، اس حوالے سے ہمیں بہ حیثیت شاعر و نقاد نگاہِ اعتراض سے دیکھتے ہیں، آپ اسے ہماری خامی خیال کریں یا ہماری خوبی پر محمول کریں، یہ آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔ آپ کو فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے کیونکہ ہم کسی بھی موضوع، طرزِ اظہار اور حوالے کو حقیر نہیں سمجھتے۔ ہیچ چیز بدوں مصلحت نیست، ہمارے نظریے کی اساس یہی ہے۔

کسی بھی مذہب کے قوانین یا کسی ریاست کے دستور کو ملاحظہ کریں تو اس میں عام آدمی کی فلاح و بہبود اور خیر خواہی کو اساسی اہمیت حاصل ہے تو پھر ایک شاعر، ادیب اور نقاد کے ہاں عام آدمی کے حوالے سے عمومی مواد کو ترجیح کیوں نہیں دی جاتی۔ ہماری عمومیت پسندی ہمیں اس حوالے سے ایک واقعہ رقم کرنے مجبور کر رہی ہے جسے اگر ہم نذرِ قارئین نہ کریں تو ہم خود کو قصوروار ٹھہرائیں گے۔ لہٰذا ہم خود کو نردوش ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہمیں کسی کام کے سلسلے میں ایک شاعر دوست کے ہاں جانا پڑا جو خود کو ایک بالیدہ فکر شاعر شمار کرتے ہیں۔ خود کو ادبی نقاد تو نہیں لیکن ادبی دانشور ضرور سمجھتے ہیں۔ وہ ایک شعری مجموعہ کی اشاعت کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ہمیں کتاب کے مسودے کا پرنٹ دکھایا اور کہنے لگے کہ ہم ابتدائی دس غزلیات کو کتاب میں شامل کرے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ جب ہم نے ان دس غزلیات پر نظر دوڑائی تو ہمیں ان میں فکری و فنی حوالے سے معائب معدوم نظر آئے۔ پھر ہم نے موصوف سے استفسار کیا کہ آخر آپ ان دس غزلیات کو شامل کیوں نہیں کرنا چاہتے؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس لیے شامل نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ عمومی نوعیت کی شاعری ہے۔ پھر ہم نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ سماج میں عام آدمی کے وجود اور کردار سے انحراف کرتے ہیں؟ اگر ہمارے معاشرے میں عام آدمی ناگزیر ہے تو شاعری میں اس کے حوالے سے مواد کا ہونا بھی اہم ہے۔ خدارا اپنے آپ پر بھی ترس کھائیں اور اپنے ادب پر بھی رحم کریں۔ اس نوع کے رویوں سے اجتناب کریں۔ اگر ادب میں عام آدمی کے حوالے سے مواد کی گنجائش نہیں ہے تو پھر ادب بھی ادب کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتا۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے عمومیت آمیز سخن کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ اس تناظر میں ہم ان کے اولیں شعری مجموعہ ''معجزہ'' مطبوعہ فروری 1999ء کے نصف اول کی منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ برائے استشہادات و استخراجات لائیں گے۔ مذکورہ موضوع کو ملحوظِ خاطر رکھنے کے پہلو بہ پہلو دیگر فکری و فنی تناظرات بھی بروئے کار لائیں گے۔

شاہدہ لطیف نے بھی لایعنیت آمیز جدیدیت کی بھینٹ چڑھنے کی بجائے عمومی طرزِ اظہار

کو ترجیح دی ہے۔ان کے ہاں عام آدمی کی جیتی جاگتی زندگی مکمل طور پر سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ان کے ہاں عام آدمی کے دکھ درد اور مسائل بھی ہیں اور عمومی طرزِ طرب بھی پایا جاتا ہے۔ روزمرہ حیات کی رنگینیاں بھی ہیں اور سنگینیاں بھی مشاہدہ کی جاسکتی ہیں۔انہوں نے اپنے شعری کینوس میں عام آدمی کو نظرانداز نہیں کیا بلکہ پورے طور پر اس کی نمائندگی کی ہے۔

عمومی رومانویت میں عمومی نوعیت کے داخلی احساسات ہوتے ہیں۔محبوب کی ایک نگاہِ التفات سارے ماحول کا منظرنامہ تبدیل کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔اس کا لمس موسم کی بہار افشانی سے عبارت ہوا کرتا ہے اور وہ آنکھوں کے ذریعے دل میں اُتر جانے کا فن جانتا ہے۔اس کی دیرپا رفاقت کی بدولت خوشبو روح میں سرایت کرجاتی ہے۔

تھاما جو اس نے ہاتھ تو موسم نکھر گیا
آنکھوں کے راستے مرے دل میں اُتر گیا
میں اس کے ساتھ ساتھ بڑی دور تک رہی
وہ اجنبی تو روح میں خوشبو سی بھر گیا

(ص:25)

عصرِ حاضر میں سوچ کے زاویوں میں تفاوت کی فضا پائی جاتی ہے۔اگر کہیں سوچ میں یکسانیت آجائے تو وہ مزاج کی ہم آہنگی کی دلیل ہوا کرتی ہے جس کے باعث زندگی کے حوالے سے نظریات میں بھی مطابقت کی فضا پائی جاتی ہے۔اسی طرح اگر مقدر میں مماثلت کا پہلو پایا جائے تو سود و زیاں میں بھی یکسانیت در آتی ہے۔

سوچ یکساں ہے اس قدر اپنی
زندگی پر بیاں بھی ملتے ہیں
ایک سا شاہدؔہ مقدر ہے
دیکھ سود و زیاں بھی ملتے ہیں

(ص:27)

اگر عشقِ مجازی کے تناظر میں بات کی جائے تو عام طور پر شاعری میں محبوب کو مافوق الفطرت انسان کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی اسی دنیا کا باشندہ ہوتا ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس سے حد سے بڑھ کر پیار کیا جاتا ہے، وہ پورے جہاں سے نرالا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے خصائص ساری دنیا سے جدا نظر آتے ہیں۔ تمام محبتوں پر اس کی محبت غالب آ جاتی ہے۔ گویا وہ محبتوں کا مجازی خدا ہوتا ہے۔ اسی موضوع کو شاہدہ لطیف نے انتہائی عمدگی سے یوں نبھایا ہے۔

سارے جہاں سے تجھ کو جدا مانتے ہیں
اپنی محبتوں کا خدا مانتے ہیں

(ص:29)

محبت میں توازن متانت وسنجیدگی اور سمجھ داری کی علامت سمجھا جاتا ہے جس کا اہتمام ہر کہ و مہ نہیں کر پا لیکن محبت میں توازن کا مطلب محبت سے بے نیازی ہر گز نہیں ہے۔ محبت میں اعتدال کے اسباب و وجوہات میں محبوب کی شخصی آزادی کے پہلو کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے لیکن محبوب کے لیے محب سے مکمل بے نیازی کی بھی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔ اس عمومی جذبے کی ترسیل ان کے اس شعر ملاحظہ کیجیے:

کس نے کہا ہے تجھ سے مسلسل ہو التفات
لیکن کبھی کبھی تو ملاقات چاہیے

(ص:31)

انسان دوستی کے موضوع کو عمومی انسانی جذبات واحساسات میں خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ ایک تخلیق کار امن کا پیامی ہوتا ہے۔ خلوص و مروت اور ایثار و وفا اس کے خمیر میں شامل ہوتے ہیں۔ مگر وہ لوگ ایک خاص مروت کے مستحق ہوتے ہیں جو آپ کے حلقہء احباب میں شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کو اپنی عمرِ عزیز کا کچھ نہ کچھ حصہ ان رفقا کے لیے بھی وقف کرنا چاہیے۔

عمر کی پونجی لٹا دینا نہ اپنی ذات پر
کچھ نہ کچھ تو دوستوں کے واسطے رکھا کرو

(ص:33)

ابنِ آدم کا سب سے بڑا کرب سماجی بے حسی ہوا کرتا ہے جس کے باعث انسان کی آشاؤں اور تمناؤں کی دنیا ویران ہو جایا کرتی ہے۔ انسانی ذہن میں انواع و اقسام کے استفسارات اٹھتے ہیں کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ یہ استفہامیہ اشارات لوگوں کے عقل و شعور کے حوالے سے سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی خود غرضی اور مطلب پرستی کی جامع دلیل ہوا کرتے ہیں۔

عجب ویران ہے شہرِ تمنا
یہ کیسے لوگ ہیں کیا کر رہے ہیں

(ص:34)

جن لوگوں کے ظاہر و باطن میں تفاوت کی فضا ہوتی ہے، وہ لوگ کبھی مخلص نہیں ہوا کرتے۔ ان کے غیر مخلص ہونے میں سماج کا بھی بہت بڑا کردار ہوتا ہے جو نا قابلِ فراموش حیثیت کا حامل ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جن سے محبت کی جاتی ہے، اگر انہیں دوسروں کی طرف سے ترکِ آرزو کا مشورہ اچھا لگے تو یہ ان کے بے وفا اور بے مروت ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔

جن کو جانِ آرزو جانا تھا ہم نے شاہدؔہ
ان کو ترکِ آرزو کے مشورے اچھے لگے

(ص:37)

جھوٹ اور سچ دو ایسے موضوعات ہیں جو عمومی اور خصوصی دونوں اعتبار رکھتے ہیں۔ عمومیت اور خصوصیت کا تعین نوعیت کو سامنے رکھ کر کریں تو کیا جا سکتا ہے۔ ادب اور صحافت کی دنیا سے وابستہ افراد کے نزدیک جھوٹ اور سچ کی حقیقت ہی کچھ اور ہوتی ہے کیونکہ ان کا جھوٹ اور سچ ان کی ذات کی حد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ قارئین کا ایک حلقہء وسیع متاثر ہوتا ہے۔ جب اس طبقے

میں بھی جھوٹ کی روش عام ہو جائے تو پھر ایک فردِ واحد سچ کی پذیرائی میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔اس عمومی احساس کی جھلک ذرا شاہدہ لطیف کے ہاں دیکھیے۔

جب جھوٹ لکھنے والے ہی کہلائیں معتبر
ایسے میں کوئی حق کا پرستار کیا کرے؟
دستور سارے شہر کا جب ہو منافقت
پھر شاہدہ لطیف کا کردار کیا کرے؟

(ص:41)

ایک شاعر کو عام طور پر غم و الم کا استعارہ تصور کیا جاتا ہے اور اس کے درد و غم کو بوجھل ڈھلتی شام سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کیونکہ عمومی طور پر شاعر کی ظاہری و باطنی صورتِ حال اسی اندوہناک منظر کی عکاسی سے مملو ہوتی ہے۔انسان متنوع کیفیات کا حامل ہوتا ہے کیونکہ بسا اوقات تادیر فرصت میسر آنے سے بھی تھک جاتا ہے۔اگر کسی کام سے پالا پڑے تو زیادہ آرام کو ترجیح دیتا ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کسی حال میں بھی راضی نہیں ہوتا۔امر ھذا انسانی نفسیات کی پیچیدگی کی علامت ہے۔

ہم شاعر ہیں ہم جیسوں کی
بوجھل ڈھلتی شام بہت ہے
فرصت ہو تو تھک جاتے ہیں
کام ہے تو آرام بہت ہے

(ص:43)

انسان اپنی محبت کو پانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور طرح طرح کی تدابیر اختیار کرنے کی سعی کرتا ہے۔اس حوالے سے اس نے بہت سے سہانے خواب دیکھ رکھے ہوتے ہیں۔اس حوالے سے وہ کسی نوع کی قربانی سے بھی گریز نہیں کرتا اور ہر طرح کے رنج بھی اٹھاتا ہے۔اپنے مصائب و آلام جو کئی زمانوں پر محیط ہوتے ہیں، کا خود ہی ادراک رکھتا ہے۔وقت اسے ہر وقت

نئے گھاؤ لگاتا رہتا ہے مگر وہ ہر وقت مستقل مزاج ہی رہتا ہے۔

تجھ کو پا لینے کی تدبیریں ڈھونڈوں ہر سو
میں نے دیکھے ہیں ترے خواب سہانے کیا کیا ؟
میں نے آنکھوں سے تری ساری بلائیں لے لیں
رنج اٹھائے ہیں ترے واسطے جانے کیا کیا؟
میں ہی جانوں مجھے وقت نے کیا زخم دیے
مجھ پہ بیتے ہیں محبت میں زمانے کیا کیا؟

(ص:46)

عمومی رومانوی شعری رویے بھی عمومیت کا مظہر ہوا کرتے ہیں۔ محبوب کا روٹھنا ہر محب کو ناگوار گزرتا ہے کیونکہ محبوب کی ناراضی کے باعث انسان کے دل کی دنیا بے سکون اور مضطرب ہو جایا کرتی ہے۔ اسی احساس کی کارفرمائی ان کے ایک مقطع میں موجود ہے۔

تمہاری شاہدؔہ ہے بے سکوں پر
تمہارا روٹھنا اچھا نہیں ہے

(ص:47)

انسانی زندگی کی اساس اس کے خوابوں کی سچائی پر منحصر ہوا کرتی ہے۔ اگر خواب سچے ثابت ہو جائیں تو تعبیر بھی معتبر سمجھی جاتی ہے۔ مقسوم اور مقدر بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کامیابی و کامرانی سے جادۂ منزل پر رواں دواں ہو جاتی ہے۔

مرے سب خوب سچے ہو گئے ہیں
مری تعبیر کتنی معتبر ہے

یہ ایک قطعی حقیقت ہے کہ جو انسان دوسروں کو کوئی دکھ درد دیتا ہے، اس کا پالا بھی غم والم سے ضرور پڑتا ہے۔ کیونکہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔ کشتِ حیات میں جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ اگر اچھائی کرو گے تو بدلے میں اچھائی ہی ملے گی۔ انسانی زندگی بے ثبات ہے۔ جو ایک بار یہاں

سے چلا گیا تو پھر اس کا دوسرا جنم اس دنیا میں نہیں بلکہ عقبیٰ میں ہوگا جس سے دنیا کی تا ابد ارزانی عیاں ہوتی ہے۔ یہ ایک پیغام ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنا سب کچھ اسی دنیا کو سمجھ بیٹھے ہیں اور اخروی زندگی سے بے نیازی اختیار کیے ہوئے ہیں۔

رلایا جس نے مجھ کو برسوں
وہ میرے سامنے کل رو گیا ہے
یہ دنیا کتنی ارزاں ہے ابد سے
یہاں واپس نہ آیا جو گیا ہے

ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی خواب ضرور ہوتا ہے اور یہ خواب اس کے حالات سے مطابقت کا حامل بھی ہوسکتا ہے عدم مطابقت کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ یہی خواب ہی تگ و تازِ حیات کا سبب ہوا کرتے ہیں۔ جن کی بدولت کاروانِ زندگی رواں دواں رہتا ہے۔

لوگوں کی آنکھوں میں جیسے
کوئی خواب سجا رہتا ہے

(ص:58)

بسا اوقات انسان زیست سے مستقل مایوس ہو جاتا ہے۔ پھر وقت کی اکائی کے تمام پیمانے صبح، دوپہر، شام، رات، دن، دیروز امروز اور فردا اسے پریشان وملول نظر آتے ہیں۔ بقول راقم:

جو میں مضطرب ہوں سماں مضطرب ہے
مجھے لگتا سارا جہاں مضطرب ہے

اسی کیفیت کی عکاسی شاہدہ لطیف نے کچھ یوں کی ہے۔

طلوعِ صبح ہو اپنی خوشی سے
مری قسمت میں ایسی شب نہیں ہے

(ص:62)

زندگی ایک تنہا سفر ہے جو صرف اپنے بھروسے پر ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ اس سفر میں خود ہی

گرنا ہوتا ہے اور پھر خود ہی سنبھلنا پڑتا ہے۔ کوئی مہربان و مخلص نہیں ہوتا۔ پھر اگر دھوپ کا تنہا سفر ہو اور راستے میں کوئی شجرِ سایہ دار بھی نہ ہو تو یہ صورتِ حال پریشان کن ہوتی ہے۔

کڑی دھوپ سر پر اور سفر تنہا ہمارا
کہ رستے میں کوئی سایہ شجر آتا نہیں تھا

(ص:63)

داخلی احساسات کے حوالے سے حضرتِ دل کا کردار مرکزی ہوا کرتا ہے اور دل اپنے فیصلے خود ہی کرنا چاہتا ہے۔ موقع محل کے مطابق حکمتِ عملی اختیار کرتا ہے۔ کبھی اس کے فیصلے صائب ہوا کرتے ہیں تو کبھی ہزیمت کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ کبھی حالات و واقعات توقع کے مطابق ہوتے ہیں اور کبھی امیدوں کے برعکس ہوتے ہیں۔ جہاں اظہار کا معاملہ ہے تو کبھی اظہارِ آسانی اور سہولت کا باعث بنتا ہے۔ کبھی مسائل و مشکلات سے دوچار کر دیتا ہے کیونکہ یہ محبوب کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر محبوب صلح جو طبیعت کا مالک ہو تو کسی نوع کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اگر محبوب کی ذات میں فخر و غرور کا عنصر شامل ہو تو وہ مددگار و معاون ثابت نہیں ہوتا۔ یہ شعر محبوب کے علاوہ دل کے حوالے کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔

اس لیے میں دل کی بابت آج تک خاموش ہوں
کچھ بھی اس کو کہہ دیا تو وہ خدا ہو جائے گا

(ص:70)

ایک محب کی دنیا محبوب کے اردگرد ہی گھومتی ہے۔ خیالِ یار اس کے لیے روشنی کی ترسیل کا ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے ایک عاشق مزاج انسان روشنی کے حوالے سے مظاہرِ فطرت کے استعاروں سورج، چاند اور ستاروں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ ان سے بے نیاز ہوتا ہے کیونکہ اس کے لیے چاند، ستارے روشنی کا ذریعہ نہیں بلکہ خیالِ یار ہی اس کی روشنی ہے۔

کوئی ستارہ، کوئی ماہتاب شرط نہیں
خیالِ یار کو ہم روشنی سمجھتے ہیں

(ص:74)

کسی بھی قوم کو اپنے آبی وسائل کی خود ہی حفاظت کرنی چاہیے۔ یہی وصف خودداری کی علامت بھی ہوتا ہے کیونکہ جو قومیں دوسروں پر انحصار کرتی ہیں۔ وہ کبھی کامیاب و کامران نہیں ہوتیں۔ ناکامی و نامرادی ان کا مقدر بن جایا کرتی ہے۔ زراعت جس کا انحصار آبی وسائل پر ہوتا ہے۔ جن کی افراط وتفریط زرعی شعبے کو متزلزل کر دیتی ہے۔ توازن ہی زندگی کے ہر شعبے کے تحفظ کا ضامن ہے۔ اگر آبی وسائل ضرورت سے زیادہ ہوں تو انہیں سنبھالنا مشکل ہو جایا کرتا ہے۔ پھر کسان، زمینیں حتیٰ کہ تمام معیشت غرقاب ہو جاتی ہے جس کا شاہدہ لطیف کو بخوبی احساس ہے۔

ہمیں اپنے سمندر کی حفاظت خود ہی کرنا ہے
اگر ملاح مانگے ہوں ادھارے ڈوب جاتے ہیں
مجھے شاہدہ غم ہے تو بس اپنے کسانوں کا
زمینیں ڈوب جائیں تو بچارے ڈوب جاتے ہیں

(ص:77)

نفسا نفسی کے عالم نے اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا ہے۔ روایات دم توڑ رہی ہیں۔ انسانیت نوحہ کناں ہے۔ آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ شدید نوعیت کے احساسِ تنہائی کا ہے جس کے مداوے کی صورت نظر نہیں آتی۔ آج کا انسان ایک میکانی زندگی گزار رہا ہے۔ روحانیت مرگ کے دہانے پر ہے اور اپنی بساط لپیٹ رہی ہے۔ دنیا سے اچھے رسوم و رواج مفقود ہو رہے ہیں۔ سچے وقتوں میں لوگ بے سہارا شخص کا حال پوچھ لیا کرتے تھے۔ اب کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ شاہدہ لطیف نے ان معاملات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

کس طرح اب یہاں گزارا ہو
شہر میں کوئی تو ہمارا ہو
رسمِ دنیا ہے پوچھ لیتے ہیں
جب کوئی شخص بے سہارا ہو

(ص:78)

شاہدہ لطیف نے بھرپور نوعیت کی عمومی شاعری کر کے معاشرے کے عام طبقے کی عکاسی کی ہے۔ ان کے ہاں معیار و مقدار کے تلازمات بہ حسن و خوبی پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شعری کینوس کو ایک خاص طبقے تک محدود نہیں کیا بلکہ مکمل سماج کی ترجمانی کی ہے۔ جس سے ان کی انسان دوستی بھی اظہر من الشّمس ہوتی ہے۔ وہ وسیع ترفہم و ادراک رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کا فکری کینوس عمومی سخنوروں کی طرح محدود نہیں ہے بلکہ بسیط و عریض ہے۔ وہ اپنے ساتھ صرف ایک خاص طبقے کو لے کر نہیں چلتیں بلکہ عام لوگوں کی نمائندگی کو بھی ضروری خیال کرتی ہیں۔ یہی ان کی شخصیت، کردار اور فکر و فن کی معراج ہے۔

شاہدہ لطیف دائیں بازو کی شاعرہ

عام طور پر دنیا میں دو مکتبِ فکر پائے جاتے ہیں جن کے لیے دو اصطلاحیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ جو دائیں بازو اور بائیں بازو سے موسوم ہیں۔ دائیں بازو سے مراد ایسے لوگ ہیں جو مذہبی رجحانات ومیلانات رکھتے ہیں اور مثبت اقدار کے پاسدار ہیں۔ ان کے برعکس بائیں بازو سے مراد ایسے لوگ ہیں جو دین و مذہب سے بیزاری اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اشترا کی واشتمالی فلسفہء حیات کے قائل ہیں۔ یوں یہ دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ہیں جن کی نسبت دائیں بازو سے ہے اور وہ بائیں بازو والوں کو لادینیت پسند اور گمراہ خیال کرتے ہیں۔ دوسری طرف بائیں بازو والے خود کو دین و مذہب کی قید سے آزاد سمجھتے ہیں۔ وہ دائیں بازو والوں کو قدامت پسند اور جاہل گردانتے ہیں۔ انہیں ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ خود کو سرخ انقلاب کے علمبردار جانتے ہیں جبکہ دائیں بازو کے لوگ سبز انقلاب کے حامی ہیں۔ یعنی امن اور زرعی ترقی کے خواہاں ہیں۔

اگر ہم شاہدہ لطیف کی شاعری کا فکری تجزیہ کریں تو ہمیں دائیں بازو کی نسبت سے فزوں تر شواہد ملتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور مذہبی طرزِ فکر کی مالک ہیں۔ اس لیے وہ بھی دائیں بازو کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا منظوم حج وعمرہ کا سفرنامہ ''بیت اللہ پر دستک'' اور ان کے نعتیہ مجموعہ ''نگاہِ مصطفیٰ'' بھی اسی طرزِ احساس کے مظہر ہیں۔ شذرہ ھذا میں ہم ان کے نویں شعری مجموعہ ''خواب سونے نہیں دیتے'' کا جائزہ اسی تناظر میں لے رہے ہیں۔ اس حوالے سے ہم منتخب غزلیات کے منتخب اشعار برائے استشہادات و استخراجات لائیں گے۔

مذکورہ غزلیات کے پہلو بہ پہلو فکری وفنی اور لسانی تناظرات بھی زیرِ بحث لائیں گے۔

دائیں بازو کے لوگ مذہبی طرزِ فکر کے حامل ہونے کے باعث بہت سے اوصافِ حمیدہ کے مالک ہوتے ہیں کیونکہ توکل و استغنا اور صبر وایثار ان کی سرشت میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ مزاج میں نرم روی اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہوتے ہیں۔ حالات چاہے جس قدر بھی سنگین ہوں، وہ پھر بھی مسکراتے رہتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی غزل کا مقطع قابلِ غور ہے۔

مرے مزاج ہی میں شاہدہ ہے نرم روی
کوئی ملال ہو میں مسکراتی رہتی ہوں

(ص:16)

اہلِ حق صرف خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ طاقت و ناتوانی کو عطائے ایزدی سمجھتے ہیں۔ صرف اسی کی ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف اسی سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ یہی معاملہ شاہدہ لطیف کا بھی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے محوِ استدعا ہیں کہ مجھے ایسی طاقت عطا فرما کہ میری تمام مشکلات دور ہو جائیں۔ ان کا آمدہ شعر اسی احساس کا آئینہ دار ہے جس میں انہوں نے مشکلات کے حل ہونے کو درِ خیبر کے کھل جانے سے تعبیر کیا ہے۔

مجھ کو بھی ایسی ہی طاقت ہو میسر یارب
سایہ چھو جائے جو میرا درِ خیبر کھل جائے

(ص:17)

ایک سالک کا مقصدِ حیات رضائے ایزدی کا حصول ہوا کرتا ہے۔ جس کے لیے وہ سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوتا ہے کیونکہ اس کی سوچ یہی ہوتی ہے کہ سب کچھ کھو کر اگر خدا مل جائے تو یوں سمجھو کہ کچھ نہیں کھویا۔ کوئی خسارہ یا نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے اور یہ منفعت دنیا و عقبیٰ دونوں پر محیط ہوتی ہے۔ دائیں بازو کے لوگوں کے یہی جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔

ایک منزل ہے جہاں خود کو گنوا دینے پر

نفع ہی نفع ہے نقصان نہیں ملتا ہے

(ص:19)

اہلِ ایمان ہمیشہ صداقت کے داعی و حامی ہوتے ہیں اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لیے کذب کے فروغ کے حوالے سے کسی نوع کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اس لیے وہ سچ کی تلقین کرتی ہیں اور جھوٹ سے اجتناب کا مشورہ دیتی ہیں۔ یہ کوشش کبھی براہِ راست نوعیت کی ہوتی ہے تو کبھی بالواسطہ رنگ اختیار کرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نظامِ عدل کبھی کذب کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

تم جھوٹ کی بنیاد پہ تعمیر کرو قصر
ایسا تو کوئی حکم عدالت نہیں دیتی

(ص:21)

انسان کا خلوص اسی کی عمدہ شخصیت کا مظہر ہوا کرتا ہے جس کی بدولت وہ دوستوں اور دشمنوں دونوں کے دلوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ عدو اسے نقصان پہنچانے سے بھی خوف کھاتے ہیں۔ یہ وصفِ خاص فقط دائیں بازو کے لوگوں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اسی جذبے کی جھلک شاہدہ لطیف کے ہاں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

میرے دشمن کے بھی دل میں ہے محبت میری
ہاتھ رک جائے گا تلوار تک آتے آتے

(ص:23)

دنیا میں معرکۂ حق و باطل جاری وساری ہے۔ اہلِ حق اکثر و بیشتر طاغوتی طاقتوں کے زیرِ عتاب رہتے ہیں۔ ان کا اصل جرم صداقت وانصاف کی پاسداری ہوا کرتا ہے۔ صدق وصفا سے اظہار کرنا ان کی مثالی نوعیت کی محبت ہوتی ہے۔ خلوص و وفا کرنا ان کی سرشت میں شامل ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنے مکتبِ فکر سے مخاطب ہیں اور اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کررہی ہیں کہ آپ کو قطعاً پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں بھی اسی نوع کے حالات کا سامنا کررہی

ہوں۔

مجھے بھی جرمِ وفا کی کڑی سزا ہے ملی
وفا کے جرم پہ زیرِ عتاب میں بھی ہوں

(ص:24)

دائیں بازو کے افراد کو اہلِ دنیا کے ناز یباراویوں کی شکایت ہمیشہ رہتی ہے کیونکہ بائیں بازو کے لوگ نظامِ کائنات میں خلل ڈالنے کی کاوشوں میں مگن رہتے ہیں اور کارزارِ حیات کو فطری انداز میں چلنے نہیں دیتے۔ان کی اسی فطرت کی عکاسی انہوں نے کچھ یوں کی ہے۔

دنیا کی ہے فطرت کہ بہت شور مچانا
کرنے کا کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتی

(ص:25)

مثبت طرزِ فکر رکھنے والے ہمیشہ علم و ادب سے محبت رکھتے ہیں کیونکہ ان کی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔وہ علم و ادب دوست ہوتے ہیں۔وہ اہلِ علم اور ادب دوست طبقے کو محبوب جانتے ہیں۔ان کے برعکس مادیت کا خوگر طبقہ ان سے رسمی محبت رکھتا ہے جو خلوص و مروت سے عاری ہوتی ہے۔اس رویے کی ترجمانی ذرا ان کے ہاں دیکھیے۔

وہ جو رکھتے ہیں ادیبوں سے مراسم رسمی
صاحبِ علم نہیں صاحبِ زر ہیں صاحب

(ص:29)

بائیں بازو کے لوگ اخلاص و مروت کی بجائے خشک فلسفوں پر یقین رکھتے ہیں جو حقیقی معنوں میں انسان دوستی کا آدرش نہیں دیتے۔ان کے برعکس دائیں بازو کے لوگ بے جا منطق کی بجائے تاثیرات کی کیفیات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ان کا موقف یہی ہوتا ہے کہ بات میں اثر ہونا چاہیے اور دل میں اس کا گھر ہونا چاہیے۔بات میں اثر خلوص و مروت اور صدقِ نیت کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔

کوئی تو بات ہو ایسی کہ جو دل میں اتر جائے
بنا سر پیر کے کچھ فلسفے اچھے نہیں لگتے

(ص:39)

دائیں بازو کے لوگ صرف اپنی ذات کے حصار میں مقید نہیں رہتے ہیں۔وہ عالمِ انسانیت کی فکر کرتے ہیں۔ان کی فکر کے زاویے بہت وسیع ہوتے ہیں۔وہ ملک وملت کی حدود و قیود سے بھی بڑھ کر سوچتے ہیں کیونکہ انہیں پوری کائنات کا احساس ہوتا ہے۔اس لیے یہ لوگ خود غرض، مفاد پرست اور بے حس نہیں ہوتے بلکہ خلوص و وفا کا پیکر ہوتے ہیں۔انہی افکار کی روشنی غزل کے اس مطلع میں مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔

خیال و فکرِ غمِ کائنات کرتے ہوئے
گلوب سامنے رکھتی ہویں بات کرتے ہوئے

(ص:73)

اسی فکر کا تسلسل ان کے ایک اور شعر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جو در بہ در ہیں انہی کا ملال ہے ورنہ
میں آشیانہ بھی رکھتی ہوں ، میرا گھر بھی ہے

(ص:104)

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو روئے ہستی کا حسن و جمال دائیں بازو کے افراد سے وابستہ ہے جبکہ بائیں بازو کے لوگ سرخ انقلاب کے نام پر کرۂ ارضی پر فساد برپا کرتے ہیں۔جبکہ وہ دائیں بازو والوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ انہیں ایک بارِ گراں تصور کرتے ہیں۔تو اس منفی عمل کے ردِ عمل پر ایک سچے اور کھرے تخلیق کار کے ہاں مقامِ افسوس کے علاوہ کچھ نہیں رہتا۔

خدایا اس کو سنوارا بھی میں نے خود ہے مگر
تری زمیں پہ بارِ گراں بھی میرا ہے

(ص:114)

اسی احساس کا مظہر ان کا ایک اور شعر قابلِ ذکر ہے۔

پردۂ زیست پہ روشن ہوں ستارے کی طرح
سر سے پا تک ہوں میں تمثیل وفا کی صورت

(ص:124)

حقائق کی ترسیل و ترویج ایک بہت بڑا انسانی فریضہ ہے۔ اس مقدس مقصد کے لیے انبیا مبعوث کیے گئے۔ اولیاء کرام کو بھیجا گیا اور اب یہ ذمہ داری امتِ مسلمہ کی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عالمِ انسانیت کو حقائق سے روشناس کرا دیا جائے۔ اس لیے ہر فرد کی کوشش ہونی چاہیے کہ وہ اپنے حصے کا بھرپور کردار ادا کرے۔

حقائق کی تمنائی ہے دنیا
ہمیں کچھ تو بتانا ہی پڑے گا

(ص:125)

دائیں بازو کے احباب ہمیشہ عاجزی و انکساری کی جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں۔ ان میں کسی نوع کا غرور و تکبر نہیں ہوتا۔ ان کا یہی وصف ان کی عظمت کی معراج ہوتا ہے نہ انہیں عبادتوں اور ریاضتوں کا فخر ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ایک فقیر کی طرح خود کو عاجز و ناتواں خیال کرتے ہیں۔ یہ وصف انہیں مشیت سے ودیعت ہوتا ہے۔

نہ عبادتوں کی کلیاں نہ ریاضتوں کے غنچے
میں خدا کی بارگاہ میں تہی دست اک بھکارن

(ص:126)

شاہدہ لطیف کے ہاں فکر و خیال کی رعنائی کے پہلو بہ پہلو فکری حوالے سے جدت کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ ان کے ہاں باریک بینی ہے۔ ایک تیز قوتِ مشاہدہ ہے۔ ایک بالیدہ فکری ہے۔ ایک منطقیت ہے جو معقولیت و معروضیت کے ابواب وا کر رہی ہے۔ مردم شناسی کا فن خوب رکھتی ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں باہمت خیال کیے جاتے ہیں اور کامیاب و کامران رہتے ہیں۔

جو باوفا ہو اسی کی تلاش تھی مجھ کو
جو بے طلب ہو اسے پاسباں بنا لیتی

(ص:131)

سماج میں بہت سے نازیبا رویے پائے جاتے ہیں۔ ناانصافی کا وجود سماجی ناہمواریوں کو جنم دیتا ہے جس کے باعث معاشرے پر نالائق طبقے کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ ان کے خلاف آواز اٹھانا بھی دائیں بازو کے لوگوں کا ہی کام ہے۔ ہمارے ہاں اہل طبقہ اپنے استحقاق سے محروم رہتا ہے۔ نااہل افراد ناجائز طریقوں سے تمغات اور خطابات تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن نااہلی کی چبھن ان کے ضمیر کی خلش بن کر رہ جاتی ہے۔ یوں وہ داخلی طمانیت سے محروم رہتے ہیں اور خارجی سرشاری کا لطف اٹھاتے ہیں۔

نااہلیت کی چبھن ہے ضمیر پر
نادم ہیں لوگ تمغوں، خطابوں کے بعد بھی

(ص:134)

خدمتِ خلق دائیں بازو کے لوگوں کا شعار ہوا کرتا ہے۔ اسی میں ہی وہ فرحت و تمکنت محسوس کرتے ہیں۔ عوام الناس کی بھلائی و خیر خواہی کو وہ اولین ترجیح دیتے ہیں۔ اپنی ذات کی نفی کر کے خود کو فراموش کر دیتے ہیں۔ وہ نفسیاتی طور پر ایغو کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد ہی انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ منصب اعلیٰ تعلیم کی بدولت نہیں، بلکہ خلوصِ نیت کے باعث حاصل ہوتا ہے۔

ہم ایسے اہلِ درد بھی ہیں اس جہان میں
سب کچھ بھلا کے خلق کی خدمت میں پڑ گئے

(ص:154)

شاہدہ لطیف کی شخصیت و کردار پر مذہبی اثرات غالب ہیں۔ انسان دوستی کا ان کی ذات پر تسلط ہے۔ اس لیے ان کا اندازِ فکر بھی اجتماعی نوعیت کا ہے جس میں دائیں بازو کے لوگوں کی

خصوصیات رچی بسی ہوئی ہیں جس کے باعث وہ ایک فلاحی معاشرے کے قیام کے خواب کی تعبیر کی خواہاں ہیں جس میں امن و آشتی ہو اور خلوص و مروت کا راج ہو اور نفرتوں کا وجود معدوم ہو۔ یہی ان کی تعمیری سوچ انہیں دائیں بازو کے لوگوں کے زمرے میں شامل کرتی ہے۔

شاہدہؔ لطیف اور نفسیاتی اثرات

زندگی کے کسی بھی شعبے میں نفسیات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے اور یہی نفسیاتی عوامل کسی شعبے کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ شاعری جسے فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ مقبولیت و پذیرائی حاصل ہے، اس میں نفسیاتی امکانات کو اس کے وقیع ہونے کی دلیل خیال کیا جاتا ہے اور کامیابی و کامرانی کا انحصار انہی پر ہوتا ہے۔ نفسیات میں تحت الشعور، لاشعور اور شعور زیرِ بحث آتے ہیں۔ شعر و سخن میں نفسیاتی حوالے باریک بینی، تیز قوتِ مشاہدہ اور فلسفیانہ اثرات سے مملو ہوتے ہیں۔ نفسیات کی اس اہمیت کے پیشِ نظر دنیائے تنقید میں نفسیاتی تنقید کو ایک اہم دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ معروف مغربی نقاد ہومر اور فرائیڈ اس کے متقدمین شمار ہوتے ہیں جنھوں نے نفسیاتی دبستان کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ اس حوالے سے فزوں تر کام بھی کیا ہے۔

شاہدہؔ لطیف کے سخن میں بھی عمیق نفسیاتی شواہد بہار سامانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آج ہم ان کے سخن کا تجزیہ نفسیاتی تناظر میں کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے ہم ان کے منظوم سفر نامہ ''اف یہ برطانیہ'' مطبوعہ فروری 2009ء کا جائزہ اسی نسبت سے لیں گے۔ اس حوالے سے مذکورہ مجموعہء کلام کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار کو برائے استشہادات و استخراجات بروئے کار لایا جائے گا۔ نفسیاتی اثرات کے پہلو بہ پہلو دیگر انتقادی امکانات بھی زیرِ بحث آئیں گے۔

یہ امر عمومی انسانی نفسیات میں شامل ہے کہ وہ حبس زدہ ماحول سے بیزار ہو جاتا ہے اور اس گھٹن سے نکلنے کے لیے اسے تازہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی کی یکسانیت سے اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ پھر کچھ نئے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ زیست میں تغیرات کے باعث دلچسپی

بڑھ جاتی ہے۔اسی نفسیاتی تاثر کا حامل ان کا ایک مطلع دیکھیے جو بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ہے۔جس کے عروضی ارکان ’’فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن‘‘ ہیں۔

سانس لینے کے لیے تازہ ہوا تو چاہیے
ہر طرف ہو جب گھٹن سی کچھ نیا تو چاہیے

(ص:12)

تہذیبی وضع داری اور پندارِ انا کسی بھی انسان کی نفسیات کی عکاسی سے مربوط ہوتے ہیں اور تفہیم کے لیے غائرانہ مطالعہ اور بھرپور قوتِ مشاہدہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔کسی بھی امر کے تعین کے لیے عجلت پسندی اور قلیل و نا معقول مواد نتائج کشی میں مفید و متداول نہیں ٹھہرتا۔کسی بھی ادھورے مفروضے سے حاصل شدہ استخراجات منطقی نہیں ہوتے اور نہ مضبوط و مستحکم رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

ہے وضع داری، بڑی احتیاط کرتے ہیں
ادھوری بات سے ہم رازداں نہیں کھلتے

(ص:15)

زندگی کچھ آداب کی متقاضی ہوتی ہے۔ہر شخص کی کوئی نہ کوئی منزل ہوا کرتی ہے۔جادۂ منزل پر گامزن رہنے کے لیے شوقِ مسافت بھی ناگزیر ہے جس میں حزن و طرب ہر طرح کے احساسات ضروری ہیں۔کیونکہ صرف راحت و مسرت کا غم ہی حیات نہیں ہے۔انسان کا طرزِ تکلم بھی اس کی زیست میں اہم ہوا کرتا ہے۔شاہدؔہ لطیف اندازِ تکلم میں لہجے اور نظر کی متانت کی قائل ہیں۔جسے ان کی نفسیاتی عمدگی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

منزل کے ساتھ شوقِ مسافت بھی چاہیے
دکھ بھی بہت ضروری ہیں راحت بھی چاہیے
ہو گفتگو ضرور ہر اک شخص سے مگر
لہجے میں اور نظر میں متانت بھی چاہیے

(ص:30)

حیات اپنے اندر عجب وغریب فلسفے اور نفسیات رکھتی ہے۔ اگر زندگی میں لایعنیت نہ ہوتو مقصدیت کی اہمیت بھی واضح نہ ہو۔ اس لیے زیست کو مجموعہء اضداد کہا جاتا ہے۔ انسان کے پاس اگر حسنِ تکلم ہے تو وہ حرفِ رائیگاں بھی رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو خود میں صنعتِ تضاد کا درجہ بھی رکھتا ہے۔

اک حسنِ تکلم بھی پاس ہے
اک حرفِ رائیگاں مرے ساتھ ساتھ ہے

(ص:32)

انسان مدنی الطبع ہے اور یہی اس کی نفسیات بھی ہے۔ زندگی میں انسان کو معاون وغیر معاون رویوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ دونوں رویے انسانی ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ غیر معاون احساسات کی بجائے معاون عوامل کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے کیونکہ حیات ایک دشوار عمل ہے۔ اگر کسی کی حمایت حاصل نہ ہو، اگر کسی کا کلمہء خیر شاملِ حال نہ ہو تو یہ سفر بہت سی سنگینیوں کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کسی کی یاد کا کردار مرکزی ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی کو یاد آئیں گے تو وہ آپ کے لیے کلمہء خیر کا امین بھی ہوگا۔ آپ کے لیے دعا بھی کرے گا اور اس کی حمایت بھی آپ کو حاصل ہوگی۔

کسی کی یاد کسی کی دعا ضروری ہے
کٹھن سفر ہے کوئی آسرا ضروری ہے

(ص:60)

حیاتِ انسانی میں مسائل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کی غلط سوچ ور منصوبہ بندی کے باعث پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو دوسروں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں یا خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کی شدت فزوں تر ہوا کرتی ہے۔ اسی عمومی نفسیات کی طرف شاہدہ لطیف نے یوں اشارہ کیا ہے۔

یہ خارزارِ زیست تو اگ آئے اپنے آپ
کانٹے تو اپنی راہ میں بوئے کبھی نہ تھے

(ص:61)

داخلیت اپنے اثرات خارجیت پر مرتب کرتی ہے اور یہی معاملہ خارجیت کا بھی ہے۔ انسان کا اصل ماحول اس کے اندر کا ماحول ہوا کرتا ہے۔ اگر اندر کے ماحول میں طربیہ احساسات ہوں تو باہر کا سماں بھی جشنِ طرب کا مثیل ہوا کرتا ہے۔ اگر اندر کے ماحول میں حزن و ملال ہو تو پھر مظاہرِ فطرت بھی اداس دکھائی دیتے ہیں۔

اک غم زدہ سی رات ہے تارے اداس ہیں
لگتا ہے اس زمیں پہ سارے اداس ہیں

(ص:66)

زندگی کچھ ترجیحات سے عبارت ہوا کرتی ہے۔ ہر انسان کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد کسی نہ کسی ذوق و شوق کی عکاسی کرتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ضبط کے بندھنوں کو مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ پھر زندگی ضبط کے حصار میں محصور ہو جاتی ہے۔ پھر انسان کا مقصد کمالِ شوق کے مدارج طے کرتا ہے۔ اسی نفسیاتی اُپج کا مظہر ان کی غزل کا مطلع نذرِ قارئین ہے جو بحرِ رمل مثمن محذوف میں کیا گیا ہے۔

ہے کمالِ شوق سے وابستگی کیسے ہمیں؟
ضبط سے باندھے ہوئے ہے زندگی کیسے ہمیں؟

"(ص: 67)

یہ امر انسان کی نفسیات میں شامل ہے کہ جب وہ زندگی میں کسی نوع کی بیزاری محسوس کرتا ہے تو پھر اسے اپنے ہاں کسی نہ کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے سے زیادہ محروم طبقے کا غائرانہ مطالعہ کرے تو احساسِ تشکر سے سرشار ہو جائے۔

نہ جانے ہے کیا شئے کہ جس کی کمی ہے

وگرنہ ہے جو کچھ ہمارا بہت ہے

(ص:68)

مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ عشق میں وہ شوخی و سرمستی نہیں رہی جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج کا انسان نفسیاتی طور پر بہت کمزور ہے۔ وہ راہِ عشق میں قربانیاں دینے سے قاصر ہے۔ وہ کمزور شخصیت و کردار کا مالک ہے۔ مگر جنوں ایک ایسا سرکش جذبہ ہے جو اپنی معجز سامانیوں کا اظہار کرتا رہے گا۔ نفسیاتی حوالے سے آمدہ شعر میں جنوں اور عشق کے تقابلی مطالعہ کی فضا پائی جاتی ہے۔ یہ شعر بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

جنوں میں معجزے ہوتے رہیں گے
مگر اب عشق میں دم خم کہاں ہے ؟

(ص:70)

ہم جب ارتقا کے سفر پر اپنے مطلوبہ اغراض و مقاصد حاصل نہیں کر پاتے تو نفسیاتی طور پر بہت سے استفسارات ہمارے ذہنوں میں جنم لیتے ہیں۔ ہمیں اس وقت بنظرِ غائر یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہماری منزل کیا تھی اور منزل کو جانے والے راستے کون کون سے تھے۔ ہمارا یہ عمل حسیاتی و نفسیاتی ہونے کے پہلو بہ پہلو انتقادی و فلسفیانہ بھی ہوتا ہے جسے ہم خود احتسابی سے عبارت بھی کر سکتے ہیں۔ بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا شاہدہ لطیف کا ایک شعر اسی تناظر میں لائقِ التفات ہے۔

دیکھیے کس راہ پر چلتا رہا ہے کارواں؟
ہیں ہمارے راستوں پر یہ نشاں کچھ مختلف

(ص:73)

جب انسان کو حزن و ملال کی مہیب فضائیں محصور کر دیں پھر ہر سو ویرانی کا عالم نظر آتا ہے۔ پھر گھر صحرا کا منظر پیش کرتا ہے اور صحرا گھر کی عکاسی میں مصروف و منہمک نظر آتا ہے۔ اسی نفسیاتی کیفیت کا ترجمان ان کی غزل کا یہ مطلع ہے۔

جب صحراؤں کے سفر میں رہے
ایسا لگتا ہے اپنے گھر میں رہے

(ص:83)

انسان جب اداس ہوتا ہے تو بسا اوقات اس کے پیچھے یومِ الست کا فلسفہ کارفرما ہوتا ہے۔ جب روحِ جز روحِ کل سے جدا ہوئی اس وقت سے ہماری روح مضطرب وملول ہے جبکہ یہ فلسفہ اکثر وبیشتر ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ ہمیں اپنی پریشانیوں کے دیگر اسباب و وجوہات نظر آتے ہیں۔ اسی حسیاتی ونفسیاتی عمل کو ان کے ان دو اشعار میں یہ حسن وخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اک پرتو نفس ہے کہ غمگیں ہے ہر قدم
جو آدمی کی روح کے اندر اداس ہے
خوشیاں جہاں جہاں بھی سفر میں مجھے ملیں
آیا معاً خیال مرا گھر اداس ہے

(ص:92)

رجائی احساس دراصل تسلی کا دوسرا نام ہے جب کوئی ہماری آرزو یا تمنا پوری نہیں ہوتی تو پھر یہی رجائی احساس تسلی کی صورت میں ہمیں سہارا دیتا ہے۔ اسی احساس کی بدولت زندگی اپنے ارتقائی سفر پر رواں دواں رہتی ہے۔ بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں ان کی غزل کا ایک شعر دیکھیے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہے۔ یہ شعر مذکورہ بالا پس منظر میں کہا گیا ہے۔

تھپکیاں شام ہی سے دے دے کر
آرزو کو سلائے جاتے ہیں

(ص:94)

یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے اور اس کی نفسیات کا حصہ بھی ہے کہ وہ اپنے وطنِ مالوف سے مانوس ہوتا ہے اور یہ مانوسیت دیارِ غیر میں بھی اپنے ہونے کا احساس فزوں تر دلاتی ہے۔ وطن

میں وہ کیف وسرور ہوتا ہے جسے مامتا کی آغوش سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

دیارِ غیر جیسا ہو، دیارِ غیر ہوتا ہے
وطن کی مامتا تیری وہ باہیں یاد آتی ہیں
بہت کچھ شاہدہ دیکھا دیارِ غیر میں لیکن
ہمیں اپنے وطن ہی کی وفائیں یاد آتی ہیں

(ص:96)

دل کا معاملہ ایک ایسے سرائے کی طرح ہے جس کا کوئی کرایہ بھی نہیں ہے۔لوگ آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ زیادہ ٹھہرتے ہیں، کچھ لوگ کم وقت قیام کرتے ہیں۔جبکہ کچھ لوگ اتنے پیارے محسوس ہوتے ہیں کہ وہ دل کو ہمیشہ کے لیے اپنا مسکن بنا لیتے ہیں۔دل کی کیفیت کے حوالے سے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

ساقی کی نوازش جاری ہے مہمان بدلتے رہتے ہیں

اس نفسیاتی معاملے کو انہوں نے کچھ یوں پیش کیا ہے۔

لوگ مہمان ہیں آتے ہیں چلے جاتے ہیں
ورنہ دل جیسے مکانوں کے کرائے بھی نہیں

(ص:97)

یہ ایک حقیقت ہے کہ دائیں بازو کے لوگوں کو جھوٹ سے عداوت ہوتی ہے اور وہ سچائی کے خواہاں ہوتے ہیں۔کسی نوع کی بے سود لڑائی کا وہ حصہ نہیں بنتے۔یہی ان کی نفسیات ہوتی ہے جو ان کی عکاسی کرتی ہے۔وہ معاشرے کے مفلوک الحال طبقے سے محبت کرتے ہیں اور ان کے لیے دردِ دل رکھتے ہیں۔وہ ساری دنیا سے شکایت نہیں رکھتے۔البتہ ان کے کچھ اعتراضات ضرور ہوتے ہیں۔وہ انسانیت کا عمیق احساس رکھتے ہیں۔

ہر جھوٹ سے جھگڑا ہے سچائی سے نہیں
مقصد کسی بے سود لڑائی سے نہیں

کچھ لوگ شکستہ ہیں انہی کا ہے مجھے رنج
شکوہ تو مجھے ساری خدائی سے نہیں

(ص:98)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر آپ کے اندر صلاحیتوں کا وفور ہے تو آپ سماج میں اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب و کامران ہو جائیں گے۔ اگر انسان میں کوئی نہ کوئی جوہر مخفی ہو تو وہ اسے منوانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ورنہ تو اہلِ زمانہ کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

کوئی تو جوہرِ قابل ہے جو منہ بولتا ہے
لوگ ایسے تو کسی کو بھی نہیں مانے ہیں

(ص:108)

شاہدہ لطیف کے ہاں پنجاب کی اساطیری داستانوں کے حوالے سے تلمیحات کا استخدام بھی پایا جاتا ہے۔ آمدہ شعر میں انہوں نے کچے گھڑے کا حوالہ دے کر پنجاب کی لوک داستان سوہنی مہینوال کی یاد تازہ کی ہے۔ یہ داستان دریائے چناب سے متعلق ہے جس میں سوہنی نے کچے گھڑے پر سوار ہو کر دریائے چناب کو عبور کیا اور پھر مہینوال سے ملاقات کی ہے۔ وہ اسی تاثر کا موازنہ عہدِ موجود سے کرتی ہیں کیونکہ عصرِ نو میں کچا گھڑا ابھی ساتھ دینے سے قاصر ہے اور نہ کسی میں اتنا ہمت و حوصلہ ہے کہ وہ کچے گھڑے پر بھروسہ کر سکے۔ اسی لیے پھر لہروں پر اختیار حاصل کرنا بھی محالات میں سے ہے۔

ساتھ کچا گھڑا نہیں دیتا
کیسے لہروں پہ اختیار آئے

(ص:110)

وہ عصرِ حاضر کے نفسیاتی رجحانات سے باخبر ہیں اور ہونے والے تغیرات سے بخوبی واقف ہیں۔ کلاسیکی شعری عہد میں اسلوب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوا کرتی تھی۔ شوکتِ الفاظ کو ترجیح دی جاتی تھی جبکہ زمانہء موجود میں غزل کی وہ قدیم تزئین و آرائش نہیں رہی اور نہ ہی لفظیات کو وہ

اہمیت دی جاتی ہے جو ازمنہ ءقدیم کا حصہ ہے۔اسی نفسیاتی اور اسلوبیاتی معاملے کو انہوں نے کچھ یوں پیش کیا ہے۔

لفاظیوں کا دور نہیں ، یہ جدید دور
اب وہ قدیم رنگِ عروسِ غزل گیا

(ص:111)

انہوں نے جمالیاتی فلسفے کو جزو اور کل کے تناظر میں انتہائی عمدگی سے برتا ہے کیونکہ ہر پھول حسین ہوتا ہے اور اس کا کردار چمن کی اجتماعی خوبصورتی میں بھی اہم ہوتا ہے۔یوں اس شعر میں ان کے کلی اور جزوی زاویہء جمال کو بطریقِ احسن مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

اس میں کیا شک کہ ہر اک پھول حسیں ہے صاحب
جب کہ اک گل کی بدولت چمن آراستہ ہے

(ص:132)

ہر انسان کی نفسیات مختلف ہوتی ہیں۔اسے آپ اس کی قدرتِ کاملہ کی کرشمہ کاری بھی قرار دے سکتے ہیں۔یہ ضروری نہیں کہ سمجھنے والے آپ کو آپ کی نفسیات کے عین مطابق سمجھیں۔ان کی رائے آپ کی نفسیات سے مختلف بھی ہوسکتی ہے۔اس حوالے سے انہوں نے بڑی عمدہ مثال پیش کی ہے کہ ہم کسی ہجوم کا حصہ اس لیے نہیں بنتے کہ کہیں بھیڑ میں کھو نہ جائیں۔اس لیے الگ تھلگ رہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے اس طرزِ عمل کو غرور اور تکبر سے بھی تعبیر کیا جائے حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔شعر ھذا میں ایک عمیق حسیاتی و نفسیاتی معاملے پر بات کی گئی ہے۔

یہ خوف بھی ہے کسی بھیڑ میں رہ نہ جائیں
اس لیے تو بہت ہی جدا سے پھرتے ہیں

(ص:133)

کسی بھی سخنور کے تخلیقی کام کو جانچنے کے لیے اس کے نفسیاتی اعماق و آفاق کا مطالعہ از حد

ضروری ہے۔ اگر اس میں وسیع تر نفسیاتی پہلو کارفرما ہوں گے تو اس کی کامیابی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ شاعری میں نفسیاتی عوامل فزوں تر ہوں گے تو اس میں تاثیرات کے کوائف بھی بھرپور نوعیت کے ہوں گے۔ کسی بھی سفرنامے میں عموماً اور منظوم سفرنامے میں خصوصاً نفسیاتی پہلو زیادہ لائقِ تحسین ہوا کرتا ہے جو اس کی کامیابی کی مبینہ دلیل ہوتا ہے۔ یہی معاملہ شاہدؔہ لطیف کے منظوم سفرنامے ''اف یہ برطانیہ'' کا بھی ہے جس کی بدولت اس سفرنامے کا نفسیاتی گراف بلند ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو اس کی مقبولیت و پذیرائی کی ضمانت ثابت ہوسکتا ہے۔

شاہدہ لطیف اور جمالیاتی احساسات

شاعری فنونِ لطیفہ کی ایک ایسی شاخ ہے جس کا تصور ذہن میں آنے سے ہی انسانی ذہن عموماً احساساتِ حسن و عشق سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ تاہم ایسے تمام جذبات و خیالات و معاملات و واقعات جو حسن و عشق سے علاقہ رکھتے ہیں، جمالیاتی احساس کے زمرے میں آتے ہیں جن کی بدولت شاعری کے حوالے سے ایک لطیف نظریہ اجاگر ہوتا ہے۔ شعر و سخن میں جمالیاتی اقدار و روایات کو ہر عہدِ شعر میں مقامِ اعتبار حاصل رہا ہے۔ شعریات کا جمالیاتی دبستان خود میں ایک کلاسیکی روایت و اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح جمالیاتی تنقید کو بھی تنقید کے کلاسیکی دبستانوں میں خصوصی پذیرائی حاصل ہے۔ ایسی شاعری جو جمالیاتی احساسات سے عاری ہو، وہ نہ کسی ذوقِ لطیف کی ترجمان ہوتی ہے بلکہ وہ ایک خشک فلسفے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زوال کا ایک سبب جمالیاتی عوامل کا فقدان تھا جس کے باعث وہ اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں ناکام ہوگئی۔

عمومی مشاہدہ یہی ہے کہ طبقۂ ذکور کی بجائے معشرِ اناث میں جمالیاتی احساس فزوں تر ہوتا ہے۔ ''شاعراتِ ارضِ پاک'' کے تحقیقی و تجزیاتی کام نے اس عمومی احساس کو تقویت بخشی۔ راقم الحروف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسے شعرا و شاعرات کے حوالے سے انتقادی کام کے یکساں مواقع میسر آئے ہیں۔ اس سلسلے میں راقم کی تنقیدی تصانیف کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

آج ہم شاہدہ لطیف کے کلام کا تجزیہ جمالیاتی تناظر میں کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کے چوتھے شعری مجموعہ ''برف کی شہزادی'' مطبوعہ جنوری 2004ء میں سے منتخب غزلیات کے

منتخب اشعار اور منتخب نظمیات کو برائے استشہادات واستخراجات لائیں گے۔واضح رہے کہ مجموعہ ھذا ان کا پیرس کے حوالے سے ایک منظوم سفر نامہ ہے۔ اس تجزیہ میں ہماری کوشش رہے گی کہ کلی زاویہء انتقاد کو اجاگر کیا جائے۔ اس حوالے سے تمام تر کاوشیں بروئے کار لائی جائیں گی۔

سفر میں اگر مظاہرِ فطرت کی رفاقت میسر ہو تو وہ سفر خوب صورت ہوا کرتا ہے اور تمام تر مناظر بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی جمالیاتی احساس انسان کی سفر کی صعوبتوں اور سنگینیوں سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔ اسی فکر کی ترجمانی ان کی غزل کے اس مطلع میں کی گئی ہے جو بحر متقارب مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہیں۔

سفر میں ستارے مرے ہم قدم تھے
بہت سے نظارے مرے ہم قدم تھے

(ص:49)

ان کے ہاں کلاسیکی بہاریہ شاعری کے فزوں تر خصائص پائے جاتے ہیں جو ان کے جمالیاتی احساس کو تقویت بخشتے ہیں۔ اسے وہ اپنے قلم کی بہار افشانی سے تعبیر کرتی ہیں۔ شاید یہ ان کے قلم کی خوشبو کا اعجاز بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں اپنے اردگرد بزمِ بہاراں اور جشنِ طرب کا سماں محسوس ہوتا ہے۔ مذکورہ بحر و وزن میں ان کی غزل کا ایک شعر اسی احساس کا مظہر ہے۔

نہ جانے ہمارے قلم کی ہے خوشبو
بہاروں کی محفل سجی جا رہی ہے

(ص:62)

خوبصورت چہرے بھی جمالیاتی احساس کی نمو پذیری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی آزاد نظم ''پیرس کے حسین چہرے'' قابلِ ذکر ہے۔

حسین چہرے
حسین دلکش، جمیل چہرے
چمک رہے ہیں کہ جیسے تارے

اندھیری شب میں ندی کنارے
یہ خوشبوؤں کی سبیل چہرے
چمکتے روشن، جمیل چہرے
مگر ٹشو پیپروں کے ٹیلے
یہ ڈسٹ بن کے وجود گیلے
بتا رہے ہیں کہ اہلِ پیرس
فقط نہاتے ہیں خوشبوؤں سے
نہیں ابھی آشنائی ان کی
ہمارے پانی کے جادوؤں سے

(ص:74)

نظم ھذا کے جمالیاتی اظہار میں شدتِ احساس بھی ہے اور زورِ بیاں کے تلازمات بھی کارگر ہیں۔ اس نظم کی خوبصورتی میں مظاہرِ فطرت کا کردار فطری نوعیت کا ہے جس کے باعث یہ فن پارہ فطری رچاؤ سے ہم آغوش ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آزاد نظم میں قوافی کا استخدام آمد و برجستگی کا آئینہ دار ہے جس کے باعث پابند شاعری کی چاشنی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نظم کی منظر نگاری خود میں ایک تجریدی آرٹ کا پہلو رکھتی ہے۔ شاہدہ لطیف نے اہلِ پیرس کے خوشبوؤں سے نہانے کا تذکرہ کر کے اس نظم کے حسن و جمال کو چار چاند لگا دیے ہیں مگر انہوں نے اپنے پانی کی آشنائی کا ذکر کر کے اپنے پانی کی جادوئی خصوصیت کے حوالے سے بات کی ہے اور حب الوطنی کا عمدہ ثبوت دیا ہے جس کے باعث اندازِ بیاں نے جدت اختیار کر لی ہے۔ ان کی اس آزاد نظم کا شمار بہترین آزاد نظموں میں ہوتا ہے جو بین الاقوامی معیار کی حامل ہونے کے پہلو بہ پہلو جمالیاتی اقدار و روایات کی امین بھی ہیں۔

شاہدہ لطیف کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں جہاں بھی حب الوطنی کا حوالہ ملتا ہے وہاں جمالیاتی احساس ضرور کارگر ہوتا ہے۔ یہ معاملہ بہت ہی کم سخنوروں کے ہاں پایا جاتا ہے

جسے ہم ان کی باطنی صداقت بھی قرار دے سکتے ہیں۔اس حوالے سے ان کی چہار مصرعی نظم ''خوشبو اور روشنی'' قابلِ ذکر ہے جو قطعہ کی ہیئت میں ہے۔

جدھر سے بھی گزر جاؤں وطن کی باس آئے گی
کہ خوشبو خود مچلتی ہے سب گلوں کے پاس آئے گی
سفیرِ ارضِ پاک ہوں میں شاہدؔہ سچ ہے
مجھے گھر کے علاوہ روشنی کیا راس آئے گی

(ص:74)

ان کی آزاد نظم ''ترے راستے کے تارے'' بھی خود میں ایک جمالیاتی تاثر سموئے ہوئے ہے۔مذکورہ نظم بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین کی جاتی ہے۔ دیدہ باید کہ وہ اس نظم کے حوالے سے کیا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔

مہتاب ستارے بھول چلیں
جب ہم ترے رستے میں
احساس کی منزل پر
کچھ یاد رکھیں باتیں
کچھ ان کہی باتوں کو
دانستہ بھول چلیں
پھر جتنے بھی ذرے ہیں
چن چن کے سجالیں ہم
ذرے جو ستارے ہیں
ترے رستے کے یہ ذرے
ہمیں چاند ستاروں سے
بے حد یہ پیارے ہیں

(ص:86)

شاہدہ لطیف دائیں بازو کی شاعرہ ہیں۔ اس لیے مذہبی رجحانات ومیلانات کا اثر ان کی فکریات پر غالب ہے۔ اس لیے وہ حسن کو ایک زوال پذیر مادہ تصور کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک حسنِ کل جو خدائے بزرگ و برتر کی ذات سے متعلق ہے۔ لافانی اور ابدی ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک بندگانِ خدا کے لیے حسن کے حوالے سے کسی نوع کے فخر وغرور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جو اپنے حسن پہ نازاں ہیں یہ بھی یاد رکھیں
خدا نے چاند سورج کو بھی زوال دیا

(ص:90)

ان کے فحوائے بیاں کا سب سے بڑا حسن مظاہرِ فطرت کا استخدام ہے اور لطیف جذبوں کی پیوندکاری ہے۔ پیار، خلوص، وفا اور محبت کا تذکرہ ہے۔ محبت کے حوالے سے ان کے احساسات طربیہ تاثر کے حامل بھی ہیں۔ ان کی غزل کا ایک مطلع اس پس منظر میں دیکھیے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

کہانی خوبصورت ہو رہی ہے
اسے مجھ سے محبت ہو رہی ہے

(ص:91)

مجازی جمالیات بھی ان کے ہاں پورے کروفر سے پائی جاتی ہے۔ ان کی مدعا نگاری کا قرینہ یہی ہے کہ وہ سہلِ ممتنع کا اسلوب اختیار کرتی ہیں۔ جس سے ہر ذہنی سطح کا قاری حظ اٹھا سکتا ہے۔ وہ ہر قسم کی فکری ولسانی دقیقہ سنجی سے شعوری طور پر گریز کرتی ہیں۔ کہیں کہیں وہ جمالیات کے اظہار کے لیے متعلقہ لفظیات سے اجتناب کر کے جمالیاتی حسن آشکار کرتی ہیں۔ یہ ان کا ایک فلسفیانہ انداز ہے جو بہت ہی کم سخنوروں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ کریں جو خود میں ایک جمالیاتی فلسفہ تو رکھتا ہے مگر جمالیاتی اظہار کے شبدوں سے گریز کیا گیا ہے۔

چہرے تو سینکڑوں تھے مرے سامنے مگر

تیرے سوا کوئی بھی دکھائی نہیں دیا

(ص:95)

احترامِ محبت اور پیار کے خلوص پرور جذبات ایسے بےلوث ہوتے ہیں جنہیں کوئی نام دینا کارِ دشوار ہوتا ہے اور ان کا اظہار بھی ناقابلِ بیان ہوتا ہے۔ وصل کے لمحات اتنے بابرکت ہوتے ہیں کہ جن میں خزاں کی رت بھی نسیمِ بہار جیسی ہوتی ہے۔

میں کوئی نام اسے دے نہیں سکی اب تک
وہ احترامِ محبت وہ پیار ایسا تھا
وہ باغِ عمر کی سب ساعتوں میں ساتھ رہا
خزاں کی رت میں نسیمِ بہار ایسا تھا

(ص:97)

دل روح سے فزوں تر محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ وہ تشنگی ہے جو لگن کو بتدریج بڑھاتی رہتی ہے۔ یہ معاملات ایک زندہ دل انسان کے ہوتے ہیں جو جواں جذبوں کی عکاسی سے عبارت ہے اور زندگی کا حقیقی حسن تصور کیے جاتے ہیں۔ پھر لامحالہ طور پر الفاظ کے غنچے بھی خوشبو ریزیاں کریں گے۔ شاعری پر نکھار آئے گا اور چمن خوشبوؤں سے معطر ہو جائے گا۔ اسی جمالیاتی اظہار کے مظہر ان کی غزل کے یہ دو شعر قابلِ ذکر ہیں جو بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ”مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن“ ہیں۔

دل مانگے گا پھر روح سے دریائے محبت
اس تشنہ لبی میں یہ لگن اور بڑھے گی
الفاظ کے غنچوں سے ابھر آئے گی خوشبو
مہکے گا سخن، بوئے چمن اور بڑھے گی

(ص:100)

ان کے ہاں سماج سے ملنے والے خراجِ تحسین کو بھی جمالیاتی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے

جس کی بدولت ہمت وحوصلے کی پذیرائی ہوتی ہے اور انتشارِ ذات کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔تزئین وآرائش کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

کتنی محبتوں سے پکارا گیا ہمیں ؟
بکھرے ہوئے تھے ہم سنوارا گیا ہمیں

(ص:102)

شاہدہ لطیف کی آزاد نظم ''میرے پاکستان جیسا'' جوجذبہء حب الوطنی کا حوالہ بھی ہے اور جمالیاتی احساس کا مظہر بھی ہے، جو بحرِ اوفر میں کہی گئی ہے،نذرِ قارئین ہے۔

دور دیس میں
سب اچھے ہیں
سب کچھ اچھا لگتا ہے
کتنی اونچی تعمیروں کے یہ کہسار کھڑے ہیں
شیشوں جیسی چمکیلی گدلاہٹ سے
آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں
علم و دولت اور ہنر کے
دریا اور سمندر موجیں مار رہے ہیں
اک لمحے میں کتنی سوچیں
آتی جاتی سانس میں گھلتی رہتی ہیں
سب اچھے ہیں
سب کچھ اچھا لگتا ہے
لیکن میرے پاکستان کے جیسا
اس دھرتی پر
کچھ بھی نہیں ہے

(ص:107)

نظم ھذا میں شاہدہ لطیف کی منظر نگاری تجریدی آرٹ کا شاہکار محسوس ہوتی ہے۔ طربیہ احساسات روحِ رواں کا کردار ادا کرر ہے ہیں ۔رفعتِ تخیل اپنی مثال آپ ہے۔ اسلوب شائستگی وشستگی کے خصائص خود میں سموئے ہوئے ہیں اور سہل نگاری کی روایت کوتقویت بخشی گئی ہے۔ حب الوطنی کا گراف بلند ہوتا ہوانظر آتا ہے۔شدتِ احساس اورزو رِبیان کے تلازمات بھی پائے جاتے ہیں ۔داخلی وخارجی عوامل کی یکساں عمل داری ہے۔ عام طور پر تحقیقی وتنقیدی حوالے سے یہ رائے پائی جاتی ہے کہ ایک عمدہ غزل داخلیت کا آئینہ دار ہوتی ہے اور ایک اچھی نظم خارجیت کی عکاس ہوتی ہے لیکن ہماری ناقدانہ رائے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک معیاری غزل اورنظم دونوں داخلیت وخارجیت کے حسیں امتزاج کی حامل ہوتی ہیں۔ یہی کیفیت مذکورہ نظم کی بھی ہے۔

ان کے جمالیاتی فحوائے سخن میں چمن اور متعلقاتِ چمن کا تذکرہ وفور سے ملتا ہے۔ مظاہرِ فطرت کا استخدام فطری نوعیت کا ہے۔ان کے جمالیاتی تلازمات میں ہوا، خوشبو، فضا، مہک، نظر، روشنی، رت، احساس اورکلیاں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا جمالیاتی احساس بسا اوقات رومان کی ردا اوڑھے ہوئے ہوتا ہے جوخود میں بے پناہ مقبولیت و پسندیدگی رکھتا ہے۔ ان کی غزل کے تین اشعارع اسی تناظر میں لائقِ توجہ ہیں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

ہوا میں اس کی خوشبو آ رہی ہے
فضا کتنی مہکتی جا رہی ہے ؟
کسی کا نام آیا ہے لبوں پر
نظر میں روشنی سی چھا رہی ہے
یہ رُت احساس کی کلیاں سجا کر
کسی کی یاد کو مہکا رہی ہے

(ص:110)

اسی فکری تسلسل کا حامل ان کی غزل کا ایک مطلع قابلِ غور ہے جو بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن ''مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن'' ہے۔

اس دل کو تری یاد سے آباد کیا ہے
ہر لمحہ تجھے ہم نے بہت یاد کیا ہے

(ص:112)

شاہدہ لطیف کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ رومان کو جمالیاتی حاشیہ آرائی کے ساتھ پیش کرتی ہیں جس کے باعث سخن میں جاذبیت اور اپنائیت کے خصائص آشکار ہوتے ہیں۔کبھی ان کے ہاں خوشبو اور مہک کے پہلو بہ پہلو رقص وسرود کی فضا بھی پیدا ہو جاتی ہے جو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ قاری جس کے سحر میں مسحور ہو کر ایک عجیب قسم کی سرخوشی و سرمستی محسوس کرتا ہے،بحر ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ان کی غزل کے دو اشعار سپردِ قرطاس ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

بہت مہکی ہوئی تھی شب تمہاری یاد بھی آئی
گلابوں کے نگر میں تب تمہاری یاد بھی آئی
بس اتنا جانتی ہوں رقص کرتی آئی تھی خوشبو
نہ پوچھو میرے دل میں کب تمہاری یاد بھی آئی؟

(ص:115)

کبھی کبھی وہ حزن و ملال کے جذبوں کو بھی ایک جمالیاتی حسن کے ساتھ پیش کرتی ہیں جس سے وہ ترسیلِ آگہی کا کام لیتی ہیں۔اس سلسلے میں انہیں مظاہرِ فطرت کی معاونت بھی حاصل ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر نہایت دلچسپی کا حامل ہے جس میں قاری کے لیے اکتسابِ فیض کے ابواب وا ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاں آنکھوں کو تابندہ ستاروں کا استعارہ پہنایا گیا ہے۔

مرے اشکوں سے ظلماتِ جہاں میں روشنی کر لو

مجھے پہچان لو آنکھوں کے تابندہ ستاروں سے

(ص:116)

وہ اپنی رفعتِ تخیل کے باعث اپنی پہچان واضح کرتی ہیں اور یہی ان کا ادراکِ منزل بھی ہے۔انھوں نے اپنی شعریات میں خوشبو کا التزام بکثرت کیا ہے جو ان کے جمالیاتی احساس کی ترجمانی ہے۔انھوں نے مختلف النوع طرزِ افکار کی بدولت خوشبو کے حقیقی تصور کو اجاگر کرنے کی سعیِ مندوب کی ہے جس میں خوشبو کی حقیقی پہچان کا آدرش پنہاں ہے اور سماج کو نازیبا رویوں سے اجتناب کی تحریک بھی دی ہے۔

خوشبو کو تعارف کی ضرورت نہیں پڑتی

تم کاغذی پھولوں کے کئی نام رکھو گے

(ص:118)

ان کے نظریہ ء جمال میں مادیت کی مذمت کا فلسفہ بھی کارفرما ہے۔جس میں روحانیت اور تصوف کی فضا پائی جاتی ہے۔جس سے اخلاص کا ابلاغ بہ آسانی ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔جس کی بدولت وفا کی پیوند کاری نمایاں ہو رہی ہے۔گویا وہ خلوص کی پرچارک ہیں۔ وہ مادیت سے شعوری گریز اختیار کرتی ہیں۔

دنیا کے زر و مال سے کیا کام وفا کا

بے لوث محبت کا صلہ ہو نہیں سکتا

(ص:129)

شاہدہ لطیف کا فلسفہء اخلاص یہی ہے کہ کانٹوں کا صلہ پھولوں کی صورت ہو،نفرت کا جواب محبت سے ہو، ان کے اس جمالیاتی فلسفے میں انسان دوستی کا حسین پیغام پنہاں ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر طالبِ التفات ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیل مفاعیلن فعولن'' ہے۔

اسے کچھ پھول پہنچانے پڑیں گے

جو میری راہ میں کانٹے بو رہا ہے

(ص:130)

اسی فکری تسلسل کا حامل ان کی غزل کا ایک شعر زینتِ قرطاس ہے جو بحر رمل مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔

جب نئے پھولوں کا موسم آئے گا
شادماں ہو گا دلِ ناشاد بھی

(ص:137)

ان کا فلسفہء جمالیات یہ ہے کہ بسورتے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیر دی جائیں۔ ان کا جمالیاتی احساس انسان دوستی سے ہم آغوش ہو کر مزید خوبصورت ہو جاتا ہے۔ گویا وہ بہ سے بہتر کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ وہ زندگی کو رجائی آئینے میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کی نگاہ سے بھی دیکھنے کی قائل نظر آتی ہیں۔ان کے بہت سے خدشات اور تحفظات بھی ہیں۔ بحر ہزج مثمن سالم میں ان کی غزل کا ایک شعر لائقِ توجہ ہے۔

مہکتے پھول کلیاں، آبشاریں خوب ہیں لیکن
نہ کھو جائے کہیں یہ بھی نظارا ایک دن ہم سے

(ص:139)

شاہدہ لطیف کے شعری کینوس کے سیر حاصل اور غائرانہ مطالعہ کے بعد ہماری اس استخراجی رائے کو بہت تقویت ملی ہے کہ اگر ان کا شعری ارتقا اسی تگ و تازِ فکر و فن سے جاری رہا تو ان کے ہاں جمالیات کے نئے ابواب وا ہوں گے۔اسی تناظر میں ان کے بہترین مستقبل کی نوید سنانا قرینِ فطرت ہے۔

شاہدہ لطیف کی قومی شاعری

ملک وقوم سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جسے جزوِ ایمان کہا گیا ہے اور یہ جذبہ ہر کہ ومہ کو ودیعت بھی نہیں کیا جاتا۔ بلکہ یہ مشیتِ ایزدی کی ایک عطائے خاص ہے اور یہ سعادت صرف فرخندہ نصیب سخنوروں کے حصے میں آتی ہے۔ ویسے تو شاعری کا شعبہ بہت گنجان آباد ہے لیکن جب بات قومی شاعری کی ہوتی ہے تو صرف گنتی کے چند شعرا کے نام ہی سامنے آتے ہیں۔ ان خوش بخت شعرا میں شاہدہ لطیف کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے جو اپنے ملک وقوم سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ وہ پاکستانیت کو عزیز از دل وجاں جانتی ہیں اور یہی ان کی تخلیقی و تصنیفی زندگی کا بھرپور اور نمایاں حوالہ بھی ہے۔ شذرہ ھذا میں ہم ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''میں پاکستان ہوں'' مطبوعہ 14 اگست 2000ء میں سے منتخب کلام برائے استشہادات واستخراجات لائیں گے۔ موضع کی پاسداری کے پہلو بہ پہلو مجموعی تنقیدی تاثر کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اپنے اسلاف کی عزت وتکریم کرنا زندہ قوموں کا شعار ہوا کرتا ہے۔ وہ ان کی زندگیوں، کارناموں، حالات وواقعات اور اقوال وفرمودات کو نہ صرف روایت کے طور پر زندہ رکھتی ہیں بلکہ اپنی زندگی میں انہیں مشعلِ راہ بناتی ہیں۔ اپنی زیست کے ہر موڑ پر ان سے استفادہ کرتی ہیں۔ ان کے مشن کو تاحیات جاری وساری رکھتی ہیں۔ ان کی یہی خصوصیات انہیں بحیثیت قوم زندہ رکھتی ہیں۔ اپنے قائدین سے محبت ہی بقا وارتقا کی ضامن ہوتی ہے جس کے باعث کسی قوم کا مستقبل شاندار وتابناک ہوتا ہے۔ پھر اگر قائد بھی قائداعظم جیسا ہو، جس کی نظیر نہ صرف زمانہء حال میں مشکل ہے بلکہ فردائی ادوار میں بھی قرینِ قیاس نہ ہو تو وہ زیادہ لائقِ تکریم ہوا کرتا ہے۔

قائدِ اعظم ایسی معتبر ہستی ہے جس کا اعتراف نہ صرف اہلِ سیاست نے کیا بلکہ مدبرانِ عالم بھی ان کی عظمت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ بانیء پاکستان کے حوالے سے شاہدہ لطیف کا خراجِ تحسین بہ عنوان ''بانیء پاکستان قائدِ محترم'' ملاحظہ کریں جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ جس کا اسلوبیاتی ترفع اپنی مثال آپ ہے اور اپنے قائد سے بے پایاں محبت کا اظہار بھی ہے۔ یہ بحر متدارک دوازہ درکنی میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن'' ہیں۔

قائدِ محترم آپ کی عظمتوں کو سلامِ سخن
کیوں کہ ہر انجمن میں ہو آپ سے اہتمامِ سخن
قائدِ محترم بارِ احسان ہم سب کی گردن پہ ہے
اس لیے ہر قلم سرنگوں آپ کے قریہء فن پہ ہے
آپ ہیں محترم آپ تھے محترم دنیا بھر کے لیے
آپ تاجِ شہی سے گراں قدر ہیں میرے سر کے لیے
قائدِ محترم آپ نے ہم کو پیارا وطن دے دیا
تھے خزاؤں کے چنگل میں کب سے ہمیں یہ وطن دے دے دیا
عمر بھر آپ کے گیت گاتے رہیں گنگناتے رہیں
آپ تو قوم و ملت کے محسن ہیں ہم یہ بتاتے رہیں
قرض ہے ہم پہ ذکر وفا آپ کا ہر گھڑی ہر نفس
آج آزاد ہیں اور نکل آئے ہیں از درونِ قفس

(ص:25)

قومی عصبیت ایک عمدہ جذبہ ہے۔ اگر اس کے مضرات سے بچا جا سکے۔ ملک وقوم کو بہتر سمجھنا قومی عصبیت سے موسوم سمجھا جاتا ہے۔ شاہدہ لطیف کے سخن میں بھی قومی عصبیت کے وسیع تر کوائف ملتے ہیں۔ وہ قومی عصبیت سے فائدہ اٹھانے اور اس کے نقصانات سے بچنے کی قائل

ہیں۔نقصان کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ قوم اپنے اوپر فخر بھی کرے اور دوسری اقوام کو حقیر بھی سمجھے جس سے غرور و تکبر کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ پھر نفرت و کدورت کو ہوا ملتی ہے مگر ان کے ہاں قومی عصبیت کے صرف ثمرات ہی پائے جاتے ہیں اور مضرات معدوم ہیں۔ وہ اگر اپنے دیس کو سب سے زیادہ خوبصورت سمجھتی ہیں تو یہ ان کا والہانہ محبت کا ایک انداز ہے۔ اس لیے وہ اسے رشکِ گل فردوس و ارم کہتی ہیں۔ اسے دنیا کا بہترین ملک قرار دیتی ہیں۔ وہ اسے دنیا کے باغوں میں سے ایک خوبصورت باغ قرار دیتی ہیں۔

اس کا ہر پھول ہے رشکِ گل فردوس و ارم
ہے جہاں میں سرِ فہرست ہمارا یہ وطن
یوں تو ہیں شاہدؔہ دنیا میں گلستان ہزار
ساری دنیا سے ہے لیکن مجھے پیارا یہ وطن

(ص:26)

اسی فکری تسلسل کا حامل ان کا ایک ملی نغمہ دیکھیے جس کا ابتدائی اور آخری دو بند نذرِ قارئین ہیں۔

مری ہستی میرا مان ہے تو
مرے ہونے کی پہچان ہے تو
مجھے سارے جگ سے پیارا ہے
مرا اپنا پاکستان ہے تو
مرا عشق ہے میری مان ہے تو
مرا اپنا پاکستان ہے تو

O

ہر ذہن ترو تازہ تجھ سے
اک کیف ہر اک لمحہ تجھ سے

ہر حال میں تیری چاہت ہے
ہر قلب کا ایمان ہے تو
مرا فخر ہے میری شان ہے و
مرا اپنا پاکستان ہے تو

O

جب تک یہ جان سلامت ہے
ہر دھڑکن تری امانت ہے
اک پل دو پل کا عہد نہیں
مری سانسوں کا پیمان ہے تو
مرے ہونے کی پہچان ہے تو
مرا اپنا پاکستان ہے تو

(ص:29)

ملک وقوم کی حفاظت ہر محبِ وطن کا فرض ہے اوراس فرض پر مامور سپوت ملک وقوم کا سرمایہ ہوا کرتے ہیں۔جن پر پوری قوم فخر کرتی ہے۔ مسلح افواج کے جوانوں کوانھوں نے اس شعر میں خوبصورت خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ یہ شعر بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

انہیں دیتی ہے دھرتی ماں دعائیں
وطن کی جو حفاظت کر رہے ہیں

(ص:56)

شاہدہ لطیف ایک مصلحِ قوم بھی ہیں۔ وہ اپنی قوم کی اصلاح وفلاح چاہتی ہیں۔ وہ سماجی رویوں کی بہتری کی براہِ راست اور بالواسطہ دونوں طرح سے کوشش کرتی ہیں۔ ان کے ہاں مکارمِ اخلاق کا حسیں آدرش پایا جاتا ہے۔انسان دوستی کے بھرپور شواہد ہیں۔ اخلاقی اقدار و

روایات کی پاسداری ہے۔ مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہا گیا ان کی غزل کا مطلع ملاحظہ کریں۔

روش پتھر کی ہم اپنا رہے ہیں
جبھی بے حس سے ہوتے جا رہے ہیں

وطن سے محبت کا ایک منفرد انداز غزل کے اس مطلع میں قابلِ ذکر ہے جو بحرِ اوفر مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولن'' ہیں۔

مرے لیے تو اس کی مٹی سونا ہے
پاکستان کا ہونا، میرا ہونا ہے

(ص:75)

ان کی شعریات میں قومی فکر کے وسیع تر امکانات ملتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کا فزوں تر درد اپنے دل میں رکھتی ہیں جن میں سیاسی چیرہ دستیوں کا ذکر بھی ہے اور سیاست دانوں کی بدعنوانیوں اور کارستانیوں کا تذکرہ بھی ہے۔ معیشت کا دکھ درد بھی ہے اور عوام کی خوشحالی کی فکر بھی ہے۔ وہ ایک مصلح اور دانشور کی طرح سوچتی ہیں۔ ان کے ہاں بھرپور تنقیدی رویے بھی ہیں۔

اے رہنماؤ ڈال گئے کس عذاب میں
قرضوں کے بھوت آ گئے نسلوں کے خواب میں
کیسی خوشی کہاں کی سیاست کہاں کا عیش
جب قوم مبتلا ہو غم و اضطراب میں

(ص:87)

شاہدہ لطیف کی نظم ''قومی گیت'' قومی تناظر میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں وطن کی محبت کے حوالے سے مختلف النوع تلازمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جزئیات نگاری کمال درجے کی ہے۔ منظر نگاری اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں اپنے دیس کو دنیا میں محبوب ترین کہا گیا ہے۔ اس کے پرچم کی سج دھج نرالی ہے۔ اس کے کھیتوں میں ہریالی ہے۔ اس کے کہسار، ندیاں، کھیت، سبزہ اور صحرا کو باعثِ اعزاز و افتخار قرار دیا گیا ہے۔ جس سے مان اور پہچان دونوں وابستہ

ہیں۔وطن کے نغمات اور دعاؤں کے حوالے ہیں۔سکھ کی فضاؤں کا مذکور ہے۔خطاؤں کا اعتراف ہے اور اپنے لیے دنیا میں اسے محفوظ پناہ گاہ سے موسوم کیا گیا ہے۔جس پر روح، جان وتن، خواب اور مشقِ سخن قربان کر دینے کا تذکرہ ہے۔ یہ نظم متدارک مثمن سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ”فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن“ ہیں۔

ساری دنیا سے پیارا ہے ہم کو وطن
کیوں کہ واحد سہارا ہے ہم کو وطن
اس کے پرچم کی شان اس کا اپنا ہی رنگ
دیکھ کر جس کو کھیتوں کی ہریالی دنگ
اے وطن اے وطن

○

یہ جو کہسار ہیں، ندیاں کھیت ہیں
یہ جو سبزہ ہے جتنے نگر ریت ہیں
سب مرا مان ہیں، میری پہچان ہیں
اے وطن اے وطن

○

میں نے نغمے پروئے دعائیں لکھیں
تیرے گلشن میں سکھ کی فضائیں لکھیں
ہم سے سرزد ہوئیں جو خطائیں لکھیں
ساری دنیا میں اک تو سہارا وطن
اے وطن اے وطن

○

تجھ پہ قربان ہے روح اور جان و تن

وار دوں سارے خواب اور مشقِ سخن
اے وطن اے وطن

(ص:120)

شاہدہ لطیف کا قومی افق بسیط و عریض ہے۔ وہ اتحاد و یکجہتی کا حسین آدرش دیتی ہیں۔ وہ تعصب کے تمام فلسفوں کو مٹا دینا چاہتی ہیں۔ وہ اغیار سے موانست کی قائل نہیں۔ وہ پوری قوم کو قومی پرچم کے نیچے مجتمع دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ صرف اور صرف اپنے ملک و قوم سے محبت کی خواہاں ہیں۔ وہ ہر کسی کو دیش بھگتی کا سبق از بر کرانا چاہتی ہیں۔ جو اس راستے سے بھٹک چکے ہیں، انہیں راستے پر لانے کی خواہش مند ہیں۔ وہ وطن کو اپنی ذات کا جزوِ لاینفک سمجھتی ہیں۔ اس لیے وہ وطن کے دشمنوں کو اپنا دشمن گردانتی ہیں۔ وہ ملک و قوم کے بہتر مستقبل کی آرزو رکھتی ہیں۔ اسی تناظر میں ان کی نظم ''خواہش'' قابلِ ستائش ہے جو نظم کی مقبول ترین ہیئت یعنی غزل کی ہیئت میں کہی گئی ہے اور یہ نظم بحر متقارب مثمن سالم میں ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔ بحر ھذا کا شمار خلیل کی بحور میں ہوتا ہے اور یہ اہلِ عرب کی پسندیدہ بحر ہے۔ الطاف حسین حالی کی ''مسدس حالی'' بھی اسی بحر میں ہے۔ اس کو شعرائے فارسی نے بکثرت برتا ہے۔ شعرائے ریختہ میں بھی یہ بحر مقبول ہے۔

میں صوبوں کی سرحد قلم سے مٹا دوں
میں اپنے وطن کو اکائی بنا دوں
تعصب کی ساری کتابیں جلا دوں
میں ہر شخص کو ایک پرچم تھما دوں
جو غیروں کی چوکھٹ کے دریوزہ گر ہیں
انہیں اپنے گھر سے محبت سکھا دوں
جو بھولا ہوا ہے جو بھٹکا ہوا ہے
میں ایسے مسافر کو رستہ دکھا دوں

جو دشمن وطن کا و، وہ دشمن ہے میرا
وطن دشمنوں کو میں زندہ جلا دوں
اگر شاہدہ مجھ کو موقع ملے تو
میں تقدیر اپنے وطن کی جگا دوں

(ص:122)

سقوطِ ڈھاکہ یا سقوطِ مشرقی پاکستان ہماری قومی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے جو ہماری تاریخ کا ایک کرب ناک باب بھی ہے جس نے ملک وقوم کے محبِ وطن طبقے کو کرب وسوز کی کیفیت سے دو چار کر دیا۔ اس نسبت سے ان کی نظم ''سقوطِ مشرقی پاکستان'' قابلِ غور ہے جو دل کے تاروں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ نظم ھذا غزل کی ہیئت میں ہے اور بحر رمل مثمن محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔ ''فاعلن'' فاعلاتن کی محذوفی حالت ہے۔

آج جذبوں میں وہ شورِ بے کراں باقی نہیں
زخمِ دل میں وہ لگا ہے آہ، جاں باقی نہیں
دل کے ٹکڑے ہو گئے، چھلنی یہ سینہ ہو گیا
ملک کیا ٹوٹا لگا جیسے جہاں باقی نہیں
جس کے کانٹوں سے مہک آتی تھی پھولوں کی طرح
تھا کبھی اس طرح اب وہ گلستاں باقی نہیں
کارواں کتنے ہی گزرے اس کے سینے سے مگر
زندگی کی ریت پر کوئی نشاں باقی نہیں
کیوں بھلا اس طرح رلوایا تھا ساری قوم کو
وہ ندامت ہے کہ اشکِ خوں چکاں باقی نہیں
قائدِ اعظم سا جس کا قافلہ سالار تھا
ڈھونڈتی ہوں اب کہیں وہ کارواں باقی نہیں

(ص:125)

شاہدہ لطیف اپنی شعریات میں اپنی قوم کی تعلیم تربیت کا بخوبی التزام کرتی ہیں۔اس لیے وہ پیمانۂ شعر میں ترسیلِ ادراک کا فریضہ انجام دیتی ہیں کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ:

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اس سلسلے میں ان کی نظم ''وطن کی بیٹی'' ایک مخصوص حوالے کی حامل ہے۔نظم ھذا دراصل ان کا دخترانِ قوم سے خطاب ہے جس میں ان کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ وہ کس طرح قومی تعمیر وترقی میں اپنا بھر پور کردار ادا کرسکتی ہیں اور انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے کیونکہ کوئی بھی قوم ترقی کے زینے اس وقت تک طے نہیں کرسکتی جب تک مرد وزن کا کردار مساوی نوعیت کا نہ ہو۔یہ نظم ثلاثی کی ہیئت میں ہے جس کا شمار نظم کی کلاسیکی ہیئتوں میں ہوتا ہے۔نظم مذکور بحر مربع سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔مربع وزن میں عمدہ اشعار نکالنا یقیناً ان کی فکری وفنی اور لسانی چابکدستی کی عمدہ دلیل ہے جسے ان کی مدعا نگاری کے قرینے سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

فقط بیٹی نہیں ہو تم
وطن کی جسم و جاں تم ہو
نئی نسلوں کی ماں تم ہو

وطن کی آس ہے تم سے
وطن کی آرزو تم سے
وطن کی آبرو تم سے

تمہاری ذمہ داری ہے
نئے غنچوں کی تربیت

اسے دو پوری اہمیت

تمہاری تربیت میں گر
کوئی جانب معین ہو
تو مستقبل بھی روشن ہو

یقیں ہے تربیت سے پھر
علومِ نو کا سرمایا
جو نسلِ نو نے اپنایا

تو پھر اقوامِ عالم میں
وطن اپنا بھی پائے گا
مقام و مرتبہ اعلیٰ

(ص:147)

شاہدہ لطیف کی نظم ''پیارا پاکستان'' بھی قومی تناظر کی حامل ہے جس میں دیش بھگتی کا آدرش ہے۔ دھرتی کی سندرتا اور کوملتا کی خوشبو ہے۔ غیروں کی تقلید سے اجتناب کی تلقین ہے۔ سبز انقلاب کا نعرہ ہے۔ زرعی خوشحالی اور خود کفالت کا حوالہ ہے۔ نظم ھذا سہلِ ممتنع کے اسلوب میں ہے جو ان کی قادرالکلامی کی بین دلیل ہے۔ یہ نظم بحرِ وافر کے مربع وزن میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہے۔ یہ ایک رواں دواں اور رقصاں بحر ہے جو آہنگ و غنائیت سے سرشار ہے۔ اس کا شمار بحورِ مستحدثہ میں ہوتا ہے۔ یہ بحر عہدِ امیر خسرو میں عاشق صادق نامی ایک ماہرِ عروض نے ایجاد کی تھی جو رسالہ ''جامع الصنائع'' میں مذکور ہے۔

اپنے اپنے خواب سجائیں

اپنے پرچم گھر لے جائیں
ساری دنیا کو دکھلائیں
دیس ہمارا پاکستان
گھر یہ پیارا پاکستان
اپنی مٹی سب سے اچھی
اپنی خوشبو سب سے سچی
اپنی منزل اپنی راہیں
ساری دنیا کو دکھلائیں
دیس ہمارا پاکستان
گھر یہ پیارا پاکستان
اوروں کی تقلید کو چھوڑیں
دریاؤں کے دھارے موڑیں
اپنا اگائیں، اپنا کھائیں
ساری دنیا کو دکھلائیں
دیس ہمارا پاکستان
گھر یہ پیارا پاکستان

(ص:148)

شاہدہ لطیف صرف زرعی انقلاب کی بات نہیں کرتی، بلکہ وہ اس حوالے سے کسان کے لیے ایک زرعی منشور بھی رکھتی ہیں جسے کلیدِ کامیابی کہا جا سکتا ہے جو زرعی خوشحالی اور ترقی کا ایک سربستہ راز بھی ہے۔

اپنا لہو پسینہ بہا کر زمین پر
لکھ دے کسان اپنا مقدر زمین پر

(ص:160)

ان کے ہاں سیاست دانوں کے حوالے سے بھر پور طنز وتنقید کی فضا بھی ملتی ہے جسے ان کی غیر جانبداری سے بھی عبارت کیا جا سکتا ہے۔ بحر متدارک مثمن سالم میں ان کی غزل کا ایک مطلع دیکھیے جو متذکرہ موضوع کی مناسبت سے ہے۔ مذکورہ بحر کے عروضی ارکان ''فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن'' ہیں۔ چونکہ یہ بحر خلیل بن احمد کے بعد اخفش نے نکالی تھی، اور پھر بعد میں خلیل کی بحروں میں مل گئی، اس لیے اس کا نام متدارک رکھا گیا۔ اس کو ''رکف الخیل'' اور ''غریب'' بھی کہتے ہیں۔

راستے اب سبھی پر خطر ہو گئے
جو لٹیرے تھے وہ راہبر ہو گئے

(ص:162)

وہ ملک وقوم کے لیے خیر خواہی و خیر سگالی کے جذبات واحساسات رکھتی ہیں۔ وہ بڑے یقین سے اپنی دھرتی کو فقید المثال قرار دیتی ہیں۔ وہ گویا ہیں کہ ہمارے دیس میں سبزہ، بہاریں، وادی و کہسار، جھیلیں، دریا، سمندر، صحرا، موجیں اور ہوا سب خدادا د نعمتیں موجود ہیں۔ ہمیں خدائے بزرگ و برتر کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس نے ہمیں زمین پر اپنے دیس کی صورت میں جنت سے نواز دیا اور خدا سے استدعا ہے کہ ہمارا پیارا وطن ابدی بقا کا حامل ٹھہرے۔ ان کی نظم ''سلامت رہے گا'' اسی پسِ منظر کی حامل ہے جو مثنوی کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔ اس ہیئت کا شمار کلاسیکی ہیئتوں میں ہوتا ہے۔ بحر متقارب مثمن سالم میں ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

نہیں تجھ سا کوئی کہیں بھی نہیں ہے
مری سرزمیں مجھ کو پورا یقیں ہے
یہ سبزہ، بہاریں، یہ وادی و کہسار
یہ جھیلیں، یہ دریا، یہ چشمے، یہ گل زار
سمندر، یہ صحرا، یہ موجیں ہوا کی

ہر اور بھرا ہے چمن پیارے لوگو
شب و روز شکرِ خدا سارے لوگو
مرا دیس گویا زمیں پر ہے جنت
رہے تا آباد شاہدہ یہ سلامت

(ص:182)

اگر شاہدہ لطیف کے فنی اور ہیئت حوالے سے بات کی جائے تو انہوں نے عروسِ سخن غزل کی خدمتِ بسیار کی ہے۔ یہ غزل ہی کی ریاض کا ثمر ہے کہ ان کی بیشتر نظمیات بھی غزل کی ہیت میں ہیں۔غزل کی ہیئت میں لکھی جانے والی نظمیات میں بھی انہوں نے مطلع و مقطع کی روایت کو بدستور زندہ رکھا۔انہوں نے نظم کی کلاسیکی ہیتوں مثلاً مثنوی، ثلاثی وغیرہ میں بھی بطریقِ احسن سخن سنجی کی ہے اور اپنی کشیدِ جاں کے جواہر لٹائے ہیں۔جدید ہیت آزاد نظم میں بھی ان کی بیشتر نظمیات ہیں لیکن غزل کی ہیئت اور روایت سے انہوں نے زیادہ تر اثرات قبول کیے ہیں۔ انہوں نے مثنوی میں بھی مقطع کی روایت سے انحراف نہیں کیا۔ یہ ان کی غزل سے بے پایاں محبت کا بین ثبوت ہے۔

وہ وطن سے بے لوث محبت کے جذبات و احساسات رکھتی ہیں۔بے لوث محبت کا یہ انداز انہیں اپنی ذات کو بھی فراموش کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔وہ اپنے دیس سے خیر خواہی اور خیر سگالی کا جذبہ رکھتی ہیں۔ ان کی تمام تر دعائیں اپنے وطن کے لیے ہیں۔مثنوی کی ہیئت میں ان کی نظم ''تمام تر دعائیں'' اس پسِ منظر میں ہے۔

تمام تر ہیں دعائیں مری وطن کے لیے
نہیں میں مانگتی کچھ اپنے جان و تن کے لیے
اگر وطن ہے تو میں ہوں مرا وجود بھی ہے
مرا نشاں بھی ہے اور مری نمود بھی ہے
اسی سے ہے مری صبحوں کی روشنی قائم

اسی سے ہے مری شاموں کی دلکشی قائم
جہاں بھی جاؤں اسی کی لگن میں رہتی ہوں
جہاں بھی ٹھہروں میں اپنے وطن میں رہتی ہوں
سبب یہ ہے کہ مری روح ہے وطن میرا
سفر میں چاہے جہاں بھی رہے بدن میرا
یہ فخر ہے کہ میں اپنے وطن کی بیٹی ہوں
کلی ہوں اور میں اپنے چمن کی بیٹی ہوں
کسی عدو کی عداوت جو اس وطن سے ہے
تو میں سمجھتی ہوں یہ مرے جان وتن سے ہے

(ص:190)

مذکورہ استشہادات واستخراجات شاہد ہیں کہ شاہدہ لطیف اپنے ملک وقوم سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ان کی فکر قومی تناظر میں بے حد وسیع ہے۔وہ بے لوث جذبات کی حامل ہیں۔ان کے نزدیک ملک وقوم کی محبت بھی ایک عبادت کا درجہ رکھتی ہے جس میں خشوع وخضوع مسرت و تمکنت کی دلیل ہے۔

شاہدہ لطیف احساسِ طرب کے آئینے میں

حزن وطرب زندگی کے دو اساسی جذبات و احساسات ہیں۔ حزن کو اس لیے تقدیم حاصل ہے کہ انسان دنیا میں روتا ہوا آتا ہے اور رلا کر دنیا سے چلا جاتا ہے مگر صرف حزن ہی تصورِ حیات نہیں ہے۔ زیست کا حقیقی حسن حزن وطرب کے توازن سے وابستہ ہے۔ متوازن زندگی بسر کرنے کے لیے حزن وطرب کا امتزاج ناگزیر ہے جس کے لیے ان دونوں عوامل میں کسی نوع کی افراط و تفریط کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ احساسِ حزن دراصل احساسِ طرب کو متوازن رکھنے کے لیے ضروری ہے اور یہی کردار طرب کا حزن کے حوالے سے بھی ہے۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ دراصل احساسِ طرب کے پسِ پردہ بہت سے عوامل مصروفِ عمل ہوتے ہیں جن میں رجائی جذبوں کے پہلو بہ پہلو اعتماد و یقین شامل ہیں جبکہ حزن کے پسِ پردہ اس کے برعکس عناصر مصروفِ کار ہوتے ہیں۔ جس طرح حزن سے انکار ممکن نہیں ہے، بالکل اسی طرح احساسِ طرب کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ احساسِ طرب کا حقیقی اور جامع مفہوم خوشی و سرمستی، کیف و سرور اور جوش وجذبہ سے عبارت ہے۔

شاعری فنونِ لطیفہ کا ایک پسندیدہ شعبہ ہے جو انسانی نفسیات کے زیادہ قریب تر ہے۔ شعریات کا مطالعہ مختلف مقاصد و ترجیحات کے تحت کیا جاتا ہے۔ یہ مقاصد تحقیقی و تنقیدی بھی ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اہلِ طرب طبقہ احساسِ حزن کی بازیافت کے لیے بھی شعر وسخن کا مطالعہ کر سکتا ہے جبکہ اہلِ حزن شاعری کا مطالعہ احساسِ طرب کی بازیافت اور تفننِ طبع کے لیے بھی کر سکتا ہے۔ اگر حزن وطرب کے احساسات میں توازن رہے تو شاعری کی مقبولیت و پسندیدگی میں بھی

متوازن کیفیت کارفرما رہتی ہے۔کلاسیکی شعری ادب میں حزنیہ عناصر کے وفور کی بدولت شاعری سے بیزاری کا ایک رویہ اجاگر ہو جس کو احساسِ طرب کے باعث کنٹرول کیا گیا۔ازمنہء رفتہ میں شاعری کا تصورحزن والم سے مربوط رہا ہے جبکہ عہدِ موجود میں شاعری کا فلسفہ حزن وطرب کے امتزاج سے عبارت ہے مگر حزنیہ امکانات کو وفور حاصل ہے۔

احساسِ طرب ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو تگ و تازِ حیات ودیعت کرتا ہے۔ ہر قسم کی پژمردگی و افسردگی سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔خصوصاً شاعری میں یہ احساس قاری کو رجائی تاثرات سے ہم آغوش کرتا ہے۔اس میں جینے کی امنگ جاگتی ہے۔اعتماد و یقین کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ہمت و حوصلے کا آدرش ملتا ہے۔اس سے قاری کو کامیاب زندگی کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ شذرہ ھذا میں ہم شاہدؔہ لطیف کے سخن کا تجزیاتی مطالعہ طربیہ احساس کے تناظر میں کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں یہ موضوع بکثرت پایا جاتا ہے،اس سلسلے میں ہم ان کے اولیں شعری مجموعہ ''معجزہ'' مطبوعہ فروری 1999ء کی منتخب غزلیات اور منتخب اشعار کو برائے استشہادات و استخراجات لائیں گے۔ مذکورہ موضوع کے ساتھ ساتھ دیگر تجزیاتی تاثرات بھی اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔

شاہدؔہ لطیف کے فحوائے بیان میں طربیہ احساسات وفور سے پائے جاتے ہیں۔ان کے شعری مطالعہ سے ایک کامیاب انسان کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جس کے اسباب وعلل میں توکل باللہ، ایثار و استغنا، رجائی امکانات،عزم وحوصلہ اور یقین واعتماد شامل ہیں۔ یہ وہ عوامل ہیں جو کسی بھی انسان کی تقدیر بدلنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔ان کے بغیر کوئی بھی شخص کامیابی وکامرانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ان کے ہاں طربیہ تاثرات کا ایک اور سبب اعلیٰ درجے کی انسان دوستی بھی ہے۔ وہ تمام انسانیت کے لیے خیر خواہی اور خیر سگالی کے احساسات رکھتی ہیں۔ان کے ہاں ایک آفاقی محبت کا تصور فروغ پاتا ہوا نظر آتا ہے جو ہر نوع کی جغرفیائی ولسانی اور مذہبی ونسلی حدود و قیود سے مبرا و ماورا ہے۔وہ ایک مثالی دنیا اور فلاحی معاشرے کی خواہاں ہیں۔اس لیے ان کے طربیہ احساسات مستعد وتوانا محسوس ہوتے ہیں جن میں زندگی کرنے کا جوش وجذبہ کارگر ہے۔

اس حوالے سے ان کی ایک غزل کا مقطع قابلِ ذکر ہے۔

میں شاہدہ دنیا ہی کو جنت سا بنا دوں
میری تو یہ نیت ہے خدا خیر کرے گا

(ص:23)

شاہدہ لطیف کے ہاں احساسِ طرب متنوع کیفیات کا حامل ہے۔ ان کے فلسفہء خوشی میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔کبھی کبھی ان کے خوشگوار احساسات رومان کی دبیز چادر اوڑھ لیتے ہیں جن کے مشاہدہ سے قاری ایک کیف وسرر کی فضا میں مسحور ہو جاتا ہے۔نظر کو سکون اور ذہن کو روشنی ملتی ہے۔محبت جادۂ منزل پر گامزن محسوس ہوتی ہے۔طربیہ احساسات کی حامل ان کی ایک پوری غزل نذرِ قارئین ہے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔''فعولن'' مفاعیلن کی محذوفی حالت ہے۔

سمندر کو کنارا مل گیا ہے
محبت کا اشارہ مل گیا ہے
نظر خیرہ ہوئی جاتی ہے جس سے
کوئی ایسا نظارا مل گیا ہے
نہیں ہے تیرگی کا خوف ہرگز
ہمیں روشن ستارا مل گیا ہے
محبت اب نہیں ہے بے سہارا
کوئی الفت کا مارا مل گیا ہے
رواں ہے شاہدہ اپنا سفینہ
اسے دریا کا دھارا مل گیا ہے

(ص:28)

ان کی شخصیت میں متانت وسنجیدگی رچی بسی ہوئی ہے۔اس لیے وہ لمحاتِ مسرت میں بھی

اپنے آپے سے باہر آنے کی قائل نہیں ہیں۔ان کے ہاں ایک تہذیبی رکھ رکھاؤ اور وضع دری ہے جس کا وہ پورا پورا التزام رکھتی ہیں۔ان کی ایک غزل کا مقطع جو بحر رمل مثمن محذوف میں ہے،جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

ہر طرف ہے اک ہجومِ سر خوشی پھیلا ہوا
شاہدہ ان محفلوں میں فاصلے رکھا کرو

(ص:33)

وہ ایک مہم جو طبیعت کی مالک ہیں۔وہ مصائب و آلام کے ماحول میں رجائی جذبوں کی امین رہتی ہیں اور خوشی کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتی ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ مشیتِ ایزدی سے حسنِ ظن رکھتی ہیں۔اس لیے وہ مستقبل کے حوالے سے پر امید ہیں۔ ہر قسم کے وہم و گمان اور شکوک و شبہات سے دور رہتی ہیں۔یہی امر ان کی شخصیت کی سچائی کی مبینہ دلیل ہے۔وہ ہر معاملے میں خیر کے پہلو کو مدِ نظر رکھتی ہیں۔زندگی کی تمام کیفیات انہیں مسرت آمیز اور نگہت بیز محسوس ہوتی ہیں۔ان کے احساساتِ طرب میں مظاہرِ فطرت اور بہار یہ عوامل کو بڑی عملداری حاصل ہے۔ان کی سرمستی و سرخوشی کا ایک راز ان کے رومان پرور خیالات میں بھی پنہاں ہے۔

جاگتی راتوں کے سارے سلسلے اچھے لگے
آنکھ میں جو جم گئے وہ رت جگے اچھے لگے
لمحہ لمحہ زندگی ہونے لگی عنبر فشاں
اب کی رت میں خوشبوؤں سے رابطے اچھے لگے
رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں دید کے منظر سبھی
پھول تیرے گلستاں کے ادھ کھلے اچھے لگے
ان سے میری خواہشوں کا ہر جہاں آباد ہے
راہِ الفت کے حسیں یہ حادثے اچھے لگے

(ص:37)

شاہدہ لطیف کے سخن میں جہاں احساسِ طرب کے اختصاصی زاویے ہیں۔ وہاں اس حوالے سے کچھ عمومی امکانات بھی ہیں۔گویا انہوں نے معاشرے کے ہر طبقے کے لیے سخن سازی کی ہے۔اس لیے ان کے ہاں ہر ذہنی سطح کا قاری اکتسابِ فیض کر سکتا ہے۔ یہی ان کے شعری تلذذ کا جواز بھی ہے۔اسلوبیاتی حوالے سے جہاں ان کے ہاں شوکتِ الفاظ کے شواہد ہیں، وہاں سہلِ ممتنع کی روایت کو بھی فروغ بخشا گیا ہے۔انہوں نے اپنی شعریات میں کبھی عام آدمی کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ عوامی نوعیت کی بھرپور شاعری کی ہے۔ان کی غزل کے دو اشعار جو اسی پسِ منظر میں ہیں اور بحرِ اوفر مربع سالم میں ہیں۔اس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہیں۔

اپنا گھر مہکا لیتے ہیں
ہر سو پھول سجا لیتے ہیں
رات زیادہ گہری ہو جب
اپنا چاند بنا لیتے ہیں

(ص:40)

ان کے ہاں خوشی کا کوئی انفرادی فلسفہ نہیں ہے۔بلکہ ان کا فلسفۂ خوشی اجتماعی نوعیت کا ہے۔ عوام الناس کی مسرت و خوش حالی ہی ان کا کیف و سرور ہے۔دراصل اعلیٰ درجے کی انسان دوستی بھی یہی ہے۔ان کے نزدیک اس سے بڑھ کر خوشی کا اور کوئی تصور نہیں ہے۔

عوام فرطِ مسرت سے ہو گئے شاداں
خوشی کا اس سے بڑا مرحلہ کچھ اور نہیں

(ص:42)

شاہدہ لطیف کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ طرب نگاری کے لیے انسانی نفسیات کو نہ صرف ملحوظِ خاطر رکھتی ہیں بلکہ اس کا احترام بھی کرتی ہیں۔وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ انسانی نفسیات کی مسرت و تمکنت کن عوامل میں پنہاں ہے۔وہ انسان کی عمومی کمزوریوں سے بھی آشنا ہیں۔وہ اپنی شعریات میں جشنِ طرب کے تمام مناظر سموئے ہوئے ہیں جن سے وہ خود بھی محفوظ ہوتی ہیں

اور قاری بھی ان سے حظ اٹھاتا ہے۔ وہ فکری حوالے سے ایسے تلازمات لاتی ہیں جو دنیائے قلب وخرد کو خوشگوار بنا دیتے ہیں جہاں پھر کسی نوع کی پژمردگی اور افسردگی کا کوئی گزر نہیں ہوتا۔ اس پیرا گراف میں شامل استخراجات ان کی غزل کے درج ذیل چار اشعار سے لیے گئے ہیں جو بحر رمل مثمن محذوف میں ہیں۔ ان کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔ ان اشعار کی ردیف نادرہ کاری کا مظہر ہے۔ یہ اشعار جہاں احساسِ طرب کے نمائندہ ہیں، وہاں نظریۂ ادب برائے ادب سے بھی تعلق رکھتے ہیں جن میں ادب آموزی کے امکانات بھی ہیں جو نئے اور پرانے لکھنے والوں سے متعلق ہیں۔

منتظر تھے جس کے کل ڈوریں پتنگیں آسماں
لوٹ کے آیا وہ پل ڈوریں پتنگیں آسماں
رنگ برنگی ہے افق پورا سماں میلے کا ہے
دیکھنا چاہے تو چل ڈوریں پتنگیں آسماں
خوب صورت رنگ و بو سے بھر گیا منظر تمام
موسموں کے پھول پھل ڈوریں پتنگیں آسماں
دل میں اک ہلچل سی تھی موسم کے تیور دیکھ کر
میں نے چاہا بر محل ڈوریں پتنگیں آسماں

(ص:116)

ان کا وصفِ خاص یہ ہے کہ وہ لمحاتِ مسرت میں بھی شرم و حیا کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتیں۔ یہ شعر ان کی فکری نادرہ کاری کی عمدہ دلیل ہے۔

گل رنگ سے رخ پر شرم و حیا برساتی ہے پھولوں کی شفق
تب ہم رنگیں خیالوں کی زلفوں کو سنوارا کرتے ہیں

(ص:118)

شاہدہ لطیف کے طربیہ احساسات میں مظاہرِ فطرت کا استخدام عمدگی اور وفور سے کیا گیا ہے

جس کے باعث ان کی شاعری سراپا آمد محسوس ہوتی ہے۔جس میں کسی نوع کا تصنع نہیں ہے بلکہ ایک فطری رچاؤ ہے جو روحِ رواں معلوم ہوتا ہے۔آمدہ غزل کی ردیف مظاہرِ فطرت سے عبارت ہے۔جدت وندرت کی عکاس ہے اور نظریہ ءادب برائے ادب سے بھی وابستگی رکھتی ہے۔

کھڑکی پہ دستک دیتی ہیں بوندیں، بادل، بارش
کتنی شوخ ہوا کرتی ہے بوندیں، بادل، بارش
دل کے دیپ میں لو دھڑکن کی اور یادیں بچپن کی
آنکھوں پر کیوں آ گرتی ہیں بوندیں، بادل ،بارش
رنگیں چھتری لے کر جب بھی گھر سے نکل پڑتی ہوں
میرے ساتھ ہی چل پڑتی ہیں بوندیں، بادل، بارش
دنیا میں ہے کون کسی کا ساتھی کون خوشی کا ؟
کاندھوں پر سر رکھ دیتی ہیں بوندیں، بادل، بارش
سوچوں میں تبدیلی آئی ویسے ہی موسم
ویسی کی اب تک ویسی ہیں بوندیں، بادل ، بارش

(ص:130)

ان کا نظریہ ءطرب زمانی ومکانی حدود وقیود سے مبرا و ماورا ہے۔وہ ایک عالمگیر اور ہمہ گیر سوچ کی حامل ہیں۔بسا اوقات ان کی طربیہ فکر مزاحمتی افکار سے ہم آغوش ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔جس سے ایک نویدِ انقلاب ملتی ہے۔

لمحات کی زنجیر سے کیا فرق پڑے گا
خوشبو ہیں تو ہر سمت اتر جائیں گے ہم لوگ

(ص:132)

ان کی غزل کے چار اشعار طربیہ تناظر میں نذرِ قارئین ہیں جو ہم بدونِ تبصرہ شاملِ شذرہ کر رہے ہیں۔دیکھتے ہیں کہ قارئین ان اشعار کے حوالے سے کیا رائے قائم کرتے ہیں۔

نکھرے نکھرے ہیں زمین و آسماں بارش کے بعد
کیسا منظر ہو گیا ہے ناگہاں بارش کے بعد
میں نے یخ بستہ ہواؤں کے سمندر طے کیے
تب نظر آئی ہے شکلِ سائباں بارش کے بعد
اس کی بوئے پیرہن بھی ساتھ لائی تھی گھٹا
آئی کھڑکی سے ہوا عنبر فشاں بارش کے بعد
بیٹھ کر کیا شعر کہنا شاہدؔہ باہر چلیں
کتنا سندر ہو گا صحنِ گلستاں بارش کے بعد

(ص:133)

شاہدؔہ لطیف کی فکر کا نکتہء کمال یہ ہے کہ وہ واژگونی و سنگینیء حالات میں بھی پریشان وملول نہیں ہوتی بلکہ ان کے جذبے مزید جواں ہوجاتے ہیں۔ یہ ان کی بالیدگیء فکر کی علامت ہے اور ان کے لیے باعثِ طرب بھی ہے۔

یہ اور بات کہ اب تک کمک نہیں پہنچی
سپاہی کوئی بھی ہارا نظر نہیں آتا

(ص:142)

ان کے احساسِ طرب کے اسباب وعلل میں یہ امر مبادی ہے کہ وہ سماجی عوارض سے محفوظ و مامون ہیں۔ اس لیے وہ پرسکون ہیں۔ ان کے مزاج میں کسی نوع کا لوبھ اور طمع نہیں ہے۔ صابرو شکار ہونا ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ شاد کام رہتے ہیں۔ ان کی غزل کا ایک مقطع اسی حوالے سے طالبِ التفات ہے۔ مقطع ھذا بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

سکوں ہے شاہدؔہ ہر پل ہمیں تو
ہمارے دل میں وحشت نہیں ہے

(ص:154)

ان کے ہاں باعثِ طرب ان کا منفرد اندازِ فکر بھی ہے کیونکہ وہ غم والم کے مہیب سائے میں بھی طرب سامانی کی قدرت رکھتی ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے لیے نئے راستے بنانے کا ہنر جانتی ہیں۔ بقول اقبال:

؎ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

اس صورتِ حال کا ادراک ان کی غزل کے اس مقطع میں ہے جو بحرِ خفیف مسدس مخبون محذوف میں ہے جو ایک مرکب مزاحف بحر ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہے۔

شاہدؔہ میری منفرد سوچیں
بھیڑ میں راستہ بنا دیں گی

(ص:155)

ان کے نزدیکِ طرب سامانی کا راز اس امر میں پنہاں ہے کہ نفرتوں اور کدورتوں کی بیخ کنی کی جائے۔ طرب آفرینی کا یہ وہ فلسفہ ہے جو خودغرضی اور بے حسی پر مبنی نہیں بلکہ انسان دوستی پر منحصر ہے۔ آفرینشِ طرب کے حوالے سے ان کا دوسرا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو صابر و شاکر ہونا چاہیے کیونکہ حریص انسان کبھی مسرت و تمکنت آمیز زندگی نہیں گزارتا۔

اب آؤ مل کے محبت کو عام کرتے ہیں
کہ نفرتوں نے تو زندہ ہی ہم کو مار دیا
میں اس کی نعمتوں کا کیا بھلا شمار کروں
عطا میں جو بھی دیا اس نے بے شمار دیا

(ص:158)

مذکورہ استخراجات شاہد ہیں کہ شاہدؔہ لطیف کے ہاں آفرینشِ طرب کے حوالے سے مختلف النوع فلسفے پائے جاتے ہیں اور ہر فلسفہ خود میں ایک شانِ بے نیازی اور استغنائی خصوصیت رکھتا

ہے جس کی اساسی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک دائیں بازو کی شاعرہ ہیں۔ مذہبی رجحانات و میلانات ان کی فکر پر حاوی ہیں۔ ایسے احباب کے ہاں طربیہ حوالے سے فزوں تر احساسات پائے جاتے ہیں۔ ایسے سخن کے تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ سے ایک صحت مند زندگی کا تصور اجاگر ہوتا ہے اور کامیاب و کامران زندگی گزارنے کی ترغیب ملتی ہے۔

شاہدہ لطیف اور خارجی عوامل

زندگی لمحہ بہ لمحہ جادۂ ارتقا پر گامزن ہے۔ نت نئے تغیرات وتصورات جنم لیتے رہتے ہیں۔ جن میں کچھ کی نوعیت خارجی حیثیت کی حامل ہوتی ہے جبکہ کچھ داخلی صورتِ حال کے عکاس ہوتے ہیں اور کچھ مخلوط نوعیت کے ہوتے ہیں جنہیں داخلی یا خارجی کسی ایک زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ خارجیت میں ظاہری عوامل زیرِ بحث آتے ہیں جبکہ داخلیت میں داخلی معاملات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور داخلی احساسات زیرِ مطالعہ آتے ہیں۔

''شاعراتِ ارضِ پاک'' جو ایک بسیط تحقیقی وتنقیدی سلسلہ ہے، اس حوالے سے راقم کی نو تصانیف ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں دو جامع ایڈیشن بھی شامل ہیں۔ اس وسیع تجزیاتی عمل کی بدولت ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ شعرا کی نسبت شاعرات کے خارجی عناصر بہت ہی کم ہوتے ہیں جس کی بنیادی وجہ ہماری مشرقی تہذیب اور بنتِ حوا کا سماجی حوالہ ہے کیونکہ ایک مشرقی عورت کائنات یا معاشرے کو پردے یا کھڑکی کی اوٹ سے مشاہدہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین پر تنگ نظری کا الزام بھی ثبت کیا جاتا ہے لیکن بفضلِ تعالیٰ شاہدہ لطیف کے ہاں ایسا ہرگز نہیں ہے کیونکہ انہیں دنیا کے متعدد ممالک کی سیر و سیاحت میسر آئی ہے۔ اس لیے ان کی وسعتِ نگاہ میں ایک کشادگی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شعریات میں داخلی عناصر کے پہلو بہ پہلو خارجی عوامل بھی بکثرت ملتے ہیں۔ شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے سخن میں پنہاں خارجیت کے شواہد آشکار کرنے کی سعی مندوب کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم نے ذاتی تحقیقی تجربے سے کام لیا کیونکہ ہمارے ہمارے نزدیک خارجی تلازمات کی بازیافت کسی عمومی شعری

مجموعہ کی بجائے منظوم سفر نامہ سے بہ آسانی کی جا سکتی ہے۔اس میں نہ صرف راقم کے لیے سہولت کا سامان ہے بلکہ قارئین کے لیے بھی آسانی کا پہلو موجود ہے۔اس سلسے میں ہم ان کے پیرس کے منظوم سفر نامہ ''برف کی شہزادی'' مطبوعہ جنوری 2004ءاور برطانیہ کے منظوم سفر نامہ ''اف یہ برطانیہ'' مطبوعہ فروری 2009ء میں سے غزلیات کے منتخب اشعار اور منتخب نظمیات تجزیاتی حوالے سے زیرِ بحث لائیں گے۔مذکورہ مجموعہ ہائے کلام تصنیفی وترتیبی اعتبار سے چوتھے اور چھٹے نمبر پر واقع ہیں۔اولاً ہم اول الذکر مجموعہء شعر زیرِ بحث لائیں گے اور ثانیاً ہم موخرالذکر مجموعہء کلام زیرِ تجزیہ لائیں گے۔

شاہدہ لطیف کے ہاں خارجی امکانات انتہائی وسعت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔جن میں معلوم و نامعلوم تلازمات کارگر ہیں۔موجودات انتہائی قریب کا حوالہ رکھتی ہیں جبکہ معدومات دورافتادہ نسبت کی حامل ہیں۔معدومات میں زاویہء استفہام حیرت واستعجاب کو جنم دیتا ہے۔جبکہ قریب ترین معاملات وافکار میں کشادگی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔مذکورہ استخراج دراصل ان کی ایک غزل کے مقطع کا مرہونِ منت ہے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔''فعولن'' مفاعیلن کی محذوفی حالت ہے۔

سفر درپیش ہے منزل کہاں ہے

جہاں ہے سامنے اور بے کراں ہے

وقت ایک ایسا تلازمہ ہے جو خود میں داخلی وخارجی تاثر سموئے ہوئے ہے یعنی دونوں طرح سے اس کے اثرات کو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے مگر خارجی حوالے سے تغیرات کی بدولت اس کی کارگزاری کا اندازہ بہ حسن وخوبی لگایا جا سکتا ہے کیونکہ وقت انسان کا ایک قیمتی اثاثہ ہے جس سے نہ صرف وہ لوگ آشنا ہیں جو اسے بروئے کار لاتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی واقف ہیں جو وقت گنوا چکے ہیں اور اس وقت کفِ افسوس ملنے میں مصروف ومنہمک ہیں اور وقت سے استفادہ کرنے والے ارتقا کے زینے طے کر رہے ہیں۔ان کی غزل کا مقطع جو خارجی پسِ منظر کا حامل ہے، خصوصاً ان لوگوں کے حوالے سے جو وقت کا ضیاع کر چکے ہیں۔مقطع ھذا سہلِ ممتنع کا سا اسلوب خود

میں سموئے ہوئے ہے اور وسیع تاثیراتی کیفیات رکھتا ہے۔ بحرِ وافر مربع سالم میں کہا گیا یہ مقطع جس کا عروضی وزن ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہے، نذرِ قارئین ہے۔

جب بھی اس سے غفلت برتیں

وقت تماشا کر جاتا ہے

(ص:56)

شاہدؔہ لطیف نے اپنے منظوم سفر نامے ''برف کی شہزادی'' جو پیرس سے متعلق ہے، میں اپنے ہر قسم کے مشاہدات کے ابواب قارئین کے مطالعات کے لیے وا کر دیے ہیں۔ انھوں نے پیرس کی تہذیب و تمدن کا غائرانہ مطالعہ پیش کر کے ترسیلِ شعور کا کام کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے بالواسطہ اور براہِ راست اہلِ مشرق کو مغربی تہذیبی یلغار سے باخبر کر دیا ہے۔ مغرب کی فحاشی اور جنسی بے راہروی کو طشت از بام کیا ہے اور حیا سوزی کے مناظر کو تجریدی انداز میں پیش کیا ہے، وہ نفسِ امارہ کی اندھا دھند تقلید کی قائل نہیں ہیں۔ وہ یورپی تہذیب میں بھی حیا افرینی کی خواہاں ہیں، وہ یہ چاہتی ہیں کہ مشرق کی طرح مغرب میں بھی شرم و شرافت کو فروغ میسر آئے۔ اس حوالے سے ان کی آزاد نظم ''سیکس شاپس'' قابلِ مطالعہ ہے جو خود میں ایک خارجی تناظر سموئے ہوئے ہے۔ یہ نظم بحر ہزج میں ہے۔

مہذب ملک میں

آنکھوں نے دیکھے وہ عجب منظر

کہ جن پر شرم سے مشرق کی بیٹی سرخ ہو جائے

کھلے بندوں تجارت سیکس کے ایسے عناصر کی

جنہیں ہم سوچ بھی سکتے ہیں نہیں ہرگز

اگر آزاد دنیاؤں میں یہ دستور ہو جائے

کہ آزادی کا مطلب صرف اپنے نفسِ امارہ کی آزادی نہیں ہمدم

تو یورپ کی ترقی لائقِ تقلید ہو جائے

گلی کوچوں میں

سڑکوں پر

حیا سوزی کے یہ منظر

اگر معدوم ہو جائیں

تو عزت، احترام و آبرو

یورپ کی سب اقوام کا مقسوم ہو جائے

(ص:81)

مذکورہ فکر کے پہلو بہ پہلو ان کی آمدہ غزل کا یہ شعر وسیع تر فکریات کا حامل ہے جس میں تحیر و استعجاب کے فزوں تر امکانات ہیں۔ شعر ھذا بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

بہت دیکھے ہیں چہرے اور منظر

تجسس پھیلتا جاتا مگر ہے

(ص:87)

شاہدہ لطیف خارجی امکانات کا بغور مشاہدہ کرتی ہیں اور اس مشاہدے میں ان کے تجارب کا عکس بھی پایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے جہالت، تیرگی اور عصری بے حسی ان کے خاص موضوعات ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے سماج کی آئینہ بندی کرتی ہیں اور خود ایک نمائندے کے طور پر سامنے آنے کے باوجود بھی پردۂ اخفا میں رہتی ہیں۔ یہی ان کا ایک فلسفیانہ انداز ہے جو انہیں سخن ورانِ عصر سے ممتاز و منفرد کرتا ہے۔

چھائی تھی ہر طرف ہی جہالت کی تیرگی

ظلمات کے بھنور سے ابھارا گیا ہمیں

(ص:102)

کچھ رفاقتیں بہت ہی حسیں اور روح پرور ہوا کرتی ہیں جو قلب و خرد اور ظاہر و باطن پر

لطیف اثرات مرتب کرتی ہیں مگر ہر انسان کے کچھ نہ کچھ حریف بھی ہوا کرتے ہیں جن میں حسد کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اپنی حسد کے باعث وہ اپنی موت آپ ہی مرجاتے ہیں۔ حسد کی جلن انہیں بے تاب رکھتی ہے کیونکہ آپ کی خوشگواری ءحالات انہیں ناگوار گزرتی ہے، اسی خارجی حوالے کا حامل ان کی غزل کا یہ مطلع قابلِ غور ہے۔ بحر سریع کے مربع وزن میں ہے جو ایک مرکب بحر ہے جس کا عروضی وزن ''مستفعلن فعولن'' ہے۔

وہ ساتھ چل رہے تھے

کچھ لوگ جل رہے تھے

(ص:105)

شاہدہ لطیف مختلف تہذیبوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتی ہیں اور اس مطالعہ سے کشیدِ شعور بھی کرتی ہیں جس کی ایمانداری سے قاری کو ترسیل کرتی ہیں۔ ان کے ہاں ماضی کی بازیافت کا عمل بھی فزوں تر پایا جاتا ہے جس میں زیادہ تر ناموافق حالات ملتے ہیں مگر وہ فردائی ادوار سے ناآسودہ و نامطمئن نہیں ہیں بلکہ رجائی امکانات پر یقین رکھتی ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ اپنی تہذیب کی زبوں حالی کی فکر ہے اور یہ اندیشہ بھی لاحق ہے کہ مستقبل میں اس کی کوئی فکر کرنے والا ہوگا یا نہیں۔ یہ ایک استفہامیہ تاثر ہے جو خود میں بے پناہ تعجب و استعجاب رکھتا ہے۔ ان کی آمدہ غزل کے دو اشعار اسی تناظر میں ہیں جو بحرِ وافر کے مسدس وزن میں ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن'' ہیں مگر ان اشعار کے عروض وضرب میں حرفی یا عددی مغائرت یا کمی بیشی کی فضا پائی جاتی ہے جو عروضی حوالے سے روا ہے۔ اس حوالے سے وہ قابلِ گرفت نہیں ہیں۔ درج ذیل اشعار میں ہر شعر کے پہلے مصرع کا وزن ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولن' ' ہے جبکہ دوسرے مصرعے کا وزن ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن' ' ہے جو بحرِ وافر کا سالم وزن ہے۔ گویا پہلے شعر کی عروضی پابندی دوسرے شعر میں بھی برقرار رکھی گئی ہے۔ وزن میں دو حرفی کمی بیشی نے فکری حوالے سے ایک کلائمکس کی فضا پیدا کر دی ہے۔ اشعار ملاحظہ کریں۔

ہم سے پہلے بھی تہذیبیں اجڑی تھیں

کوئی تو ہو گا جو پھر سے تعمیر کرے گا
مجھ کو تو بس غم ہے اپنی مٹی کا
مرثیہ مٹی کا اب جانے کون پڑھے گا؟

(ص:106)

شاہدہ لطیف کے ہاں خارجی حوالے سے سماجی تنقیدی رویے بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ سماج کے دوہرے معیار پر معترض و برہم ہیں۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ منافقت انہیں سخت ناپسند ہے کیونکہ وہ ایک دائیں بازو کی شاعرہ ہیں۔ مذہبی رجحانات ومیلانات کا ان کے قلب وخرد پر تسلط ہے اور یہ ایک ایسا تسلسل ہے جسے استقلال ودوام حاصل ہے۔

یہ شاخ شاخ چہکنا بھی کیا ضروری ہے
اگر سفیرِ وفا ہو تو اک شجر میں رہو

(ص:111)

وہ خارجی حوالے سے کچھ ایسے ادراکات سپردِ قرطاس کر جاتی ہیں جو آموزشِ حیات کا وصفِ خاص رکھتے ہیں۔ وہ مقصدیت ومعقولیت اور منطقیت ومعروضیت کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ اس حوالے سے گویا ہیں کہ اگر آپ اپنے کام سے کام رکھیں گے تو دشمن کسی صورت آپ پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ یہاں سیاق وسباق کے تناظر میں کام سے کام رکھنے کا مطلب اپنا دفاع مضبوط کرنا یعنی اگر آپ کا دفاع مضبوط ومستحکم ہوگا تو دشمن کا حملہ کرنا از محالات ہے۔

دشمن کوئی حملہ نہ کرے گا کسی صورت
دنیا میں اگر کام سے تم کام رکھو گے

(ص:118)

بسا اوقات ان کے ہاں ایک مخلوط احساس جنم لیتا ہے جو داخلیت و خارجیت کا حسین امتزاج محسوس ہوتا ہے۔ ایک جمہوری تحقیقی وتنقیدی نظریے کے مطابق عمدہ شاعری کا فکری معیار داخلی وخارجی عوامل کا سنگم ہوا کرتا ہے جس میں کسی نوع کی افراط وتفریط کی کوئی گنجائش نہیں ہوا

کرتی۔ جیسے احساسِ جدائی ایک داخلی نوعیت کا معاملہ ہے، مگر اس کا رو کر اظہار کرنا ایک خارجی پہلو رکھتا ہے، اسی طرح رسوائی ایک ایسا معاملہ ہے جو خود میں داخلی و خارجی دونوں طرح کے احساسات سموئے ہوئے مگر رسوائی کے داغ کو اشکوں سے دھونا ایک خارجی امر ہے، گویا ان کے ہاں داخلیت و خارجیت کا عمدہ امتزاج بھی کارگر ہے۔

احساس جدائی کا اسے ہو نہیں سکتا
جو شخص محبت میں کبھی رو نہیں سکتا
رسوائی کے ہر داغ سے خوف آتا ہے اس کو
دامن کو وہ اشکوں سے مگر دھو نہیں سکتا

(ص:129)

شاہدؔہ لطیف دنیا اور اہلِ دنیا کا خارجی مطالعہ رکھتی ہیں۔ دنیا کا چلن ان کے لیے باعثِ تعجب و تحیر ہے۔ یہ حیرت و استعجاب دراصل ان کا ایک تنقیدی رویہ بھی ہے جو ان کے نکتہءاعتراض کو ظاہر کرتا ہے اور معاملے کے خلافِ توقع ہونے کی عکاسی بھی ہے۔ درحقیقت وہ مثبت اقدار و روایات کا فروغ چاہتی ہیں۔ جن کی پاسداری انہیں عالمی و مقامی سماجیات میں معدوم نظر آتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی غزل کا مقطع قابلِ ذکر ہے جو انتہائی سہل و شستہ اسلوب میں ہے۔ دونوں مصرعوں میں استفہامیہ انداز نے شدتِ احساس کو فزوں تر کر دیا ہے جس کے باعث زورِ بیاں فزوں تر ہوا ہے۔ مقطع ھذا بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

رواں ہے کس طرف دنیا یہ ساری ؟
نہ جانے شاہدؔہ کیا ہو رہا ہے؟

(ص:130)

ان کی غزل کے تین اشعار بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین ہیں جن میں خارجی عوامل کو بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

بہت بڑے تھے تمہارا بھی حال دیکھ لیا
تمام رنگِ عروج و زوال دیکھ لیا
سماں بدلتے ہی شعلوں پہ تم نے رقص کیا
زمانے بھر نے تمہارا دھمال دیکھ لیا
جو خود کو حاتمِ دوراں سمجھ رہا تھا کل
جہاں نے اس کا بھی دستِ سوال دیکھ لیا

(ص:135)

ان کے ہاں سماجی وعصری رویے بھی زیرِ بحث آتے ہیں جن میں ناہمواریوں کا مذکور بھی ہے۔تلمیحاتی اور اساطیری حوالے بھی ملتی ہیں۔ان کی غزل کے دو اشعار قابلِ غور ہیں۔دوسرے شعر میں مجنوں اور فرہاد کی تلمیحات کا استخدام کیا گیا ہے۔دوہرے رویوں کی عکاسی ہے۔یہ اشعار بحر رمل مسدس محذوف میں ہیں جن کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن'' ہے۔

تم نے چھوڑا تھا ہمیں جس موڑ پر
ہم وہیں پر ہیں تمہارے بعد بھی
ایک دن ان کی حقیقت کھل گئی
کل جو مجنوں بھی تھے اور فرہاد بھی

(ص:137)

وفا ایک خارجی تلازمہ ہے جو خود میں ایک داخلی تاثر بھی رکھتا ہے۔یہی معاملہ جفا کا بھی ہے۔انہوں نے دونوں تلازمات کا استخدام کر کے صنعتِ تضاد کا التزام بہ حسن وخوبی کی ہے۔ مزید برآں ایک عصری رویے کی عکاسی بھی کی ہے جو ناہمواری اور غیر متوازن طرزِ فکر سے عبارت ہے۔براہِ راست اور بالواسطہ طور پر مکارمِ اخلاق کا حسیں آدرش دیا ہے۔یہ ایک عمومی فکری رویہ ہے جو درج ذیل اشعار میں کارفرما ہے۔شاہدہ لطیف کی مستقل مزاج سے مربوط ہے۔

کوئی کسر نہیں چھوڑی وفا میں ہم نے مگر

کسی نے اپنی طرف سے جفا نہیں چھوڑی
جہاں نے چھوڑی نہیں بے وفائی کی عادت
تو شاہدہ نے بھی راہِ وفا نہیں چھوڑی

(ص:140)

تخیل ایک داخلی تلازمہ ہے۔اس کے برعکس حقیقت ایک خارجی تاثر کی حامل ہے جس کی نمو باطن سے ہوتی ہے۔ اکثر اوقات مشاہدات میں تخیل اور حقیقت ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں جس سے ناہموار و ناخوشگوار سماجی رویہ جنم لیتا ہے۔

تخیل و حقیقت میں بہت فاصلے پائے
جیسا اسے سوچا ہے وہ ایسا بھی نہیں ہے

(ص:114)

شاہدہ لطیف کے ہاں جہاں دیگر عصری رویے پائے جاتے ہیں، وہاں قحط الرجال کا حوالہ بھی ہے جو رجولیت کے فقدان کا مظہر ہے۔جس کے باعث ایک شدید نوعیت کے احساسِ تنہائی کا المیہ وجود میں آتا ہے اور خلوص و موانست کے خصائص معدم ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی اقدار و روایات دم توڑ جاتی ہیں۔انسان دوستی پامال ہو جاتی ہے۔اسی پس منظر میں ان کی غزل کا ایک شعر قابلِ توجہ ہے جو بحرِ ہزج مسدس محذوف میں ہے۔جس کے عروضی ارکان ’’مفاعیلن مفاعیلن فعولن‘‘ ہیں۔

سنائیں جس کو دل کا حال ہم بھی
وہ ہستی معتبر ملتی نہیں ہے

(ص:145)

ان کی آزاد نظم ’’جدا مٹی، جدا خوشبو‘‘ بھی خارجی تاثر کی حامل ہے جو بحر ہزج میں ہے۔اس نظم میں جہاں بے شمار خارجی شواہد ہیں، وہاں مظاہرِ فطرت کا التزام بھی بہ حسن و خوبی کیا گیا ہے۔ نظم ھذا حب الوطنی کا ایک خوبصورت حوالہ بھی ہے جس میں پاکستان اور پیرس کا تقابلی مطالعہ بھی

ہے اور جمالیاتی احساس کا مظہر بھی ہے۔

پرندے بھی چہکتے ہیں
وہی سورج نکلتا ہے
وہاں کے سب مکیں بھی سانس لیتے ہیں
صبا چپکے سے بالوں سے رگڑ کھا کر
گزرتی ہے
وہی راتیں
وہی ہے چاند جو آ کر ادھر بھی چاندنی
کی زرد موجوں سے گزرتا ہے
مگر کیا ہے
یہاں ہے اور وہاں ہوتا نہیں ہے
وطن کو لوٹ کر آئی
زمیں پر جب قدم رکھا تو خوشبو نے
مجھے سرمست کر ڈالا
مری مٹی بہت ہی مختلف نکلی
جدا تھی اس کی خوشبو بھی
یہی تو مختلف نکلا

(ص:150)

اب ہم ان کے دوسرے منظوم سفر نامہ ''اف یہ برطانیہ'' کی بابت بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ صرف ہمارا موقف نہیں ہے بلکہ ایک مبینہ حقیقت ہے کہ جو سفر نامہ جس قدر خارجی امکانات کا حامل ہوگا، وہ اسی قدر کامیاب و کامران اور معتبر و وقیع ہوگا۔ مذکورہ بالا استخراجات سے آپ ان کے اولین سفر نامے کے خارجی امکانات کے حوالے سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ

کس قدر خارجی عوامل خود میں سموئے ہوئے ہے۔

شاہدہ لطیف کے ہاں خارجی امکانات کے تناظر میں مظاہرِ فطرت کی عمل داری پورے وثوق سے مشاہدہ کی جا سکتی ہے جس کی بدولت ان کے سخن کا فطری رچاؤ آشکار ہوتا ہے۔ ان کا کلام سراپا آمد محسوس ہوتا ہے۔ تصنع اور بناوٹ کی آلائشیں گریز پا نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں کائنات کا ارتقا خود میں ایک خارجی حوالہ بھی رکھتا ہے۔ بطریقِ احسن مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جدید معاونات کی بدولت فاصلے سمٹ کر رہ گئے۔ سالوں کی مسافتیں گھنٹوں اور منٹوں میں طے ہونے لگی ہیں۔ دنیا ایک گلوبل ویلیج بن کر رہ گئی ہے۔ بحر متقارب مثمن سالم میں کہا گیا ان کی ایک غزل کا مطلع و مقطع لائقِ توجہ ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

سفر میں نیا اک جہاں دیکھتے ہیں
معلق زمیں آسماں دیکھتے ہیں
کہاں شاہدہ فاصلے رہ گئے ہیں
کہ گاؤں میں سمٹا جہاں دیکھتے ہیں

(ص:114)

ان کی آزاد نظم ''زندگی سفر میں ہے'' سفرِ حیات سے مربوط ہے جس میں زیست کے نشیب و فراز کو بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے اور خود میں خارجیت کے بہت سے پہلو سموئے ہوئے ہے۔ نظم ھذا بحر ہزج مقبوض میں ہے۔

مدام اک سفر میں ہے
مسافتوں کی راہ کے بسیط

بام و در میں ہے
کبھی کسی کھنڈر میں ہے
کبھی کسی نگر میں ہے
سفر نہ ہو تو زندگی لہو کا انجماد ہے

فقط حیاتِ بے کراں کی اک بھولی یاد ہے
سفر ہے شرط زندگی کی تازگی کے لیے
شگفتگی کے واسطے
اسی لیے ہوا کے ساتھ
زندگی سفر میں ہے
سفر میں ہے یہ زندگی

(ص:16)

خارجیت کا ایک پہلو عصری رویوں کی بازگشت بھی ہے جن میں گومگو کی کیفیت بھی ہے، متضاد و متنوع خیالات بھی ہیں۔ دوہرے معیار کی عکاسی بھی ہے۔ گویا ایک گنگا جمنی فضا تشکیل پاتی ہے جس سے نتائج کشی میں دشواری کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی ایک غزل کا مطلع شاملِ استشہاد ہے جس کے عروضی ارکان "مفاعیلن مفاعیلن فعولن" ہیں۔ "فعولن" مفاعیلن کی محذوفی حالت ہے۔

دنیا میں لایعنیت کا فروغ اربابِ فکر و نظر کے لیے ایک بہت بڑا عصری رویہ ہے جو معاصر شعری ادب میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے جسے فکری بیداری کے فقدان کی علامت بھی گردانا جا سکتا ہے اور قحط الرجال کی دلیل بھی ہے۔ کمزور کرداروں کی عکاسی بھی ہے۔ خارجی طور پر اس کا اظہار بالیدہ فکری کے حوالے سے سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ خرد آموزی کی اہمیت کا حامل ہے۔

ہم ایسے عہد میں ہیں شاہدہ لطیف جہاں
کہ جو ضروری نہیں وہ بڑا ضروری ہے

(ص:60)

خوشگواری اور ناخوشگواری کا سفر تا حیات جاری و ساری رہتا ہے مگر عموماً حالات نامساعد رہتے ہیں۔ لیکن انسان کو امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بلکہ مستقبل کے حوالے سے حسنِ ظن

رکھنا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ساری کائنات آپ کے موافق ہوجاتی ہے اور آپ ورطہء حیرت میں کھوجاتے ہیں۔ اسی حوالے سے ان کی ایک غزل کا مقطع زیبِ قرطاس ہے جو بحر رمل مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

یہ تو سوچا بھی نہ تھا ہم نے کبھی
ساری خلقت مہرباں ہو جائے گی

(ص:75)

عموماً غزل کی بجائے نظم میں خارجی تاثر زیادہ موثر انداز میں اجاگر ہوتا ہے۔ ان کی نظم ''ساحلِ سمندر پر'' داخلیت وخارجیت کا حسیں امتزاج ہے جس میں زندگی کی خارجی وداخلی کیفیات کو منظوم کیا گیا ہے۔ یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں ہے جو کلاسیکی ادبی عہد میں زیادہ مقبول رہی ہے۔ عہدِ موجود میں اگرچہ مثنوی لکھی جارہی ہے لیکن اسے وہ پذیرائی نہیں مل سکی جو اسے متقدمین کے دور میں حاصل تھی۔ یہ نظم بحر رمل مثمن محذوف میں ہے۔ اس میں سے صرف ایک شعر نذرِ قارئین ہے۔

زندگی جیسے اچانک جاگ اٹھتی ہے یہاں
تب نظر آتی ہے خلقت کارواں در کارواں

(ص:78)

اسی فکری تسلسل کی حامل ان کی نظم ''لندن کی اک شام'' بھی ہے جو مذکورہ بالا ہیئت اور وزن وبحر میں کہی گئی ہے۔ اس میں سے بھی ایک شعر شاملِ شذرہ ہے۔

روشنی اور قمقموں کا اک ہجومِ بے کراں
زندگی گویاں یہاں پر مہرباں ہی مہرباں

(ص:79)

خارجی مناظر جب انسان کے قلب وخرد میں گھر کر جاتے ہیں اور انسان ان سے مانوس ہو جاتا ہے، تو پھر وہ داخلی احساس کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اسی حوالے سے ان کی غزل کے تین

اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں حب الوطنی کا حوالہ نمایاں طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ غزل بحر ہزج مثمن سالم میں کہی گئی ہے۔

ہمیں اپنے وطن کی سب فضائیں یاد آتی ہیں
وہ موسم یاد آتے ہیں، ہوائیں یاد آتی ہیں
جو زادِ راہ میں باندھی گئیں ساری محبت سے
مجھے وہ میرے اپنوں کی دعائیں یاد آتی ہیں
وہ سرسوں اور مکئی کی اور خوشبو اپنے گیہوں کی
مرے اہلِ وطن مجھ کو بتائیں یاد آتی ہیں

(ص:96)

سماجیات کا مطالعہ خارجی حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ وہ مفید و معاون ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو انسانوں سے محبت کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے مگر برطانیہ کے لوگوں کی کتوں سے موانست خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''برطانیہ کے لوگ'' لائقِ توجہ ہے۔ اس میں پاکستان اور برطانیہ کی معاشرت کے تقابلی مطالعہ کا حوالہ بھی ہے۔ درسِ آموزش کا ایک انداز ہے جو بین السطور کارفرما ہے۔ نظم ھذا مثنوی کی ہیئت میں ہے۔

کتوں کے دوست بھی ہیں یہ انساں کے ہی نہیں
محفل کے یار بھی ہیں بیاباں کے ہی نہیں
کتوں کی بود و باش کا کتنا خیال ہے
برطانیہ کے لوگوں کی روشن مثال ہے
اپنے وطن میں قدر تو انساں کی بھی نہیں
مظلوم اور حال پریشاں کی بھی نہیں
مغرب سے سیکھنا ہے سبق ہم کو پیار کا
کیا فائدہ ہے ورنہ چمن کی بہار کا

(ص:151)

شاہدہ لطیف کی نظم ''دیس انگلستاں'' وسیع تر خارجی تاثر کی حامل ہے جس میں علم و آگہی کی درس گاہوں کا مذکور ہے اور ان کے معتبر ہونے کا حوالہ بھی ہے۔ پھر سیاحتی حوالے سے سیر گاہوں کی بات کی گئی ہے۔ کشادہ اور چمکتی سڑکوں کا بیان بھی ہے۔ دنیا میں انگلستان کے منفرد ہونے کا ذکر بھی ہے اور اسے ایک عظیم ریاست کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آدمیت اور احترامِ زندگی کی کیفیات ہیں۔ ریاست اور عوام کے باہمی تعلقات جو خلوص و مروت پر مبنی ہیں، کا احوال ہے۔ مجموعی طور پر ریاست کے انتظام و انصرام کی تعریف کی گئی ہے۔ مختصر ملک ہونے کے باوجود یہ ملک ایک نرالی شان و شوکت رکھتا ہے۔ پھر ماحولیات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ پھر اہلِ فرنگ کی مہمان نوازی کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک مختصر سی نظم کے پیمانے میں اتنے خارجی امکانات کا استخدام یقیناً ان کے کمالِ فن کی علامت ہے۔ نظم ھذا مسدس کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔ اس نظم میں ٹیپ کا مصرع ''اے عظیم اقلیم انگلستان تو سب سے الگ'' ہیئتی حوالے سے ایک گیت کا سا سماں پیدا کر رہا ہے۔ اس نظم کو آپ بھی پڑھیے اور اپنی رائے قائم کیجیے۔ یہ نظم بحرِ رمل مثمن محذوف میں ہے۔

آگہی اور علم کی سب درسگاہیں معتبر
چشمِ عبرت سے بھری یہ سیر گاہیں معتبر
تازگی ، آمادگی ، یہ سادگی ، حیرانگی
ہیں کشادہ اور چمکتی شاہراہیں معتبر
ساری دنیا میں تری پہچان تو سب سے الگ
اے عظیم اقلیم انگلستان تو سب سے الگ

O

آدمیت کا بھرم اور احترامِ زندگی
ہے ترا دستور یہ سب کچھ بنامِ زندگی
ہے ریاست اور رعیت باہمی شیر و شکر

کس قدر اعلیٰ ہے تیرا انتظامِ زندگی
مختصر سا ملک اور یہ شان تو سب سے الگ
اے عظیم اقلیم انگلستان تو سب سے الگ

O

بے کثافت شہر ہیں اور زندگی رواں دواں
کس قدر شفاف دکھتا ہے یہاں سے آسماں
ہے زمیں گویا یہاں پر سبز اور نیلا فلک
اس جہاں میں جیسے ہے اک مختلف رنگِ جہاں
میزبانی میں بھی اک آن تو سب سے الگ
اے عظیم اقلیم انگلستان تو سب سے الگ

(ص:154)

شاہدہ لطیف کے دونوں منظوم سفرناموں کے غائرانہ تجزیاتی مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کے ہاں بھرپور نوعیت کی خارجیت پائی جاتی ہے کیونکہ خارجیت کے بغیر داخلیت تک رسائی ناممکن ہوا کرتی ہے۔ گویا ان کا سخن وسیع تر خارجی امکانات کا حامل ہے۔ یہاں یہ امر ان کی کامیاب وکامران سخن سازی کا جواز بھی ہے۔

شاہدہ لطیف کے سخن کا تعلیاتی تناظر

اقلیمِ سخن کی فکریات کا انحصار جہانِ تخیلات پر ہوتا ہے جس میں داخلی و خارجی ہر نوع کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ کسی سخن گستر کا کلام اس کا آئینہء ادراک ہوا کرتا ہے جس میں ہر قسم کے افکار کارفرما ہوتے ہیں۔ شاعری میں مختلف صناؤ بدائع کا استخدام بھی ہوتا ہے جن میں شاعرانہ تعلیٰ بھی ایک شعری صنعت ہے۔ جس میں سخن ور ادراکِ ذات اور ادراکِ فن کے حوالے سے اپنے ذاتی شواہد پیش کرتا ہے۔ وہ اس حوالے سے صنعتِ مبالغہ کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ صنعتِ مبالغہ کیا ہے؟ کسی امر کو شدت وضعف میں اس حد تک پہنچا دینا کہ اس حد تک اس کا پہنچنا محال ہو یا بعید ہوتا کہ سننے والے کو یہ گماں نہ رہے کہ اس وصف کا اب کوئی مرتبہ باقی ہے۔ متقدمین ومتوسفین اور معاصرین کے فحوائے شعر میں تعلیات بکثرت ملتی ہیں۔ شاعرانہ تعلیٰ کے اسباب وعلل میں بہت سے عوامل شامل ہوتے ہیں جن میں کسی سخن ور کا ادراکِ ذات اور ادراکِ فکر وفن مبالغہ آمیز پیرائے میں ملتا ہے۔ شاعر اپنی تعریف وتوصیف کی مختلف کیفیات بیان کرتا ہے جو فکری و فنی ہونے کے پہلو بہ پہلو شخصی بھی ہوسکتی ہیں۔ علاوہ ازیں لسانی واسلوبیاتی پہلو بھی ہوسکتا ہے۔ جب کسی بھی سخن ساز کے ہاں ادراکِ فکر وفن نمو پاتا ہے تو اس کے اعتراف کے طور پر شاعرانہ تعلیات کا ورود ہوتا ہے۔ اس کا ایک سبب شاعر کو سماج سے ملنے والا خراجِ تحسین بھی ہوسکتا ہے۔ شاعرانہ تعلیٰ غزل یا نظم کے کسی بھی شعر میں ہوسکتی ہے مگر زیادہ تر اس کا مقام غزل کا مقطع ہوتا ہے۔ مقطع کے علاوہ بھی تعلیات کی امثال ملتی ہیں۔ بقول راقم:

بے فروغ و بے اثر تھی دہر میں

شاعری کو پُر اثر میں نے کیا

شاہدؔہ لطیف کے سخن میں تعلیات کی ایک متوازن و معتدل فضا ملتی ہے۔ نہ اسے ہم تعلیاتی وفور قرار دے سکتے ہیں اور نہ اسے فقدان سے عبارت کر سکتے ہیں۔ گویا انھوں نے اپنے آپ کو افراط و تفریط کی دونوں آلائشوں سے محفوظ و مامون رکھا۔ شذرہ ھذا میں ہم ان کی چھ تخلیقی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ تعلیاتی تناظر میں پیش کر رہے ہیں اور ان کے مجموعہ ہائے کلام کے تعلیاتی افق کو زمانی ترتیب کے اعتبار سے زیرِ بحث لائیں گے۔ اولاً ہم ان کے اولیں شعری مجموعہ ''معجزہ'' کو تعلیاتی حوالے سے زیرِ تجزیہ لا رہے ہیں۔

ان کے ہاں شاعرانہ تعلّی بلند و بانگ دعووں کی حامل نہیں ہے۔ ان کی فکریات اعتدال سے عبارت ہیں بلکہ ایک خفیف اور لطیف انداز ہے جو دھیمے پن کی علامت ہے، جسے تہذیب و شائستگی سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

وہ اپنے سماج میں بے عملی اور لایعنیت کے فروغ کا مشاہدہ کرتی ہیں اور مقصدیت کی ترغیب دیتی ہیں۔ براہِ راست اور بالواسطہ طور پر سعیِ پیہم کی تلقین و تاکید کرتی ہیں۔ وہ اپنے معاشرے میں تخریبی عناصر کی بیخ کنی چاہتی ہیں۔

ہمارے چار سو شاطر نگاہیں
ہمی تو شاہدؔہ کچھ کر رہے ہیں

(ص:34)

وہ شرم و حیا اور شرافت کی اقدار و روایات کی پاسدار ہیں۔ ان کے ہاں اسلامی و مشرقی تہذیب کا ایک رچاؤ پایا جاتا ہے۔ وہ بے باک افکار و نظریات کی حامل ہیں۔ کسی بھی عقوبت کا خوف و خطر انہیں اپنی روایت سے انحراف پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ان کی فکر اور کردار ان کی عظمت کی دلیل گردانے جاتے ہیں۔

کھڑی ہوں شاہدؔہ اپنی گواہی کی قسم لے کر
سزا اپنی جگہ ہے اور حیا اپنی جگہ ہے

(ص:35)

وہ اپنی فکر اور کردار سے مطمئن نظر آتی ہیں۔ انہیں اپنی شخصیت پر پورا اعتماد ہے جس کا مشاہدہ وہ سماج سے ملنے والے خراجِ تحسین سے بھی کر چکی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی غزل کا مقطع جو شاعرانہ تعلیٰ کا حامل ہے، نذرِ قارئین ہے۔ اس میں وہ اپنی مقبولیت و پذیرائی کا اعتراف کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ادراکِ ذات سے متضمن ہے۔ مقطع ھذا بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہیں۔ یہ ایک مرکب بحر ہے۔

شاہدہؔ تیری گونج ہے ہر سو
ہے الگ تیری شان بھی اپنی

(ص:36)

وہ مادیت پسند رویوں سے گریزاں ہیں۔ ان کے نزدیک گنجِ افکار ہی بہت بڑا سرمایہ ہے جس پر وہ فاخر و نازاں بھی ہیں۔ مادی سرمائے کی نفی ان کا بہت بڑا موضوعِ سخن ہے۔ شاعرانہ تعلیٰ کا حامل ان کا مقطع دیکھیے۔

حصولِ دولتِ افکار شاہدہؔ ہے ہنر
یہی اثاثہ ہے سب کچھ مرا، کچھ اور نہیں

(ص:43)

شاہدہؔ لطیف کی شعریات میں اپنی مٹی کی خوشبو اور بو باس رچی بسی ہوئی ہے جسے وہ اپنے لیے سرمایۂ نازش قرار دیتی ہیں۔ یہ افتخار انہیں افلاک سے بھی برسرِ پیکار رکھتا ہے۔ اصل میں یہی ان کی خودی اور ایغو ہے۔ جسے ان کی انا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو انہیں اعلیٰ مدارج پر فائز کرتی ہے۔ کسی نوع کے خوف کو ان کے قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کا یہ شعر جو شاعرانہ تعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے، نذرِ قارئین ہے۔

میری مٹی کی ہے تاثیر ایسی
میرا افلاک سے جھگڑا رہے گا

(ص59)

وہ اپنے آپ کو اپنے سماج سے کچھ مختلف ومنفرد خیال کرتی ہیں۔جس کا سبب ان کی مقبولیت و پذیرائی بھی ہوسکتا ہے۔ان کی تخلیقی وغیر تخلیقی تصانیف بھی ہوسکتی ہیں۔یا پھر سماج سے ملنے والا خراجِ تحسین بھی ہوسکتا ہے۔مزید برآں ان کا مخصوص اندازِ فکر بھی ہوسکتا ہے۔یا ان کی شخصی معقولیت ومنطقیت اور معروضیت وسنجیدگی بھی ہوسکتی ہے۔علاوہ ازیں ان کی مشرقی واسلامی اقدار وروایات کی پاسداری بھی ہوسکتی ہے۔انہیں یہ دکھ ہے کہ دنیا اور اہلِ دنیا کو ان امور کا ادراک کیوں نہیں ہے۔

میں ہوں بس شاہدہ کچھ مختلف سی
یہ اس کی سوچ میں سب کیوں نہیں ہے؟

(ص:62)

وہ بے خوف جذبات واحساسات رکھتی ہیں کیونکہ انہیں اپنی ذات پر مکمل اعتماد ویقین حاصل ہے۔انہیں اپنے مقابلے میں طاغوتی اور بائیں بازو کی طاقتوں کو خاطر میں لانا مناسب نہیں ہے۔ اسے ان کی جرات و جسارت اور حریت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے جو ان کے جواں جذبوں کی دلیلہے۔ہمارے نزدیک ان کی بے خوفی کا کلیدی سبب خدا خوفی اور توکل باللہ ہے جس کے باعث انہیں فزوں تر عزم وحوصلہ اور ہمت ملتی ہے۔

ڈرنا نہیں شاہدہ کسی سے
ہر بزم میں سر اٹھا کے رکھنا

(ص:72)

شاہدہ لطیف کے نویں شعری مجموعہ میں خالد شریف جو معروف شاعر وادیب اور ناشر ہیں، نے اپنے تاثرات میں انہیں انا کی شاعرہ قرار دیا ہے۔ہم ان کی اس رائے کی تائید کرتے ہیں

کیونکہ ان کے فکر وسخن میں انانیت کا جذبہ وفور سے ملتا ہے۔ جسے خودی یا ایغو سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ جب بات انا کی ہوتی ہے تو ان کے ہاں محبت بھی پیچھے رہ جاتی ہے اور انا پیش رفت کر جاتی ہے۔ یہی ان کا اعجازِ فکر وفن ہے۔

ہمیں شاہدؔہ وہ سمجھتے نہیں ہیں
محبت نہیں ہم انا مانگتے ہیں

(ص:80)

ان کے ہاں ضد بھی انا کا ایک خارجی روپ ہے۔ وہ اپنی انا میں اس قدر ریختہ اور راسخ ہیں کہ اس کے سامنے کسی بھی چیز کا ٹھہرنا محال ہے۔ ان کی انا درجہء رسوخ کو پہنچی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں انا کا ایک سخت گیر تصور ہے جس میں کسی اور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی ایک غزل کا مقطع جو شاعرانہ تعلیٰ کا حامل ہے، قابلِ ذکر ہے۔ اس کے عروضی ارکان "مفاعیلن مفاعیلن فعولن" ہیں۔

یہ ضد ہے شاہدؔہ میری انا کی
یہ دل اب غیر کا ہوتا نہیں ہے

(ص:102)

اسی فکری تسلسل کا حامل ان کی ایک اور غزل کا تعلیاتی مقطع لائقِ توجہ ہے۔

دامن ہے شاہدؔہ مرا آئینہ ء وقار
چاہت کے پھول رکھتی ہوں لیکن انا کے ساتھ

(ص:106)

اب ہم ان کے دوسرے شعری مجموعہ "میں پاکستانی ہوں" کے تعلیاتی تناظر میں اپنے موضوع کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مذکورہ مجموعہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ ان کی ایک قومی نوعیت کی تصنیف ہے۔ جسے ان کا معتبر ونمایاں حوالہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہء کلام میں شامل تعلیات قومی وتاریخی نوعیت کی حامل ہیں۔

شاہدہ لطیف اپنے آپ میں ایک تاریخی روح موجزن پاتی ہیں۔ یہ وصف ان لوگوں کے ہاں پایا جاتا ہے جو اپنے اسلاف کی اہمیت سے بخوبی آشنا ہوتے ہیں اور انہیں مشعلِ راہ بناتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے اسلاف اور ان کے مقلدین اپنے نفسِ امارہ کے خلاف بہترین جہاد کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔اس امر کا ادراک شاہدہ لطیف کے اس تعلیاتی مقطع میں بھی کارفرما ہے۔

ہے مجھ میں شاہدہ محمود غزنوی کی روح
کہ اپنی ذات کا مندر گرا کے نکلی ہوں

(ص:33)

انہیں مکمل ادراکِ ذات حاصل ہے۔ ہمت وحوصلہ، جرات و جسارت،عزم واستقلال اور روح پرور احساسِ طرب ان کی ذات کے نمایاں استعارے ہیں۔س لیے زندگی میں کبھی انہیں احساسِ کم مائیگی نہیں ہوا۔اسی احساس کا مظہران کی غزل کا یہ مقطع ہے جس میں ایک تعلیاتی تاثر پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو شہزادی خیال کرتی ہیں اور اپنے پیارے دیس پاکستان کو ایک عالی شان قصر سے موسوم کرتی ہیں۔

میں شاہدہ ہوں اک شہزادی
اور قصرِ عالی شان کی ہوں

(ص:62)

ان کے تعلیاتی افکار میں اساطیری تلمیحاتی حوالے بھی ملتے ہیں جن سے نسائی احساس کی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو باوفا اور مضبوط شخصیت سمجھتی ہیں۔جس کو وہ اپنی زندگی اور کردار سے بھی باور کراتی ہیں۔

رانجھے تو مل ہی جائیں گے ہر گام پر یہاں
میری طرح کی دوسری ایک ہیر بھی تو ہو

(ص:83)

وہ ایک مشکل پسند طبیعت کی مالک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مہم جوئی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ ان کی شخصیت کا یہ وصفِ خاص انہیں بہت سے کارناموں کا حامل قرار دیتا ہے۔ جو ان کی نادرہ کاری سے مربوط ہے۔ مشکل کام کرنا انہیں از حد پسند ہے۔

نمودِ نخل نہیں شاہدہ لطیف جہاں
چمن وہاں بھی کھلانا ہماری عادت ہے

(ص:89)

شاہدہ لطیف سعیِ پیہم پر یقین رکھتی ہیں اور تقدیر کو کاوش و کوشش کا ثمر قرار دیتی ہیں۔ بقول راقم:

عیاں یہ زمانے کی تصویر میں ہے
تعلق سا اک سعی و تقدیر میں ہے

اس لیے وہ عاملوں، نجومیوں اور پیروں پر یقین نہیں رکھتیں۔ بلکہ اسے قدامت پسندی خیال کرتی ہیں کیونکہ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی تقدیر ان کے ہاتھ میں ہے یعنی ان کی دسترس میں ہے۔ تقدیر کا ہاتھ میں ہونا بہت بڑا دعویٰ اور بہت بڑی شاعرانہ تعلّی ہے۔

تقدیر شاہدہ ہے تری اپنے ہاتھ میں
مت عاملوں، نجومیوں، پیروں کی سمت دیکھ

(ص:101)

اپنی ادبی بقا کا زعم اور یقین ہر سخنور کو ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ بصورتِ دیگر ادب کا یہ کارواں ساکت و جامد ہو جائے گا۔ یہی احساس ہی اصل میں ادب کی بقا و ارتقا کا ضامن ہے۔ کچھ اہلِ سخن کے ہاں اس حوالے سے کچھ خارجی شواہد ہوتے ہیں اور کچھ ویسے ہی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ شاہدہ لطیف ایک ایسی شاعرہ ہیں جن کے پاس اس حوالے سے مضبوط و مستحکم خارجی شواہد موجود ہیں اور وہ خارجی شواہد کیا ہیں، حکومتی اور ادبی سطح پر حاصل ہونے والا خراجِ تحسین ہے۔ عوامی سطح پر حاصل ہونے والی مقبولیت ہے۔ گویا ہمیں یہ کہنے میں کسی نوع کا کوئی باک نہیں

ہے کہ ان کے ہاں تندرست وتوانا فزوں تر خارجی شواہد موجود ہیں اور وہ کسی نوع کی خوش فہمی میں مبتلا بھی نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے زعم اور یقین میں ایک پختگی کی فضا پائی جاتی ہے جس میں ایک معقولیت ومنطقیت اور معروضیت کی کیفیات ملتی ہیں۔

رہوں گی مر کے بھی زندہ میں اپنے شعروں میں
یقینی امر ہے یہ شاہدہ گماں نہیں

(ص:107)

ہم نے قبل ازیں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ شاہدہ لطیف کی تعلیات میں بلند بانگ دعوے نہیں ہیں بلکہ ان کے قول وفعل میں ایک توازن واعتدال ہے۔ ان کا قول اصل میں ان کے تہذیبی رکھ رکھاؤ اور وضع داری سے مربوط ہے جس میں ایک استدلالیت پائی جاتی ہے۔

ہم شاہدہ وہ کرتے نہیں جو نہ کر سکیں
کرنے کے جو بھی کام ہیں کرتے ضرور ہیں

(ص:108)

شاہدہ لطیف کی تعلیات کے غائرانہ مطالعہ سے یہ حقیقت پایہء ثبوت کو پہنچی ہے کہ ان کی تعلیات کے اسباب وعلل میں خارجی شواہد اور مقبولیت و پذیرائی شامل ہیں۔ شاعرانہ تعلّی کا حامل ان کی غزل کا ایک مقطع اسی پسِ منظر میں پیشِ نظر ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اشعار میں ہے جان بہت
کیوں نہ پھر شاہدہ اک در ہو تو شش در باندھے

(ص:110)

اسی فکری تسلسل کا حامل ان کا ایک اور تعلّی آمیز مقطع دیکھیے:

احترام ان کا میں اب شاہدہ کیسے نہ بڑھاؤں
میری تعظیم میں کب لوگ کمی کرتے ہیں

(ص:128)

ان کے تعلیاتی اظہار میں ایک جمالیاتی احساس بھی کارفرما ہے جسے وہ اپنا حوالہ قرار دیتی ہیں۔

شاہدہ نکہتِ گل ہم ہیں لطافت کی قسم
ساری دنیا میں یہی اپنے حوالے جائیں

(ص:131)

بقول ان کے ان کا سخن منفرد اسلوب کا حامل ہے جس کے باعث وہ جہانِ سخن میں نئی روش اختیار کرنے کی خواہاں ہیں اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان کا کلام مقصدیت کے فروغ سے مملو ہے جسے ان کا ایک اظہاری قرینہ اور مدعا نگاری کا ہنر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی تعلیاتی تاثر کا حامل ان کا مقطع دیکھیے جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

الگ شہرِ سخن میں شاہدہ رستا بنانا ہے
فقط اسلوب کا اپنا سہارا لے کے آئی ہوں

(ص:139)

بلند حوصلگی کے حوالے سے ان کی ایک غزل کا شاعرانہ تعلّی آمیز مقطع ملاحظہ کریں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔ ''فعولن'' مفاعیلن کی محذوفی حالت ہے۔

نہیں ہے شاہدہ دور آسماں بھی
ہمالا سے بلند اب حوصلے ہیں

(ص:140)

شاہدہ لطیف کی شاعرانہ تعلیات کے اسباب و وجوہات میں جہاں بہت سے دیگر عوامل شامل ہیں، وہاں احساسِ تشکر، رجائی احساس اور احساسِ طرب بھی شامل ہیں۔ عمومی مشاہدے اور تجربے کی بات ہے کہ جن سخنوروں میں مذکورہ عوامل فزوں تر ہوں، ان کا تعلیاتی کینوس بھی

بسیط وعریض ہوگا۔

شاہدہ رب نے نہ رکھا تشنہ کام
خوش نصیبی ہے کہ میں سیراب ہوں

(ص:177)

نسائی حوالے سے ان کی غزل کا ایک تعلیٰ آمیز مطلع قابلِ غور ہے جس میں ہمت وحوصلے کے حوالے سے معشر اناث کی ڈھارس بندھائی جا رہی ہے جس میں ثابت کیا جا رہا ہے کہ عورت کو صرف صنفِ نازک نہ سمجھا جائے بلکہ وہ ایک مضبوط چٹان کی صورت میں بھی ڈھل سکتی ہے۔عمومی مردانہ رویوں کے مطابق عورت کو حقیر سمجھا جاتا ہے لیکن خواتین اپنے طرزِ عمل اور مستقل مزاجی سے خود کو باور کرا سکتی ہیں جیسے شاہدہ لطیف نے اپنے آپ کو باور کرایا ہے۔

میں کہ عورت کی شان بن کے رہی
عمر بھر اک چٹان بن کے رہی
میں نے قائم رکھا وقار اپنا
عمر بھر عالی شان بن کے رہی

(ص:178)

اب ہم ان کے تیسرے شعری مجموعہ ''معرکہء کشمیر'' کی تعلیات کو شاملِ شذرہ کرتے ہیں۔مجموعہ ھذا خود میں ایک قومی وملی حوالہ بھی رکھتا ہے۔

ان کی شعریات میں فروغِ صداقت ہے۔اس لیے وہ بے باک اور نڈر محسوس ہوتی ہیں۔ سچ کی پاسداری میں انہیں کسی نوع کا کوئی خوف نہیں ہے بلکہ صداقت نگاری سے انہیں تاب و توانائی میسر آتی ہے۔

ہمیشہ سچ سے توانائی شاہدہ پائی
کسی بھی جھوٹ کی طومار سے نہیں ڈرتے

(ص:53)

وہ اپنے آپ کو فضائے دہر میں امینِ بہار خیال کرتی ہیں اور رنجِ خزاں کو ان سے کسی نوعیت کی نسبت نہیں ہے۔ یہی امران کے لیے سرمایہء نازش بھی ہے۔

فضائے دہر میں ہم شاہدؔہ لطیف سدا
بہار لائے ہیں، رنجِ خزاں نہیں لائے

(ص:59)

ان کے نزدیک ان کا سرمایہءشعروسخن حلقہءحریفاں کے لیے ایک کاری ضرب کا درجہ رکھتا ہے جسے ان کے مزاحمتی افکار سے عبارت سمجھا جا سکتا ہے۔ شاعری فنونِ لطیفہ کا وہ شعبہ ہے جو تاثیرات کی فزوں تر کیفیات سے مالا مال ہے جسے بہ سرعت مقبولیت و پذیرائی میسر آتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب ادبی تحاریک کی بدولت آئے ہیں۔

شاہدؔہ تیرے سخن کی گونج شاہد
دشمنوں پر ضرب کاری ہو گئی ہے

شاہدؔہ لطیف کا تعلیاتی سرمایہ محض صنعتِ مبالغہ نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی سے عبارت ہے۔ وہ اپنی عزت و وقار کو من جانب اللہ سمجھتی ہیں اور اس امر پہ یقین بھی رکھتی ہیں کہ مشیت ایزدی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔

کسی انسان نے بخشا نہیں یہ اوج و مقام
شاہدؔہ رب کی عطا ہیں میری توقیریں

(ص:95)

اب ہم ان کے چوتھے مجموعہ کلام ''برف کی شہزادی'' کی تعلیات کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ مجموعہ ھذا دراصل پیرس کا منظوم سفرنامہ ہے۔

توکل باللہ کو شاہدؔہ لطیف کی تعلیات میں روحِ رواں کی حیثیت حاصل ہے۔ گویا یہ ان کی تعلیات کا ایک کلیدی نکتہ ہے۔ ان کی ذات کا مرکزی نکتہ ہے جو ان کی ذات کا مرکز و محور ہے۔

مجھے شاہدؔہ یہ یقیں ہے

کوئی چار سو مرے ساتھ ہے

(ص:85)

مشکلات جھیلنے کے حوالے سے بھی ان کے ہاں فزوں تر تعلیات موجود ہیں جن میں کہیں کہیں مظاہرِ فطرت کا استخدام بھی پایا جاتا ہے جن سے ان کے عزم و حوصلے کی دلیل ملتی ہے۔

چھالے جہاں سحاب میں پڑ جائیں شاہدؔہ
ایسے بھی راستوں سے گزارا گیا ہمیں

(ص:102)

ان کے فکری کینوس کی وسعت کے حوالے سے بھی کافی تعلیات پائی جاتی ہیں۔ان کی تعلیات غیر محسوس معلوم ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ہاں شدتِ احساس بھی ہے اور زورِ بیاں بھی ہے مگر بلند بانگ دعووں کا فقدان ہے۔ بحر متدارک مربع مذال میں ان کا مقطع دیکھیے جس کا وزن ''فاعلن فاعلان'' ہے۔

بیکراں سمندر ہے
شاہدؔہ خیالوں کا

(ص:104)

اب ہم ان کے پانچویں مجموعہ ءِ کلام ''محبت ہو نہ جائے'' مطبوعہ جون 2006ء کو تعلیاتی تناظر میں زیرِ بحث لاتے ہیں جس میں زیادی تر غزلیات شامل ہیں۔ کچھ آزاد نظمیات بھی اس کا حصہ ہیں۔

شاہدؔہ لطیف، شخصیت و کردار اور فن ہر حوالے سے ایک خاص معیار کی حامل ہیں۔جس کی گواہی ان کے اس شاعرانہ تعلّیٰ آمیز مقطع میں موجود ہے جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

ہوں چاہے خاک آلودہ مگر سچے جواہر ہوں
مرا تو شاہدؔہ ایسے نگینوں سے تعلق ہے

(ص:25)

ان کی تعلیات میں اگرچہ جزئیات نگاری کا پہلو پایا جاتا ہے مگر کہیں کہیں فلسفیانہ انداز بھی آشکار ہوتا ہے۔ جس کے باعث ان کا حسیاتی و نفسیاتی گراف بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شدتِ احساس اور زورِ بیاں فزوں تر ہو جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کو فلسفیانہ زاویوں سے بھی دیکھتی ہیں اور نظریہء ادب برائے زندگی کو بھی تقویت ملتی ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں ان کی ایک غزل کا مقطع اس حوالے سے ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

یہ ہستی شاہدہؔ اک آسماں ہے
شمارِ بال و پر کرنا ہے مجھ کو

(ص:33)

ان کا ایک اور تعلّی آمیز شعر قابل ،غور ہے جس میں ان کا انداز ما فوق الفطرت نوعیت کا ہے جس میں مظاہرِ فطرت کا اہتمام بھی پایا جاتا ہے۔ ایسی تعلیات کا فکری گراف بہت بلند ہوا کرتا ہے۔ جس میں مقبولیت و پذیرائی کے خصائص فزوں تر ہوں۔ انہوں نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔

میں صبحِ نو کا چمکتا ہوا ستارہ ہوں
مجھے وہ ملنے نہ آئیں اکیلی شام کے ساتھ

(ص:63)

شاہدہؔ لطیف کی تعلیات میں ایک خود کلامی کا سا انداز پایا جاتا ہے اور ایک عزم و حوصلے کی نمو ملتی ہے۔ وہ خود بھی بلند حوصلگی کی قائل ہیں اور قاری کو بھی بلند ہمتی کا پیام دیتی ہیں۔ ان کا جوش و ولولہ ثریا کی بلندیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

پرواز شاہدہؔ ہو ستاروں سے بھی بلند
دنیائے رنگ و بو پہ قناعت نہ کیجئے

(ص:103)

لیجیے اب ان کے چھٹے مجموعہء کلام ''اف یہ برطانیہ'' جو برطانیہ کا منظوم سفر نامہ بھی ہے، کو تعلیاتی وتجزیاتی حوالے سے ملاحظہ کریں۔

عمومی مشاہدے میں مظاہرِ فطرت کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن بسا اوقات ان کا تعلیاتی تناظر مظاہرِ فطرت سے بھی پیش رفت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ گویا نظامِ کائنات کے تلازمات بھی ان سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ایسی تعلیات بہت وقیع اور معتبر ہوا کرتی ہیں۔ اسی پسِ منظر میں شاعرانہ تعلیٰ کا حامل ان کی ایک غزل کا مقطع دیکھیے جس میں انہوں نے شمس وقمر اور شام و سحر کو بھی اپنے آپ سے ہیچ گردانا ہے۔ مقطع ھذا بحر رمل مثمن محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔

اک الگ اے شاہدؔہ وسیارہ ہے میرا جہاں
کچھ نہیں شمس و قمر، شام وسحر میرے لیے

(ص:19)

شعری صنائع وبدائع میں شاعرانہ تعلیٰ کو اس لیے وقیع مقام ومرتبہ حاصل ہے کہ اس میں نہ صرف سخنور کا ادراک فکر وفن اور ذات وکردار کے تلازمات ہوتے ہیں بلکہ معاملات اس سے بھی زیادہ فزوں تر ہوتے ہیں یعنی تحقیقی وتنقیدی تناظر کے علاوہ بھی وسیع تر تناظرات کی حامل ہے۔ گویا شاعرانہ تعلیٰ کا فکری کینوس اتنا بسیط وعریض ہے جس کے مقابلے میں حقائق کمزور پڑ جاتے ہیں اور صنعتِ مبالغہ کی خوب پذیرائی ہوتی ہے۔

ہم شاہدؔہ خموش تھے، کچھ مصلحت بھی تھی
دنیا کے سارے بھید ہماری نظر میں تھے

(ص:93)

منظوم سفر نامہ میں تعلیات کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے کیونکہ وہاں حقائق اور تجربات و مشاہدات زیرِ بحث آتے ہیں یعنی ایک طرح کا رپورٹنگ کا عمل بھی ہوتا ہے۔ داخلی

عوامل کی بجائے خارجی عناصر کی عمل داری زیادہ ہوتی ہے مگر پھر بھی شاہدہ لطیف کے یہ تعلیاتی شواہد حوصلہ افزا ہیں۔

اب ہم ان کے نویں شعری مجموعہ ''خواب سونے نہیں دیتے'' مطبوعہ ستمبر 2017ء کا تعلیاتی و تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجموعہ ھذا خود میں فکری بیداری کا ایک حوالہ بھی رکھتا ہے۔

شاہدہ لطیف اپنے تعلیاتی کینوس میں ایسے لطیف اور خوشگوار تلازمات لے کر آئی ہیں کہ صنعتِ مبالغہ کا وجود بھی پردۂ اخفا میں چلا جاتا ہے اور معاملہ قرینِ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ یوں ان کی تعلیات ایک فطری روپ دھار لیتی ہیں۔

شاہدہ خوشبو، روشنی اور شبنم سے گواہی لے لو

میرے خیالوں میں جیسے ہیں کلیاں، جگنو، بادل

(ص:20)

ان کی تعلیات میں اظہاری پیمانوں اور تلازمات میں یکسانیت کا نہ کوئی پہلو ہے نہ تکرار یا اعادے کی کیفیت ہے جس سے یہ بخوبی تعین ہوتا ہے کہ ان کی تعلیات میں دل بستگی و دلپذیری کا مکمل سامان موجود ہے۔ بسا اوقات ان کی تعلیات احساسِ خود محبوبی کا روپ دھار لیتی ہیں جسے بنتِ حوا کا فطری جذبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اب میں تو میں نہیں رہی اس شخص کے لیے

جگنو، ستارہ، چاندنی، مہ تاب ہو گئی

(ص:48)

حالات چاہے جتنے بھی ناساز ہوں مگر ان کے عزائم جواں رہتے ہیں۔ ہار تسلیم کرنا ان کی فطرت میں نہیں ہے۔ ان کے ہاں تعلیات کے پہلو بہ پہلو رجائی احساسات بھی بامِ عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ لسانی حوالے سے ان کے ہاں اختراعی مرکبات بھی ملتے ہیں جیسے آمدہ شعر میں کشتیٔ امید کے اختراعی مرکب کا استخدام ہوا ہے، جو بحر رمل مثمن محذوف ہے یعنی مذکورہ بالا بحر و وزن

میں ہے۔

کشتیء امید کو ساحل پہ لے کر آ گئی
ہار کب مانی شکستہ بادباں ہوتے ہوئے

(ص:49)

ناممکنات کا بیان ممکنات کے پیرائے میں کرنا یہ یقیناً شاعرانہ تعلّی کا ایک منفرد انداز ہے۔ یہ ایک فطری نوعیت کا طرزِ تعلّی ہے جو اکثر و بیشتر سخنوروں کے ہاں پایا جاتا ہے۔مگر شاہدہ لطیف نے اس میں کچھ جدت کا رنگ بھی بھر دیا ہے اور یہ جدت فکری تلازمات کے حوالے سے ہے جو نہایت قابلِ غور ہے۔

مجھے وہ قید کرے شاہدہ یہ ناممکن
میں وہ پرندہ ہوں جو خود ہی اپنے بس میں نہیں

(ص:94)

شاہدہ لطیف کی تعلیات میں جمالیاتی احساس پورے رسوخ سے پایا جاتا ہے جن کے مطالعات سے طبیعت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ان کے ہاں کلاسیکی بہار یہ شاعری کے خصائص کارگر ہیں۔انہوں نے خوشبو کے تلازمہ کو مختلف و منفرد انداز میں برتا ہے۔

ٹہنیاں جھوم اٹھیں میری پذیرائی کو
میں وہ خوشبو ہوں کہ گزری ہو صبا کی صورت

(ص:124)

ان کے تعلیاتی کینوس کے سب سے بڑے اوصاف یہ ہیں کہ وہ رفعت آمیز اور نکہت بیز ہے۔روشنی اور خوشبو جس کے مرکزی استعارے ہیں۔

ستارۂ سحری ہم ہیں شاہدہ پھر بھی
ہمیں خوشی ہے کہ تابندگی ہماری ہے

(ص:132)

شاہدؔہ لطیف کی شاعرانہ تعلیات کے غائرانہ مطالعہ سے یہ مبینہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کے تعلیات بیان کا ایک خاص دلچسپ انداز لیے ہوئے ہیں۔ جن میں مظاہرِ فطرت کا التزام بھی ہے اور بہاریہ شاعری کے خصائص بھی جلوہ ریز ہے۔ جن کے مطالعہ سے طبیعت پر کیف اور سرور طاری ہو جاتا ہے۔ ان کے تعلیاتی کینوس میں ایک فطری انداز کارفرما ہے جس سے کسی نوع کے تکلف و تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی تعلیات خود میں آمد کا سماں رکھتی ہیں۔ جن میں صنعتِ مبالغہ کا اہتمام متوازن و معتدل انداز میں کیا گیا ہے۔ جس کے باعث ان کا بیان قرینِ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔

شاہدہ لطیف اور مزاحمتی افکار

روزِ اول سے خیر اور شر کی طاقتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور یہ جنگ تا ابد جاری وساری رہے گی۔ کبھی اہلِ خیر کو کامیابی ملتی ہے تو کبھی اہلِ شر غالب آجاتے ہیں لیکن یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ طاغوتی طاقتوں کی بالادستی وقتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ انجامِ کار اہلِ حق ہی کامیاب و کامران ٹھہرتے ہیں۔ ہر ایسی فکر جو ظلم و ناانصافی کے خلاف استعمال ہو اور اس کا راستہ مسدود کرنے کی کوشش کرے، مزاحمتی فکر سے عبارت ہوتی ہے۔

شاہدہ لطیف جو ایک وسیع الموضوعات شاعرہ ہیں، دیگر موضوعات کے پہلو بہ پہلو ان کے ہاں فزوں تر مزاحمتی افکار بھی پائے جاتے ہیں۔ شذرہ ھذا میں ہم ان کے سخن کا تجزیہ مزاحمتی تناظر میں کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کے تیسرے شعری مجموعے ''معرکۂ کشمیر'' مطبوعہ جولائی 2001ء کی منتخب نظمیات اور نظمیات کے منتخب اقتباسات کو شاملِ شذرہ کریں گے۔ مزید برآں منتخب غزلیات اور غزلیات کے منتخب اشعار بھی استشہادات میں برائے استخراجات لائیں گے۔ مذکورہ موضوع کے پہلو بہ پہلو دیگر انتقادی تناظرات بھی زیرِ بحث آئیں گے۔ مذکورہ مجموعہ چونکہ کشمیر کے تناظر میں ہے، اس لیے تمام تر بحث اسی پس منظر میں ہوں گی۔ کتاب ھذا خود میں ایک قومی و ملی حوالہ بھی رکھتی ہے۔

وہ کشمیر کی آزادی کی خواہاں ہیں۔ ان کے تمام تر مزاحمتی افکار اسی نسبت کے حامل ہیں۔ وہ غلامی کے سخت خلاف ہیں اور مہذب اقوامِ عالم کا موقف بھی یہی ہے کیونکہ آزادی ہر انسان کا فطری اور بنیادی حق ہے جسے عملی طور پر تسلیم کیا جانا انتہائی ناگزیر ہے۔ اسی مدعا کو انہوں نے

بطریقِ احسن پیش کیا ہے۔

دنیا بھی کہہ رہی ہے غلامی میں کیوں رہیں
آزاد زندگی کا انہیں اختیار ہے

(ص:30)

مزاحمتی حوالے سے مجاہدین کا کردار مرکزی ہوا کرتا ہے کیونکہ وہ راہِ حق کے سپاہی ہوتے ہیں اور پوری قوم ان کے لیے دعا گو رہتی ہے کیونکہ وہ اندھیروں میں اجالوں کی کرن کی طرح ہوتے ہیں۔ ملک وقوم کی حفاظت ان کا اولیں فریضہ ہوتا ہے۔ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے حوالے سے بھی مجاہدین کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ کشمیری مجاہدین کے حوالے سے شاہدہ لطیف کا استدعائی انداز ان کی نظم ''مجاہدین کے لیے دعا'' قابلِ ذکر ہے۔

تم شرک اندھیروں میں محبت کی سحر ہو
تم صبح اجالوں کے امیں نورِ نظر ہو
اللہ کی امانت ہو محمدؐ کے سپاہی
ملت کی حفاظت پہ ہو کشمیر کے راہی
بہنوں کی دعا، ماؤں کے تم لختِ جگر ہو
تم نورِ سحر ہو

O

غازی ہو ،شہادت کے سزاوار تمہی ہو
آزادی کی منزل کے بھی آثار تمہی ہو
اب شاہدہ ہاتھوں میں دعا تھامے کھڑی ہے
یہ درد تمہارا ہے تمہاری ہی گھڑی ہے
اب تم کو مبارک ، تمہی آزاد سفر ہو
تم نورِ سحر ہو

(ص:48)

جذبہء جہاد کو ظلم و استبداد سے دبایا نہیں جا سکتا کیونکہ حریت ایک ایسی شمع ہے جو ہمیشہ فروزاں رہتی ہے کیونکہ اہلِ دل یقین کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ جہاد ان کی پہچان ہوا کرتا ہے۔ ظلم کے دیے تا دیر روشن نہیں رہ سکتے کیونکہ ہوا ان کے خلاف آندھیوں کا روپ دھار لیتی ہے اور وہ پھر بجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی مزاحمتی فکر کے حامل ان کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہیں۔ جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

چلے ہیں اہلِ دل ایقان لے کر
جہادی شان کی پہچان لے کر
بڑھی ہے ظلم کے جلتے دیوں تک
ہوا پھر آندھیوں کی شان لے کر

(ص:49)

اہلِ حق کبھی بھی جبر و ستم سے خائف نہیں ہوتے بلکہ ان کے جذبے اور جواں ہوتے ہیں۔ ظلم کی دیواریں کبھی ان کا راستہ مسدود نہیں کر سکتیں۔ اگر چہ اہلِ ستم انہیں ہر طرح کے آزار کے حصار میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کے پایہ استقلال میں لغزش نہیں آتی۔ کسی بھی لشکرِ جرار کا خوف انہیں ڈرا دھمکا نہیں سکتا۔ اگر چہ وہ ظلم کے انجام سے لرزاں رہتے ہیں، مگر اظہارِ صداقت کے حوالے سے کبھی بھی راہِ گریز اختیار نہیں کرتے۔

کسی ستم، کسی تلوار سے نہیں ڈرتے
یہ لوگ ظلم کی دیوار سے نہیں ڈرتے
ہر اک مقام پہ باطل کا ہے نشاں موجود
پر اس علامتِ آزار سے نہیں ڈرتے
اسیر گرچہ ہیں وہ غاصبوں کے قبضے میں

کسی بھی لشکرِ جرار سے نہیں ڈرتے
فقط ہیں ظلم کے انجام سے یہ لرزیدہ
مگر صداقتِ اظہار سے نہیں ڈرتے

(ص:53)

ظلم پر خاموش رہنا بھی بہت بڑا ظلم ہے۔ اس لیے مزاحمتی رویوں کا اظہار ناگزیر ہے۔ افراط وتفریط کی آلائشوں سے بچتے ہوئے جبر جتنا بھی ہو اس کا اتنا ہی مذکور ضروری ہے۔ اس کے بیان میں کمی نہیں ہونی چاہیے۔

بیاں ظلم کو ہر حال میں کریں گے ہم
زیادتی کو کبھی کم تو کہہ نہیں سکتے

(ص:79)

شاہدہ لطیف کی آزاد نظم ''ذرا سوچو'' دراصل ان کا طاغوتی طاقتوں سے خطاب ہے جس میں تنبیہہ کا ایک انداز پایا جاتا ہے۔ انہیں یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ تم اپنے ظلم و تشدد سے جذبۂ حریت کو دبا نہیں سکتے بلکہ یہ مزید مضبوط و مستحکم ہوگا۔ تم اخوت و محبت کے احساسات کو نیست و نابود نہیں کر سکتے بلکہ محبتوں کے یہ قافلے تا ابد رواں دواں رہیں گے۔ ان کی یہ مزاحمتی نظم اہلِ جبر کے خلاف ایک توانا للکار کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ نظم بحر ہزج میں ہے۔

سبھی کچھ لوٹ لے جاؤ گے لیکن غاصبو سوچو
دلوں سے حریت کی تم تڑپ کو کیسے چھینو گے؟
جو ذہنوں میں بھری ہے روشنی وہ کیسے چھینو گے؟

ذرا سوچو
محبت کی ہوائیں چار سو چلتی رہیں گی
اخوت کا جو دریا بہہ رہا ہے
کس طرح روکو گے تم سوچو؟

ادھر سے پھول کی خوشبو ادھر آتی ہے

روکو گے؟

محبت سے بھرے یہ قافلے چلتے رہیں گے

ہواؤں اور دریا کو نئے رستے ہمیشہ

جابجا ملتے رہیں گے

ذرا سوچو

تمہارے گھر اندھیرا ہو تو کیا ہو گا؟

تم ہاتھ کو روکو

ذرا سوچو

(ص:84)

ظلم جس قدر بھی ہو، آخر دم توڑ جاتا ہے کیونکہ اسے دوام حاصل نہیں ہوتا اور انجام بھیانک ہوتا ہے۔ مظلوم کی آہ براہِ راست عرش پر پہنچتی ہے۔ مظلوم کا خون خود میں ایک نویدِ انقلاب رکھتا ہے جسے تادیر موخر نہیں کیا جا سکتا۔

ظالم کو ابھی ہوش نہیں سوچ لے انجام

اس خون کی تاثیرِ نوا اور ہی کچھ ہے

(ص:85)

ان کی ایک اور آزاد نظم ''یہ جاں بازوں کی آہٹ ہے'' بھی مزاحمتی افکار کی حامل ہے جس سے حریتِ فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔ مجاہدین کے قدموں کی آہٹ کی ہیبت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم بھی بحر ہزج میں ہے۔

خزاں کے زرد پتے

بھاری قدموں تلے

جب چرمراتے ہیں

تو جاگ اٹھتے ہیں طائر بھی

ہرن بھی چونک جاتے ہیں

یہ جاں بازوں کی آہٹ ہے

جو ظالم کی کمیں گاہوں کا ہرادراک رکھتی ہے

نظر بے خوف رکھتی ہے

قدم بے باک رکھتی ہے

مقاصد پاک رکھتی ہے

یہ جاں بازوں کی آہٹ ہے

(ص:93)

آزادیء کشمیر کے حوالے سے ان کی نظم ''کشمیریوں کا گیت'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کے مزاحمتی افکار میں شدتِ احساس اور زورِ بیاں بھی ہے جس میں ظلم کے خلاف جارحانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں گیت کی ہیئت کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ ٹیپ کے طور پر استعمال ہونے والا شعر نظم کے مرکزی متن کی عکاسی کرتا ہے۔

ہم ظلم کا راستہ کاٹیں گے

نفرت کی خلیجیں پاٹیں گے

کشمیر ہمارا اپنا ہے

اپنی آنکھوں کا سپنا ہے

O

ہم دشمن آنکھیں پھوڑیں گے

جو ہاتھ بڑھا وہ توڑیں گے

کشمیر ہمارا اپنا ہے

اپنی آنکھوں کا سپنا ہے

○

منزل ہے ہماری آزادی
اور مہکے گی وادی وادی
کشمیر ہمارا اپنا ہے
اپنی آنکھوں کا سپنا ہے

○

اللہ کے سپاہی آتے ہیں
دشمن کی تباہی لاتے ہیں
کشمیر ہمارا اپنا ہے
اپنی آنکھوں کا سپنا ہے

(ص:105)

اس فکری تسلسل کی حامل ان کی نظم ''کشمیر کا مطلب'' بھی ہے جو آزادیء کشمیر کے پس منظر میں ہے جس میں بھرپور مزاحمتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یہ ایک انقلاب آور نظم ہے۔اس نظم کے آخری تین بند نذرِ قارئین ہیں جن سے شاہدہ لطیف کے مزاحمتی افکار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں کس قدر جوش و ولولہ ہے اور کس قدر جذبہء حریت کی عکاسی ہے۔

دنیا کا نقشہ بدلے گا
اب رستہ کون یہ روکے گا؟
جو روکے گا وہ دیکھے گا
کشمیر کا مطلب کشمیری

○

جو جانیں قرباں کرتے ہیں
جو آزادی پہ مرتے ہیں

وہ اپنے لہو سے لکھتے ہیں
کشمیر کا مطلب کشمیری

O

یہ وادی وادی اپنی ہے
آباد آبادی اپنی ہے
سچ ہے آزادی اپنی ہے
کشمیر کا مطلب کشمیری

(ص:107)

شاہدہ لطیف کی نظم ''تدبیر'' ایک انقلاب آفریں نظم ہے جس میں آزادیٔ کشمیر کے عوامل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پھر احتجاجی اور مزاحمتی نوعیت کی ہے۔ نظم ھذا خود میں ایک دعوتِ تحریک رکھتی ہے جس سے آزادی کے مجاہدین کی حواصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان کے جذبۂ حریت کو فروغ میسر آتا ہے اور ایسی ہی نظمیات راہِ انقلاب ہموار کرتی ہیں۔ تمام رکاوٹوں کو دور کرتی ہیں۔ یہ نظم بحر متقارب مثمن سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہیں۔ یہ نظم مسدس ہیئت میں ہے۔

چلو دوستو ہاتھ میں ہاتھ ڈالیں
اخوت کی زنجیر ایسے بنائیں
تشدد یا نفرت گزرنے نہ پائیں
ہم اپنے بدن کی فصیلیں اٹھائیں
کہ قوموں نے تقدیر کو خود لکھا ہے
یہ ایمان ہے بس یہی معرکہ ہے

O

ہزاروں ردائیں ہیں پرچم ہمارا

ہزاروں شہیدوں کا خوں بولتا ہے
یہیں تو ہیں محمود و قاسم ہمارے
اسی جا تو شاہین پر کھولتا ہے
لہوں سے شہیدوں کے ہر گھر سجا ہے
یہ ایمان ہے بس یہی معرکہ ہے

O

یہ وادی ہماری محبت ہے ماں ہے
یہ وادی اثاثہ ہے اجداد کا بھی
کسی بدنظر کی ضرورت کہاں ہے
نہ کشکول دیں ہم کو امداد کا بھی
ہماری مدد کو ہمارا خدا ہے
یہ ایمان ہے بس یہی معرکہ ہے

O

یہ دنیا بھی دیکھے خدائی ہو شاہد
چلو اب کریں آخری وار ایسا
کہ دشمن کے پنجے سے سب کچھ چھڑائیں
کریں ہم کفن پوش اقرار ایسا
یہی معرکہ آخری معرکہ ہے
یہ ایمان ہے بس یہی معرکہ ہے

(ص:123-124)

شاہدہ لطیف کے مزاحمتی افکار میں بھرپور تاریخی شواہد بھی ملتے ہیں جن میں تلمیحات کا استخدام بھی شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی مزاحمتی فکر جذبہء جہاد سے عبارت ہے جسے

اسلام کے ایک ستون کی حیثیت حاصل ہے۔اس حوالے سے ان کی نظم ''آخری معرکہ'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے جو غزل کی ہیئت میں ہے جس کی ردیف ''کرو'' گرائمر کی رو سے فعل امر ہے جو دعوت وتحریک کا درجہ رکھتی ہے۔

آخری معرکہ ہے خون سے تحریر کرو
لوحِ تاریخ پہ ، کشمیر کو تاریخ کرو
یہ سفر چاند کا محتاج نہیں ہو سکتا
مانگ کر دل سے ضیا رات کو تسخیر کرو
کشتیاں اپنی جلا ڈالو کنارِ دریا
موج کو زیر کرو ، وقت کو تسخیر کرو
کاٹ کر راستے پسپائی کے آگے نکلو
نوکِ شمشیر سے حالات کی تعبیر کرو
کل یہ قربان ہوئے جاں سے گزرنے والے
ان کی تکریم کرو ، ساتھ ہی توقیر کرو

(ص:125)

ان کی مزاحمتی فکر ایک نویدِ انقلاب کا درجہ رکھتی ہے۔جس سے قاری کو جوش وجذبہ ملتا ہے۔

ابھی تو تابہ فلک ایک شورِ وحشت ہے
ابھی زمیں پہ بھی اک حشر ہم اٹھائیں گے

(ص:129)

شاہدہ لطیف کی شعریات میں مزاحمت کا رنگ بھرپور نوعیت کا ہے جس میں انتقامی شواہد اپنے پورے کروفر سے پائے جاتے ہیں۔

اب کے آنکھیں میں کھلی رکھوں اسے قتل کروں
میرے قاتل کو مرے سامنے لایا جائے

(ص:136)

ان کے ہاں جذبوں کی بے باکیت اپنے عروج پر ہے جسے ان کی فکری بیداری سے منسوب کیا جا سکتا ہے اور ان کی فکر کا نکتہء کمال بھی یہی ہے۔ وفا کیشی اور جاں نثاری کے تلازمات ہیں جو ان کے کلام کو جاذبیت اور اپنائیت کی دولت سے مالا مال کر رہے ہیں۔

یہ قافلہ ہے وفا کیش جاں نثاروں کا
نہ تھمنے والا ہے کوئی نہ ڈرنے والا ہے

(ص:138)

شایانِ کج کلاہ سے خائف نہ ہو زباں
وقت آ پڑے تو برسرِ دربار سچ کہو
یہ جانتے ہوئے بھی کہ انجام تلخ ہے
سچ بولنا پڑے تو سرِ دار سچ کہو

(ص:160)

شاہدہ لطیف کی مزاحمتی فکر مکمل جوش و جذبے اور ہمت و استقامت سے عبارت ہے جس میں اظہار کی جسارت بامِ عروج پر نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے ان کے ہاں کسی نوع کی شکست خوردگی کا کوئی احساس نہیں ہے بلکہ ان کا عزم و حوصلہ پل پل جواں رہتا ہے۔ وہ قاری کے حواس کو مکمل طور پر مستعد رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ قاری انہیں کسی طور پر نظر انداز اور فراموش نہیں کر سکتا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ قاری کو مقصدیت سے آشنا کرتی ہیں۔ یوں وہ ترسیلِ شعور کا فریضہ بطریقِ احسن انجام دیتی ہیں۔ ان کے کلام کی قرات کے دوران کہیں بھی دلچسپی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا کیونکہ ان کے سخن میں اپنائیت اور جاذبیت کی ایک فضا پائی جاتی ہے۔ یہی ان کی معراجِ فکر و فن بھی ہے۔ تخلیقی ارتقا کا راز بھی ہے۔

شاہدہ لطیف اور تنقیدی رویے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانی بصیرت تجربات و مشاہدات کا حاصل بھی ہوتی ہے۔ زندگی لمحہ بہ لمحہ رو بہ ارتقا ہے اور نت نئے تغیرات وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ حیات درجہ بندی کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ مختلف شعبہ ہائے زیست میں ترقی کا عمل جاری و ساری ہے مگر شعر و ادب میں جس شعبہ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے، وہ تنقید کا شعبہ ہے۔ اس حوالے سے مختلف تنقیدی دبستان اور نظریات معرضِ وجود میں آئے۔ تنقید کی اصل روح کیا ہے، درحقیقت یہ ارتقا کا استعارہ ہے کیونکہ تنقیدی بصیرت کے بغیر جیون کی گتھیوں کا سلجھانا کارِ دشوار ہے۔ اسی طرح جہانِ سخن میں بھی تنقیدی رویوں کی اہمیت سے مفر ممکن نہیں ہے۔ جس اہلِ سخن کے ہاں جس قدر تنقیدی رویے آشکار ہوں گے، اس کا سخن اسی قدر وقیع و معتبر ہوگا۔ کوئی بھی موضوع تنقید کی دسترس سے ماورا نہیں ہے۔ اب تو انسان نے خدا، فطرت اور رومان جیسے موضوعات کو بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا ہے جسے ازمنہ ءرفتہ میں قرینِ قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

شاہدہ لطیف کا فکری کینوس اصل میں موضوعات کا ایک بحرِ ذخار ہے جس میں امواج ہیں، تلاطم ہے، تضاد ہے، تنوع ہے۔ گویا ایک قوس قزح جیسی رنگا رنگی ہے، جو ہر طرح کا کیف و سرور اور رحت و انبساط رکھتی ہے۔ ہر طرح کی خوشگواری اور لطافت کا سماں ہے۔ ان کے ہاں تنقیدی رویوں کا وفور بھی ہے جو ان کی بالیدہ فکری اور معاملہ فہمی سے عبارت ہے اور ادراکاتی وسعت کا جواز بھی ہے۔ اس وقت ہم ان کے نویں شعری مجموعے ''خواب سونے نہیں دیتے'' کا تجزیاتی مطالعہ تنقیدی رویوں کے تناظر میں کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی منتخب غزلیات کے منتخب

اشعار بطور استشہادات برائے استخراجات لائیں گے۔مختلف موضوعات اور حوالوں سے تنقیدی رویوں کی تفہیم قاری کے لیے سہل تر بنانے کی سعی مندوب کریں گے۔دیگر انتقادی تناظرات بھی شذرہ ھذا کا حصہ ہوں گے۔

شاہدؔہ لطیف کے تنقیدی رویوں میں تنوع وتلون کی فضا پائی جاتی ہے۔انہوں نے زندگی کے اکثر و بیشتر موضوعات کو مس کرنے کی کوشش کی ہے۔ذاتی و کائناتی حوالوں کو فروغ بخشا ہے۔داخلی وخارجی عوامل کوان کے سخن میں رسوخ حاصل ہے۔دوہرے رویوں کے حوالے سے ان کے فحوائے سخن میں طنز و تنقید اورمزاحمت کے پہلو پائے جاتے ہیں۔ معاملہ عشق کا ہو یا سیاست کا، ان کی منفرد بصیرت کی جلوہ سامانی نظر آتی ہے۔ان کے سخن میں دائیں بازو اور بائیں بازو کےلوگوں کی کیفیات ملتی ہیں۔ان کے ہاں اپنے عہد کےحوالے سےشکوہ وشکایت کا پہلو بھی کارگر نظر آتا ہے۔ موجودہ گھسے پٹے نظامِ عدل کوبھی وہ آڑے ہاتھوں لیتی ہیں۔ اربابِ اقتدار کی فہمائش وآموزش بھی ان کے ہاں بھرپور انداز میں آشکار ہوتی ہے۔استفہامیہ اشارات کوانہوں نےتنقیدی رویوں کےفروغ کے لیے برتا ہےجن کی بدولت حیرت واستعجاب کےتلازمات بھی فزوں تر ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنی تنقیدی بصیرت کے بل بوتے پر انسان دوستی کےاحیاوحوصلہ افزائی کی سعیِ مشکور کی ہے۔تلخ حقائق کےحوالے سےان کے ہاں بے پناہ اظہاری جسارت پائی جاتی ہے۔ان کے اظہاری پیمانوں میں بھی ندرت سامانی کا عنصر موجود ہے۔گویاان کا طرزِفکر حکمت ودانش سےعبارت ہے۔اس پسِ منظر میں ان کی ایک پوری غزل نذرِقارئین ہے جہاں استفہامیہ اشارات نےتنقیدی رویوں کاروپ دھارا ہواہےجس میں حرفِ استفہام''کیا'' کا بکثرت استخدام کیا گیاہے۔

جھوٹی چاہتیں کیا ہیں؟ جعلی الفتیں کیا ہیں؟
جب تمہیں محبت ہے پھر سیاستیں کیا ہیں؟
تخت وتاج کیا شئے ہیں موجِ عشق کے آگے
یہ حکومتیں کیا ہیں یہ ریاستی کیا ہیں؟

اہلِ شر کی باتوں سے اہلِ دل کو کیا مطلب؟
تجھ کو مجھ سے ملنا ہے مل، قباحتیں کیا ہیں؟
اتنا حق تو رکھتا ہے عدل مانگنے والا
عدل جب نہیں ملتا، پھر عدالتیں کیا ہیں؟
کیا عجب مسیحا ہیں جو مریض سے پوچھیں
آپ کا مرض کیا ہے؟ اور علامتیں کیا ہیں؟
ان سے حال کیا کہیے بند کان ہیں جن کے
دھڑکنیں نہ سن پائیں، وہ سماعتیں کیا ہیں؟
کون وہ مسیحا ہے شاہدؔہ جو دیکھے گا
ذہنی کیفیت کیا ہے؟ دل کی حالتیں کیا ہیں؟

(ص:32)

شاہدؔہ لطیف کے تجربات ومشاہدات کا عکسِ جمیل ہی ان کی بالیدہ فکری سے عبارت ہے۔ اس لیے ان کے ہاں زمانہ شناسی کے خواص پائے جاتے ہیں جو ان کے فکری اعماق وآفاق کے گراف کو بلند کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

میں یوں ہی نہیں کہلاتی اک جہاں دیدہ
مشاہدہ ہی نہیں تجربہ بھی رکھتی ہوں

(ص:33)

وہ سماج کی بے عملی اور لایعنیت کو بھرپور انداز میں ہدفِ تنقید بناتی ہیں جس سے ان کے سخن کی مقصدیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یوں شدتِ احساس اور زورِ بیاں کے تلازمات مزید مستحکم وتوانا دکھائی دیتے ہیں۔ نہ وہ کسی کے خواہ مخواہ کے تسلط کی روادار ہیں۔ بلکہ عمرانی حوالے سے انصاف کی خواہاں ہیں۔ وہ معاشرے کے مفلوک الحال طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کے حوالے سے فزوں تر دردِ دل رکھتی ہیں۔ رجائی احساسات کی چکا چوند بھی ان کی فکر کا حصہ ہے۔ اس

حوالے سے ان کی غزل کے تین اشعار پیشِ نظر ہیں جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

شناور خود کو کہلانے کا بے حد شوق تھا جن کو
ابھی دریا نہیں آیا کہ ہمت ہار بیٹھے ہیں
یوں احکامات جاری کر رہے ہیں حلقہ بندی کے
وہ گویا اس زمیں کے مالک و مختار بیٹھے ہیں
کئی صیاد آئے اور گئے گلشن نہیں اجڑا
پرندے ڈالیوں پر آج بھی دو چار بیٹھے ہیں

(ص:35)

شاہدہ لطیف عصری حوالے سے عمیق ادراکات کی حامل ہیں۔ وہ سماج کے دوہرے رویوں سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ معاشرت میں خلوص و مروت کا شدید فقدان محسوس کرتی ہیں۔ ایک طرح کا قحط الرجال ہے۔ رجولیت کی کمی خود غرضی اور مفاد پرستی کو ہوا دے رہی ہے۔ اخلاقی اقدار کی پامالی عمرانی حوالے سے زبوں حالی کا سبب ہے۔

بظاہر بن رہا ہے کتنا بھولا
غمِ ہستی ہمارا جانتا ہے

(ص:38)

وہ زندگی میں ہر حوالے سے مثالیت کی قائل ہیں اور معاشرے میں امن و آشتی کو فروغ دینا چاہتی ہیں۔ مثالی معاشرے کے قیام کی خواہاں ہیں۔ اس لیے وہ زندگی کے تمام شعبوں کے حوالے سے نکتہ اعتراض اٹھاتی ہیں۔

کوئی تصویر میں نے خود بنائی ہے محبت کی
مجھے یہ آڑے ترچھے زاویے اچھے نہیں لگتے

(ص:39)

ان کا سخن زندگی کی اکثر و بیشتر کیفیات خود میں سموئے ہوئے ہے۔ بسا اوقات ان کے ہاں حقیقت پسندی کا پہلو در آتا ہے تو کہیں کہیں وہ مصلحت پسندی سے بھی کام لیتی ہیں۔ گویا ان کی شاعری پہلودار Dimentional ہے جس میں لچکدار رویے پائے جاتے ہیں۔

اعلانِ عام بغاوت سے کیا ملے گا ہمیں؟
زمانے بھر کی عداوت سے کیا ملے گا ہمیں؟
دلوں میں پیار کی جب کوئی بھی امنگ نہ ہو
بتاؤ ایسی محبت سے کیا ملے گا ہمیں؟

(ص:42)

ان کے نزدیک زندگی کا تعیش آمیز پہلو بھی مرغوب و مندوب نہیں ہے۔ انہیں اس کے ثمرات کی بجائے مضرات کی کیفیات غالب نظر آتی ہیں اور عملی مشاہدے سے بھی یہی حقیقت سامنے آتی ہے۔ گویا وہ ایک دانش ور اور مصلح ہیں جسے زندگی کی صحیح سمت کا تعین مطلوب ہے۔

سنبل کے تکیے، کم خواب کا بستر، خوشبو کمرے کی
بعض اوقات یہ خواب آور اسباب سونے نہیں دیتے

(ص:45)

وہ زندگی کے ہر شعبے میں لایعنیت کی سخت مخالف ہیں اور مقصدیت کی قائل ہیں۔ وہ ہر معاملے میں قواعد وضوابط کی روادار ہیں۔ اس لیے وہ گفتگو میں بھی ضابطہء کلام کی پاسدار ہیں۔

الجھی الجھی گفتگو سے تنگ آ جاتی ہوں میں
چپ سی ہو جاتی ہوں میں منہ میں زباں ہوتے ہوئے

(ص:49)

بسا اوقات وہ عمرانی رویوں کو بلا کم و کاست پیش کر دیتی ہیں جس سے ان کے عمرانی ادراکات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ معاملات کو جوں کا توں پیش کرنے کا مقصد حقیقت کو مزید واضح کرنے کے مترادف ہے۔ اس حوالے سے نہ وہ کسی قسم کا تبصرہ و تجزیہ کرتی ہیں اور نہ ثمرات و

حضرات کو زیرِ بحث لاتی ہیں۔ جبکہ وہ ان امور کا فیصلہ قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیتی ہیں۔ بلکہ بذریعہ استفہام قاری سے استفسار کرتی ہیں۔ گویا وہ قاری کو اختیار بھی دیتی ہیں اور اس پر ذمہ داری بھی عائد کرتی ہیں۔

محبت میں محبت کی صفائی کون دیتا ہے؟
شناسائی میں عذرِ آشنائی کون دیتا ہے
یہ خواہش اک پرندہ ہے قفس میں دل کے محبس کے
خوشی کے ساتھ اب اس کو رہائی کون دیتا ہے؟
کئی دم بھرنے والے کارواں کی شکل آئے ہیں
مگر دیکھیں رفاقت انتہائی کون دیتا ہے؟

(ص:52)

شاہدہ لطیف کا وصفِ خاص یہ ہے کہ وہ مختلف مسائل کا حل مختلف انداز میں پیش کرتی ہیں۔ وہ انتہائی سنجیدہ معاملات کو زندہ دلی کے پیرائے میں حل کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ ان کے ہاں ایک وضع داری اور راز داری کا پہلو بھی آشکار ہوتا ہے جس سے ان کی مصلحت اندیشی اور مقصدیت پسندی بخوبی عیاں ہوتی ہے۔ ان کے پیرائیہ اظہار میں نادرہ کاری اور کرشمہ کاری کے شواہد ملتے ہیں جو ان کے سخن کو ایک طلسماتی انداز سے آشنا کرتے ہیں۔

مسکرا کر بات کر محفل اداکاروں کی ہے
ناسمجھ تنہائی میں آنسو بہانا چھوڑ دے

(ص:55)

ان کا سخن عمیق ادراکات وحسیات کا حامل ہے۔ وہ سماجی لایعنیت کو بے نقاب کرتی ہیں اور قاری کو مقصدیت کی ترغیب دیتی ہیں۔ وہ عصری رویوں کے حوالے سے خلوص و مروت کے فقدان کی نشاندہی کرتی ہیں۔ براہِ راست و بالواسطہ طور پر وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتی ہیں۔ عظمت کی معراج کو پانے کے لیے وہ بھرپور نوعیت کی مشقت و ریاضت کا پیغام دیتی ہیں۔ جس

میں عرق ریزی کا عنصر شامل ہے۔

کاٹنا چاہتے ہیں لوگ سرابوں میں سفر
ہے کہاں سچی محبت کا طلب گار کوئی
سب کے دل چاک ہیں اس عہدِ خزاں میں
چارہ گر ہی مجھے ملتے ہیں نہ غم خوار کوئی
رتجگے مانگتے ہیں خونِ جگر سے یاقوت
شاہدہؔ ایسے ہی تو بنتا ہے فنکار کوئی

(ص:56)

وہ نام نہاد انصاف پسندوں کو بھی ہدفِ تنقید بناتی ہیں۔اس حوالے سے وہ اساطیری و تاریخی تلمیحات کو بروئے کار لاتی ہیں۔ان کے ہاں کچھ بھی مخفی نہیں رہتا۔وہ ہر چیز کو بے نقاب کرتی ہیں۔یہ سب کچھ بصیرت کی بدولت ہی ممکن ہوسکتا ہے۔

کیا بنا اس کو جو دیوار میں چنوائی گئی؟
شہرتِ عام بہت عدلِ جہانگیر کی ہے

(ص:57)

وہ فکری رواداری کی قائل ہیں۔ان کے نزدیک ایسے لوگ ہی قابلِ احترام ہوا کرتے ہیں۔اہلِ دنیا کا خوف ہو یا انسان کا داخلی خوف،انہیں کسی صورت گوارا نہیں ہے۔انہیں کسی زبان پر ضبطِ تمنا پسند نہیں کیونکہ ان کے پاس ہمت وحوصلہ اور جوش و ولولہ ہے۔وہ کسی نوع کی بزدلی کی روادار نہیں ہیں۔

میں اس کو مانتی ہوں جسے میرے شہر میں
مسجد بری لگی نہ کلیسا برا لگا
دنیا کا کوئی خوف تھا یا اپنی ہی جھجک
اس کی زباں پہ ضبطِ تمنا برا لگا

(ص:58)

فراق و سوزِ دل دو ایسے موضوعات ہیں جنہیں کسی نوعیت کی تفسیر کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ یہ عوامل اپنی تفسیر آپ ہوا کرتے ہیں ۔ یہ دونوں خارج پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں فطرت نے اپنی وضاحت کے حوالے سے بے نیازی ودیعت کی ہے۔ دنیا میں بے حسی بہت بڑا اخلاقی جرم ہے جس کی دنیا میں کوئی تعزیر نہیں ہے مگر عقبیٰ میں اس حوالے سے سخت قسم کی باز پرس اور سزا ہے۔ دنیا میں معمولاتِ حیات بہت کٹھن ہو گئے ہیں جو معاشرے میں مرد و زن دونوں کے لیے سخت دشوار ہیں۔ ان سے کسی مثالی نوعیت کے انسان کا عہدہ برآ ہونا بھی مشکل ہے۔ جب سخت نوعیت کے رویوں کا سامنا ہو تو وہاں زبانِ میر بھی استفادے سے قاصر ہوتی ہے۔ شاہدہ لطیف اپنے کلام کے لیے مناسب و موزوں قوافی اور ردیفیں لاتی ہیں جو لسانی اور فکری مزاج کے اعتبار سے وقیع و معتبر تصور کی جاتی ہیں۔ جن میں ایک صوتی، صوری اور سماعتی حسن بھی پایا جاتا ہے۔ ردیف میں استفہامیہ انداز شدتِ احساس اور زورِ بیاں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جیسا کہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے کلام کے تحقیقی و تنقیدی مطالعات سے یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ ان کا سب سے زیادہ زورِ کلام استفہامیہ اشارات کے حامل اشعار میں ہے۔ یہی معاملہ کچھ شاہدہ لطیف کا بھی ہے اور وہ اپنے سخن میں اساطیری تلمیحات کا استخدام بھی برمحل کرتی ہیں۔

فراق و سوزِ دل کی میں کوئی تفسیر کیا کرتی؟
وہ جب جا ہی چکا تھا، خط اسے تحریر کیا کرتی؟
جو اوڑھے پھر رہا ہو اک ردائے بے حسی اس کو
سزا دنیا میں کیا ملتی کوئی تعزیر کیا کرتی؟
مجھے تو واسطہ اکھڑے ہوئے لہجوں سے پڑتا ہے
ذرا سوچیں اس عالم میں زبانِ میر کیا کرتی؟

(ص:59)

ان کے نزدیک ریا ایک بے ثمر اور زیاں آور احساس ہے۔ ہزیمت و نامرادی جس کا مقدر ہے۔ جو لوگ ظلمت پسند ہیں، جنہیں انسانیت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، وہ تاریکی پسند کرتے ہیں اور اپنے پاس بجھے ہوئے چراغ رکھتے ہیں۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو دیارِ قلب میں صرف ایک فردِ فرید کو جگہ دیتا ہے کیونکہ اس شخص کا عکس رگ و پے میں سمایا ہوا ہوتا ہے۔

بسا اوقات انسان جزوی تجارب سے کلی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ایسے تجربات بعض اوقات غلط ثابت ہوتے ہیں جن کے اثرات بھیانک ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے عجیب الفطرت ہوتے ہیں کہ ان کا ادراک حاصل ہونے کے باوجود بھی ان کی تفہیم دشوار ہوا کرتی ہے۔

ریا میں ڈوبا تبسم ہے سر جھکایا ہوا
پھر آ گیا ہے جہاں بھر کا آزمایا ہوا
وہ روشنی سے ہے خائف نہ جانے کیوں اتنا
چراغ پاس بھی رکھتا ہے تو بجھا ہو ا
دیارِ قلب میں گنجائش اب نہیں ممکن
بس ایک عکس رگ و پے میں ہے سمایا ہوا
جو کر رہا تھا گلہ میری کج ادائی کا
دراصل تھا وہ کسی اور کا ستایا ہوا
یہ وصف اس کی وفا میں سدا رہا شامل
پرایا ہو کے بھی ہرگز نہیں پرایا ہوا

(ص:60)

شاہدہ لطیف اپنی بصیرت کے بل بوتے پر تمام امکانات کو مدنظر رکھتی ہیں۔ بسا اوقات انہیں بروئے کار بھی لاتی ہیں۔ جب انہیں اپنے اردگرد لایعنیت اور بے عملی نظر آتی ہے، تو پھر وہ قدرے مایوس بھی ہو جاتی ہیں۔ گویا ان کے ہاں سعیِ پیہم کا بالواسطہ اور براہِ راست پیغام پایا جاتا ہے۔

کوئی ستارہ سحر کی خبر نہیں دیتا
مجھے نظر نہیں آتی یہ شب گزرتی ہوئی

(ص:61)

مصلحت اندیشی اور مقصدیت آمیزی بھی ان کے سخن کے نمایاں اوصاف ہیں۔ان کے ہاں انتہا پسندی سے گریز کی صورت پائی جاتی ہے۔خلوص و مروت کو ان کی فکر میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔وہ معاملات میں سمجھوتے کی قائل ہیں۔جسے وہ انسان دوستی سے تعبیر کرتی ہیں۔

ہمیں ان نفرتوں نے کیا دیا ہے شاہدہ اب تک
جو سمجھوتے کا رشتہ ہے یقیناً دوستانہ ہے

(ص:65)

عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو احساسِ سود و زیاں سے مبرا و ماورا ہے۔اس کی لا حاصلی بھی اس کا حاصل ٹھہرتی ہے۔اس میں ملنے والے زخم گوہر گردانے جاتے ہیں۔اس میں وہ بلا کی سنگینی ہے کہ مراسم ترک رہتے ہیں۔جفا یاد رہتی ہے اور ہر جبر و ستم پر غور و فکر ہوتا ہے۔

عشق میں جو زخم بھی مل جائے گوہر جانیے
اس رہِ بے فیض میں کیا بیش و کم پر سوچنا
پڑ گئی عادت ہمیں ترکِ مراسم کے طفیل
ہر جفا کو یاد رکھنا ہر ستم پر سوچنا

(ص:77)

وہ قول و فعل میں مطابقت کی قائل ہیں اور قول و فعل میں تضاد رکھنے والے انہیں سخت ناپسند ہیں۔دوہرے رویوں کے حامل افراد قابلِ اعتماد نہیں ہوا کرتے۔کسی انسان کا چہرہ اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔کسی کے اعمالِ بد کے باعث اس کا چہرہ بھی سیاہی مائل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اسے نکھار میسر نہیں آتا۔یہ تمام امور شاہدہ لطیف کے تنقیدی شعور کا حصہ ہیں۔بحر ہزج مثمن سالم میں دو اشعار دیکھیے۔

جسے عادت ہے ہر لمحہ بیاں اپنا بدلنے کی
مجھے اس کی زباں پہ اعتبار آئے تو کیوں آئے؟
ترے دل کی سیاہی اے عدو چہرہ سے ظاہر ہے
ترے تاریک چہرے پر نکھار آئے تو کیوں آئے؟

(ص:80)

وہ اس امر سے بخوبی آشنا ہیں کہ انسانی موقف کو باور کرانے کا معتبر ذریعہ دلیل، فلسفہ اور منطق ہوا کرتی ہے جن کی بدولت کسی بھی فکر کی گتھیاں بہ آسانی سلجھائی جا سکتی ہیں اور افہام و تفہیم کا عمل سہل تر ہو جاتا ہے مگر ان عناصرِ ثلاثہ کو بروئے کار لانے کے لیے عمیق تر صلاحیتیں بھی مقتضیات کا حصہ ہیں۔ گویا کسی طور پر بھی عمل کی اہمیت سے مفر ممکنات میں شامل نہیں ہے۔

دلیلوں، فلسفوں اور منطقوں سے
اسے میں ، مجھ کو وہ سمجھا رہا ہے

(ص:86)

انسان کی سب سے معتبر تنقیدی بصیرت اپنی ذات کا ادراک ہے جس کے بغیر صحیح سمت کا تعین کارِ دشوار ہے۔ جب کوئی فرد زندگی کی لایعنیت کا شکار ہوتا ہے تو پھر اسے مقصدیت کی طرف مراجعت کے لیے خود انتقادی کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو خود میں خود احتسابی کے بھی وسیع تر امکانات رکھتی ہے۔ ان عوامل کے بغیر اپنی ذات کو اپنی دسترس میں رکھنا محالات میں سے ہے۔

کبھی ادھر کا تصور، کبھی ادھر کا خیال
یہ کیا ہوا کہ میں خود اپنی دسترس میں نہیں

(ص:94)

تنقیدی رویے حکمت و دانش اور شعور و آگہی سے مملو ہوتے ہیں جن میں انسانیت کے لیے استفادے کے وسیع تر مواقع ہوتے ہیں۔ انسان دوستی جس کا وقیع حوالہ ہے، جس سے حقوق العباد کی مقتضیات وابستہ ہیں، کیونکہ اس حوالے سے بھی عالمِ عقبیٰ میں سخت نوعیت کی باز پرس ہو

تی۔اس لیے انسانیت کے حوالے سے رحم پرور انسانی رویہ انسان کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔اسی سے انسان کی حقیقی مسرت و تمکنت وابستہ ہے۔انسانیت کی خدمت میں وہ کیف و سرور ہے جو شاہی محلات میں بھی میسر نہیں آتا کیونکہ راحت ایک ایسی کیفیت ہے جس کے لیے محل اور زر و مال کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔اس لیے جو سکون غربا کو میسر آ سکتا ہے،اس کا اہلِ ثروت تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس کی تعزیر ترے نامۂ اعمال میں ہے
خلق کو دیکھ کہ کس رنگ میں کس حال میں ہے
کیا سکوں ڈھونڈتا رہتا ہے بچارا انساں
قصر میں اس کو سکوں ہے نہ زر و مال میں ہے

(ص:100)

ہمارے سماج کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نالائق افراد کو قدر و منزلت سے نوازا جاتا ہے جس کے بہت سے اسباب ہیں جن میں یہ امر بھی مبادی ہے کہ باصلاحیت لوگ کچھ اصول وضوابط کے پابند ہوتے ہیں اور نالائق لوگ کسی بھی ضابطے کو خاطر میں لائے بغیر ہر جائز و ناجائز طریقے سے معاشرے میں مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔علامہ شبلی نعمانی کی تحقیق کے مطابق ہمارا سماج غیر معیاری ہے اور غیر معیاری افراد کو اہمیت دیتا ہے۔انھوں نے اپنی معتبر تنقیدی تصنیف ''شعر العجم'' میں کچھ یوں وضاحت پیش کی ہے کہ جب ہم خریداری کی غرض سے بازار جاتے ہیں تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ سستی اشیا خریدیں جو عموماً غیر معیاری ہوتی ہیں۔

میں کوئی حرفِ شکایت زباں پہ کیا لاؤں؟
کہ قافلے میں وہی شخص معتبر بھی ہے

(ص:104)

شاہدہ لطیف کے ہاں عصری آشوب کا ادراک بھی پورے کروفر سے پایا جاتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اسلوبیاتی اعتبار سے سہلِ ممتنع کی روایت کو تقویت بخشنے کی بھرپور کوشش کی

ہے۔حالات کی واشگوفی وسنگینی کے پس پردہ وہ ایک درسِ آموزش کا پہلو رکھتی ہیں۔اس سلسلے میں ہرطرح کی کوشش کو بروائے کار لاتی ہیں۔کبھی ان کا انداز بالواسطہ ہوتا ہے توکبھی براہِ راست مدعا نگاری کو فروغ دیتی ہیں اور ہرطرح کے رموز وعلائم سے راہِ گریز اختیار کرتی ہیں۔

راحت و امن ہیں خواب کی باتیں

درد و الم ہر آن بہت ہیں

(ص:106)

جب آپ کی ذات کے حوالے سے غلط رائے قائم کی جاتی ہے تو پھر آپ کو عرفانِ ادراک کی ترسیل کا فریضہ سرانجام دینا ہوتا ہے تاکہ آپ اپنے حوالے سے قائم ہونے والی غلط رائے کو درست کرسکیں۔ بسا اوقات یہ معاملہ افہام وتفہیم سے درست ہوتا ہے۔مگر کبھی اس حوالے سے ٹھوس عملی اقدامات بھی اٹھانا پڑتے ہیں۔

اتنا کچا مرا ایمان سمجھ رکھا تھا

تو نے کیا کانچ کا گلدان سمجھ رکھا تھا

(ص:107)

اہلِ بصیرت نہ صرف اپنے حزن والم سے آشنا ہوتے ہیں بلکہ اپنے طبقے کے حوالے سے مکمل جانکاری رکھتے ہیں جس سے ان کے ادراکاتی کینوس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

میں بھی اک شہرِ فسردہ میں ہوں تصویرِ ملال

جانتی ہوں احتیاجِ سائباں تجھ کو بھی ہے

(ص:108)

شاہدہ لطیف سماج کے دوہرے رویوں کی عکاسی کرتی ہیں۔وہ گویا ہیں کہ اگرچہ مادیت کی کوئی حقیقت نہیں مگر ہم پھر بھی حصارِ سود وزیاں میں مقید رہتے ہیں۔وہ عمرانی حوالے سے تضاد خیالی کو نگاہِ تعجب سے دیکھتی ہیں کیونکہ وہ زندگی میں تضاد کی قائل نہیں ہیں۔

ہے لاحاصل افسوس بازارِ دنیا

مگر پھر بھی سود و زیاں ہو رہا ہے

(ص:111)

عصرِ حاضر کا انسان اس قدر عصری آشوب کی دبوچ میں ہے کہ وہ ذہنی طور پر کسی پر اعتبار کرنے کا قائل نہیں ہے۔ دنیا و مافیہا حتیٰ کہ قدرت پر سے بھی اس کا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ یہاں باغبان ہی چمن کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں مصروف و منہمک ہے اور اسے باغبان کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔

اب کسی سے ظلم و جورِ آسماں کہتے ہوئے
دل لرزتا ہے کسی کو مہرباں کہتے ہوئے
سب کے سب تو بیچ کر کھا بیٹھا باغیچے کے پھول
شرم آتی ہے تجھ کو باغباں کہتے ہوئے

(ص:129)

شاہدہ لطیف کے ہاں افراط و تفریط کے تلازمات نہیں ہیں بلکہ ایک توازن اور غیر جانبداری کی فضا ہے جو ان کی انصاف پسندی کی علامت ہے۔ وہ اپنے ذاتی حوالے سے بھی متوازن و معتدل اور غیر جانبدار رہیں۔ یہی ان کی شخصی صداقت کی عمدہ دلیل ہے۔ وہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں رکھتیں بلکہ عملی مشاہدے اور تجربے پر اعتماد کرتی ہیں۔

میں آئینے کے منہ تو کبھی نہیں لگی
اچھی نہیں لگی تو بری بھی نہیں لگی
سنتی تھی سنگدل ہے بہت اس کی کج روی
اس کے مزاج میں تو کجی بھی نہیں لگی

(ص:148)

ان کے نزدیک عصری مقتضیات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ عہدِ رفتہ کی بازیافت گویا قدامت پسندی کی علامت ہے۔ وہ عصری حوالے سے اہلِ علم طبقے کو بھی ہدفِ تنقید بناتی ہیں

کیونکہ وہ ان میں خلوص و مروت کا فقدان پاتی ہیں کیونکہ وہ ان کے ہاں مادیت پسند رویوں کے فروغ کو سخت ناپسند کرتی ہیں اور انہیں خزانوں کا سانپ قرار دیتی ہیں۔

یہ سر تو لگتے نہیں مجھے ٹھکانے کے
سنا رہے ہو مجھے گیت کس زمانے کے ؟
مجھے تو ان کے رویوں سے ایسا لگتا ہے
یہ اہلِ علم نہیں سانپ ہیں خزانے کے

(ص:153)

جو دشتِ محبت میں قدم رکھتا ہے وہ موسموں کی شدت وحدت کے احساس سے بے نیاز ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ہر طرح کے سود و زیاں سے مبرا و ماورا ہوتا ہے۔اذیت پسندی اس کی فطرت میں شامل ہو جاتی ہے۔اذیتوں سے مانوسیت اسے ہر طرح کے سکھ سکوں سے دور کر دیتی ہے۔

پھر کیسی دھوپ کیسی تمازت کہاں کی لو؟
اپنے قدم جو دشتِ محبت میں پڑ گئے

(ص:154)

وہ سیاست اور اربابِ اقتدار کو بھی ہدفِ تنقید بناتی ہیں۔ان کے نزدیک سیاست اپنی تقدیس کھو چکی ہے اور اہلِ دانش اربابِ سیاست اور سیاست سے نفرت کرتے ہیں۔

اتنا سنا ہے میں نے یہ نغمہ عوام سے
اک چڑ سی ہو گئی ہے سیاست کے نام سے

(ص:155)

شاہدہ لطیف کے سخن میں متنوع تنقیدی رویے پائے جاتے ہیں جن کی بدولت ان کی فکری معقولیت و معروضیت اور منطقیت کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔اصل سبب یہ ہے کہ وہ مثالی معاشرے اور مثالی دنیا کی خواہاں ہیں۔ان کے تنقیدی رویے خود میں تعمیری جذبہ لیے ہوئے ہیں۔

شاہدہ لطیف، جواں جذبوں کی شاعرہ

شعری افکار بھی اپنی اقدار وروایات رکھتے ہیں۔ ہر موضوع کی اپنی روایت اور قدر ہے۔ جتنی شاعری کی تاریخ پرانی ہے، اسی قدر ان موضوعات کی بھی اپنی ہی تاریخ ہے۔ ایسا سخن ہر عہد میں اعتبارِ ذوق ہوا کرتا ہے جو ہمت وحوصلہ، جرات و جسارت، جوش و جذبہ اور زندہ دلی کے احساسات سے مرصع ہو۔ متقدمین ومتوسطین اور معاصرین غرض ہر عہدِ شعر میں جواں جذبوں کی حامل شاعری کو مقبولیت و پذیرائی سے نوازا گیا۔ ایسا کلام سماج میں پژمردگی و افسردگی اور آثارِ خستگی کے اثرات کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ صحت مند زندگی گزارنے کا آدرش دیتا ہے۔ زندہ دلی کے شواہد کے باعث ذوقِ لطیف کی آبیاری ہوتی ہے۔ اگر جذبوں میں وجوش و صداقت ہو تو قومی وملی تشخص صحیح معنوں میں اجاگر ہوتا ہے۔

شاہدہ لطیف کا کلام جوش و جذبہ اور ہمت و استقامت سے عبارت ہے اور ان کے ہاں ایسے جذبات و احساسات وفور سے ملتے ہیں۔ شذرہ ھذا میں ہم ان کے سخن کا تجزیاتی مطالعہ جواں جذبوں کے تناظر میں پیش کرنے کی سعیِ مندوب کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم ان کے دوسرے شعری مجموعہ ”میں پاکستانی ہوں“ مطبوعہ 14 اگست 2000ء کو بروئے کار لائیں گے اور اس مجموعہءکلام میں شامل غزلیات کے منتخب اشعار بطور استشہادات برائے استخراجات زیرِ تجزیہ لائیں گے۔ مجموعہ ھذا چونکہ خود میں بیک وقت قومی وملی تناظر رکھتا ہے، اس لیے اس میں زندہ دلی کے شواہد تو کم ہوں گے مگر جوش وجذبہ اور ہمت وحوصلہ کے حوالے سے فزوں تر عوامل کارگر ہوں گے۔

ان کی شاعری میں وہ تاب وتوانائی ہے جو عام طور پر کسی بھی شاعرہ سے متوقع نہیں ہوسکتی۔ اس لیے وہ شاعرات میں ممتاز و منفرد مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔اس امر کی مبینہ صداقت خود ان کا اپنا کلام ہے جو اس حوالے سے محققین و ناقدین کے لیے آغوش کشا نظر آتا ہے گویا انھوں نے جرات و جسارت کی نئی تاریخ رقم کی ہے۔اس حوالے سے ان کے ہاں تاریخی شواہد کا ایک تسلسل ہے جو خود میں وفورِ شعر کا سماں رکھتا ہے اور تلمیحات کے برمحل اور بھرپور استخدام نے ان کے شعری بیان کے گراف کو بلند تر کر دیا ہے۔اس لیے ان کا سخن نفسیاتی وحسیاتی حوالے سے خصوصی دلچسپی سے مزین ہے۔

اے زندگی ! بڑی جھیلی ہیں مشکلیں میں نے
میں تیرے غار کا پتھر ہٹا کے نکلی ہوں
ہے مجھ میں شاہدؔہ محمود غزنوی کی روح
کہ اپنی ذات کا مندر گرا کے نکلی ہوں

(ص:33)

شاہدؔہ لطیف کے جذبے جواں ہیں۔ ہمت و جسارت بامِ عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔وہ اپنے عزم وحوصلے کے بیان کے لیے تاریخِ اسلام سے بھی بھرپور استفادہ کرتی ہیں۔اس لیے ان کے ہاں تاریخی تلمیحات کا التزام بھی پورے وثوق سے ملتا ہے۔جس کے باعث قاری کو جرات و جسارت کے حوالے سے نئی شکتی ملتی ہے اور اس کے شریر میں نئی امنگیں جاگ اٹھتی ہیں۔ یوں زندگی صحت مند تصورات سے ہم آغوش ہوجاتی ہے۔

انگشت پر اٹھاتے ہیں کس طرح بابِ شہر؟
یہ راز صرف فاتحِ خیبر کے پاس ہے

(ص:36)

ان کی ایک اور پوری غزل جوان کے جواں جذبوں کی عکاسی سے مملو ہے، جسے ہم بدونِ تجزیہ نذرِ قارئین کرتے ہیں۔جس کا تبصرہ قارئین کی صوابدید پر منحصر ہے۔دیدہ باید کہ وہ اس

حوالے سے کیارائے قائم کرتے ہیں۔

خوابوں کی رہ گزر پہ سفر کر رہی ہوں میں
کانٹے تمام صرفِ نظر کر رہی ہوں میں
آئینۂ حیات نکھارا ہے میں نے خود
یوں دوسری صدی بھی بسر کر رہی ہوں میں
لے جا دعاؤں کا روشن چراغ تو
تجھ کو سپردِ گرم سفر کر رہی ہوں میں
جہدِ عمل میں کوئی کمی آ نہیں سکی
حالات جیسے بھی ہیں گزر کر رہی ہوں میں
فرہاد جس سے لا نہ سکا جوئے شیر بھی
چوٹی اسی پہاڑ کی سر کر رہی ہوں میں
لفظوں سے دے رہی ہوں اندھیروں کو روشنی
کارِ ثواب ہے یہ اگر کر رہی ہوں میں

(ص:37)

شاہدہ لطیف کے سخن میں ایک تگ وتازِ حیات کارفرما ہے۔ان کے ہاں زندگی کا بیان تمثیلاتی پیرائے میں ملتا ہے۔فکری بیداری ان کے سخن کا طرۂ امتیاز ہے۔ان کی فکریات میں ایک وضع داری اورتہذیبی رکھ رکھاؤ ہے۔ایک تقدیس وتطہیر کی فضا ہے جوخود میں اپنائیت اور جاذبیت کے فزوں تر خصائص رکھتی ہے۔ان کے پاس وہ ہمت وحوصلہ ہے کہ وہ زندگی کے مختلف محاذوں پرسرگرم ِعمل نظر آتی ہیں اوران کی عملی زندگی اس امر کی روشن دلیل ہے۔اگرسعی پیہم کے حوالے سے مطالعات درکار ہوں تو شاہدہ لطیف کی حیات وشعریات اس حوالے سے خالی ازافادہ نہیں ہوں گے۔

میں زندگی کے محاذوں پہ جنگ لڑتی ہوں

اس آبرو کے تقدس کی شان رکھتے ہوئے

(ص:136)

وہ زندگی میں حصولِ کامیابی و کامرانی کے لیے ارزاں ذرائع کو بروئے کار لانا اپنی شخصیت و معیار کے لیے نامناسب و غیر موزوں خیال کرتی ہیں۔ وہ مصائب و آلام کا پامردی سے مقابلہ کرنے کا ہنر جانتی ہیں اور پوری تاب و توانائی سے مقصدِ حیات حاصل کرنے کی قائل ہیں۔ ان کے ہاں وہ عزم و حوصلہ ہے جسے اسلاف کی میراث گردانا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی شخصیت و کردار اور جہات و شعریات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت کی قسمت ناامیدی و نامرادی نہیں ہے جیسا کہ قدامت پسند نسائی نظریہ ہے بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اگر چاہے تو طبقہ ءِ ذکور سے پیش رفت کر سکتی ہے۔ مگر اس کے لیے اسے چٹان جیسا حوصلہ و استقامت درکار ہو گا۔ اسی پس منظر میں ان کی غزل کے دو اشعار قابلِ ذکر ہیں جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

نہیں ایسا کہ تنکے کا سہارا لے کے آئی ہوں
میں طوفاں سے جھپٹ کر اک کنارا لے کے آئی ہوں
مرا اک خواب زندہ ہے ابھی اونچی اڑانوں میں
میں اپنی کھوئی قسمت کا ستارا لے کے آئی ہوں

(ص:139)

جواں جذبوں کے ضمن میں ان کے پاس زندہ دلی کے شواہد بھی ملتے ہیں جن کا تعلق داخلی و خارجی احساسات سے ہے۔ ان کے نزدیک جنون ایک بے لگام جذبہ ہے جو ہر نوع کے دستور سے بے نیاز ہے مگر محبت میں کچھ ضابطوں کی پاسداری محسوس ہوتی ہے۔ شاہدہ لطیف کچھ بھی اپنی دسترس سے بعید نہیں پاتیں بلکہ ان کا حوصلہ تو کوہ ہمالیہ سے بھی بلندی میں پیش رفت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

جنوں کی حد نہ ہے دستور کوئی

محبت کے کچھ اپنے ضابطے ہیں
نہیں ہے شاہدہ دور آسماں بھی
ہمالہ سے بلند اب حوصلے ہیں

(ص:140)

وہ اپنا حق بخوبی لینا جانتی ہیں۔اس سلسلے میں ان کی فکر انقلابی بھی ہو جاتی ہے اور یہی درسِ آموزش ان کا اپنے قاری کے لیے بھی ہے جس میں فکری بیداری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

اے شہر جاگ اور عزائم ہیں آج کے
ہو جائے گا کھنڈر تو بنا احتجاج کے

(ص:149)

وہ زیست کے ارتقائی سفر میں منفی کرداروں کو غیر فعال اور غیر موثر کرنا چاہتی ہیں اور اس حوالے سے تمام تر عملی اقدامات اٹھاتی ہیں۔اسی فکری پس منظر میں اور مذکورہ بحر و وزن میں ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں:

اگر میں قافلے میں ہوں تو پہلا کام ہے میرا
میں رہزن کو امیرِ کارواں ہونے نہیں دوں گی

(ص:150)

ان کی شعریات کے بنظرِ غائر مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ مسلکِ قدر کی حامل ہیں اور یہی ان کا مکتبِ فکر بھی ہے کیونکہ وہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر مجبور و بے بس نہیں دکھائی دیتیں۔گویا ان کے ہاں جبری عوامل کا تصور نہیں ہے۔وہ تمام عناصر کو اپنی دسترس میں سمجھتی ہیں۔ عصری حوالے سے ان کے ہاں تقلید کا کوئی پہلو نہیں ہے۔وہ بنے بنائے راستوں پر چلنے کی قائل نہیں ہیں بلکہ اپنے راستے خود بناتی ہیں۔بقول اقبال:

؎ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

حالات کی واژگونی و سنگینی انہیں محصور و محبوس نہیں کر سکتی۔وہ تمام تر مشکلات سے نکلنے کا ہنر

جانتی ہیں۔ ان کے نزدیک حیات ایک ایسا سفر ہے جس میں خود ہی گرنا اور خود ہی سنبھلنا ہوتا ہے۔ گویا ان کے ہاں ایک خودکفیل رویہ ہے اور ایک خوداعتمادی کی فضا ہے جو انہیں جادۂ منزل پر گامزن رکھتی ہے۔

میں نے تقلید زمانے کی کبھی کی نہیں
اک الگ راہ پہ چلنے کا ہنر ہے مجھ میں
قید رکھ ہی نہیں سکتے غمِ حالات مجھے
اور قفس سے بھی نکلنے کا ہنر ہے مجھ میں
زعمِ ساحل کو بھی نیچا میں دکھا سکتی ہوں
موجِ دریا ہوں اچھلنے کا ہنر ہے مجھ میں
ہاں کسی دستِ تعاون کی طلب گار نہیں
گر بھی جاؤں تو سنبھلنے کا ہنر ہے مجھ میں

ان کے نزدیک جرات و بے باکی کی عمدہ مثال موت سے عشق کرنا ہے۔ حقیقی بہادر وہی ہوتا ہے جو موت سے خائف نہ ہو۔ شعر ھذا کے ذریعے عساکرِ پاکستان کے سپوتوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

یوں تو ہوتے ہیں بہادر بھی ہر اک میداں میں
موت سے عشق جو کرتے ہیں، نڈر ہوتے ہیں

(ص:165)

عام طور پر عورت کو صرف صنفِ نازک ہی خیال کیا جاتا ہے۔ اسے مجبور و لاچار سمجھا جاتا ہے مگر شاہدؔہ لطیف کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ رفعتوں کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں عورت کا مشرقی تصورِ عورت کے مغربی تصور سے پیش رفت کرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی پوری غزل ملاحظہ ہو:

میں کہ عورت کی شان بن کے رہی

عمر بھر اک چٹان بن کے رہی
خود کو اتنا بلند لے گئی میں
تھی زمیں، آسمان بن کے رہی
مجھ میں آباد سینکڑوں یادیں
کب میں خالی مکان بن کے رہی
مجھ کو رہنے دیا تھا زیرِ زمیں
پھر بھی سونے کی کان بن کے رہی
جب تلک مہربان میں اس پر
زیست بھی مہربان بن کے رہی
میں نے قائم رکھا وقار اپنا
عمر بھر عالی شان بن کے رہی

(ص:178)

شاہدہ لطیف کے ہاں جذبوں کی جوانی رجائی احساسات سے مربوط ہے جس میں مشرقی اقدار و روایات بھی شامل ہیں جہاں اسلاف کو بلند مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ بزرگوں کا احترام خوش نصیبی کی علامت ہے۔ ان کے نزدیک وہ مائیں فرخندہ نصیب ہیں جن کے بیٹے مادرِ وطن کے دفاع میں کام آئے۔ درحقیقت یہی درسِ حریت وجاں سپردگی بھی ہے۔

تپتے صحرا کے مسافر جو ہیں سائے کے قریب
اپنی ماؤں کی دعاؤں میں ہیں خوش قسمت ہیں
جن کے بیٹوں کا لہو کام وطن کے آیا
وہ خواتین جو ماؤں میں ہیں خوش قسمت ہیں

(ص:181)

وہ بنی نوعِ انسان کو سعیِ پیہم کا حسیں آدرش دیتی ہیں تاکہ انسانیت کا مستقبل تابناک اور

تمکنت آمیز ہو، اگر انسان کے اندر کے عزائم مضبوط و مستحکم ہوں تو ریگستان کو چمنستان بنا سکتا ہے۔

نسلِ نو کے لیے آئندہ کی تیاری کی
ریگ زاروں میں رہی اور شجر کاری کی

(ص:186)

انہیں اپنی قربانیوں کا ادراک و یقین ہے اور تاریخ سے بھی بہتر توقع رکھتی ہیں۔ انہیں اعتماد ہے کہ تاریخ ان کی قربانیوں کا ضرور اعتراف کرے گی اور ان کا حوالہ ایک نمایاں مقام کا حامل ہو گا۔

جب بھی تاریخ میں تحریر حوالے ہوں گے
لازماً درج مرے پاؤں کے چھالے ہوں گے

(ص:187)

ہم قاری کی طبعِ نازک سے بخوبی واقف ہیں، اس لیے طولِ بیاں کا خوف مانع ہے ورنہ تو اس حوالے سے شاہدہ لطیف کے ہاں فزوں تر استشہادات موجود ہیں جو مزید استخراجات کو جنم دے سکتی ہیں مگر ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان کا سخن عزم و حوصلے کی ایک طویل داستان ہے جس کے تمام کردار فعال و متحرک اور پر جوش و مستعد ہیں۔ گویا قاری کو ان کے کلام کی قرات سے صبحِ نو کی امید ملتی ہے۔

شاہدہ لطیف کی زمانہ شناسی

بنی نوعِ انسان کی فکری بیداری کا عمل بتدریج وقوع پذیر ہوتا ہے اور انسانی ذہن ارتقائی منازل تواتر و تسلسل سے طے کرتا ہے۔ یوں فکری بالیدگی کے حوالے سے فزوں تر پیش رفت ہوتی ہے۔ مشیت نے حضرتِ انسان کو خرد جیسی نعمتِ غیر مترقبہ ودیعت فرمائی ہے اور قلب و خرد کا ایک تال میل ممکن ہوا ہے۔ قلب داخلی امور کا نگران و محافظ ہے اور خرد خارجی عوامل کی نمائندہ ہے۔ فکری حوالے سے انسان متنوع خصوصیات کا حامل ہے۔ ان اوصاف میں زمانہ شناسی ایک خاص وصف قرار پایا ہے جو داخلی و خارجی عناصر کے امتزاج سے عبارت ہے۔ حکمت و دانش، فہم و فراست اور بصیرت سے مملو ہے۔ جس تخلیق کار کی تخلیقات میں یہ وصفِ خاص پایا جائے، وہ وقیع و معتبر مقام و مرتبے کی حامل ہوتا ہے۔

شاہدہ لطیف جو وسیع تر فکری و فنی خصوصیات و ترجیحات کی مالک ہیں، آج ہم ان کے سخن کا تجزیہ زمانہ شناسی کے تناظر میں کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے ہم ان کے اولیں مجموعہ ء کلام ''معجزہ'' مطبوعہ فروری 1999ء کی منتخب غزلیات اور غزلیات کے اشعارِ منتخبہ بطور استشہادات برائے استخراجات لائیں گے۔ اس حوالے سے تمام تر انتقادی امکانات بھی زیرِ بحث آئیں گے۔

اگر زمانہ شناسی کے پہلو بہ پہلو انسان دوستی کا وصف بھی میسر آ جائے تو یہ سونے پر سہاگہ ہے کیونکہ انسان دوستی کے لیے زمانہ شناسی کا وصف بھی ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر آپ صحیح معنوں میں انسانیت کا ادراک نہیں کر پاتے اور نہ انسانی خدمت کا اہم فریضہ سرانجام دے پاتے ہیں۔ انسان دوستی ایک ایسی معتبر و قابلِ ستائش خوبی ہے کہ آپ برائی کا جواب بھی اچھائی سے دینے کے

قائل ہوتے ہیں اور جفاؤں کے بدلے وفاؤں کی آبیاری کرتے ہیں۔

مرے پڑوس کے گھر میں اگر اندھیرا ہے
تو اپنے گھر میں بھلا میں دیا جلاؤں کیا؟
اٹھا رہا ہے مرے گرد وہ حسیں دیوار
میں سوچتی ہوں اسے راہ سے ہٹاؤں کیا؟

(ص:24)

اہلِ زمانہ کی یہ ہمیشہ روش رہی ہے کہ وہ دوسروں پر ہر حال میں ہنستے رہتے ہیں۔ گویا انہیں ہنسنے کے لیے کسی عذرِ خاص کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خواہ مخواہ ہنسنا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ کوئی معقول جواز ان کے ہنسنے مقتضیات میں شامل نہیں ہے۔

آشفتگیِ جاں ہے مری وجہِ انبساط
دنیا کو تو ہنسی کے لیے بات چاہیے

(ص:31)

شاہدہ لطیف کی زمانہ شناسی عصری ادراکات اور ترجیحات و میلانات سے عبارت ہے۔ ان کا شمار اہلِ احتیاط میں ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بہت سی احتیاطیں ملحوظِ خاطر رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں ایک تہذیبی وضع داری اور رکھ رکھاؤ ہے جو ان کی انانیت کے وسیع تر مصادر و مراجع سے مربوط ہے۔ وہ مردم شناسی کا ہنر جانتی ہیں اور ان کے معاملات بھی اسی آگہی کے زیرِ اثر ہیں۔ اسی پس منظر میں ان کی غزل کا مطلع قابلِ ذکر ہے جو بحرِ رمل مثمن محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔

فاصلے سوچا کرو اور ضابطے رکھا کرو
پتھروں کے سامنے مت آئینے رکھا کرو

(ص:33)

یہ ایک تلخ سماجی حقیقت ہے کہ اہلِ زمانہ اچھے تخلیق کاروں کو تحسین و ستائش سے نوازنے کی

بجائے مختلف النوع عقوبتوں سے دوچار کرتے ہیں۔ سخن کا پیام لانے والے اس عہدِ نامشکور میں عذاب سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسی امر کا اندیشہ انہوں نے بھی ظاہر کیا ہے۔ شعر ھذا بحر ہزج مثمن سالم میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

سخن کی اک پیمبر ہوں میں عہدِ ناسپاسی میں
اتارو مجھ پہ بھی کوئی عذاب آہستہ آہستہ

(ص:45)

ان کی زمانہ شناسی کا نکتہء کمال یہ ہے کہ وہ ہمیشہ باطنی امور کو لائقِ اعتنا سمجھتی ہیں۔ ظاہر یا خارج تو ان کے نزدیک محض دکھاوا ہے۔ اسی ادراک کی ترسیل انہوں نے اپنے اس شعر میں بھی کی ہے۔

ہمیشہ نیتِ انسان پر نظر رکھنا
کسی لکھی ہوئی تحریر پر نہیں جانا

(ص:69)

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اہلِ احتیاط ہیں لیکن جب احتیاط بزدلی سے عبارت ہو جائے تو پھر اس سے راہِ گریز اختیار کرتی ہیں۔ نڈر اور بے باک ہو جاتی ہیں اور معاملہ توکل پر چھوڑ دیتی ہیں۔ ان کا موقف بھی یہی ہے کہ ہونی تو ہر حال میں ہونی ہے، کیونکہ اسے انہونی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا، یوں وہ ہر طرح کے نتائج سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ان کا یہ مقطع لائقِ التفات ہے۔

اس قدر بھی احتیاطیں شاہدہ اچھی نہیں
جو بھی ہونا ہے وہ اب کے برملا ہو جائے گا

(ص:70)

ہمارا سماج عجیب لایعنیت کا شکار ہے۔ اسی عدم مقصدیت نے مقصدیت کی اہمیت کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔ ماجرا یہ ہے کہ یہاں خوشی و غم دونوں بے کیف و سرور ہیں۔ یعنی دونوں تاثیرات

کی کیفیت سے عاری ہیں۔جس سے ایک غیر سنجیدگی کا پہلو بھی اجاگر ہوتا ہے۔یوں بے حسی نمو پذیر ہوتی ہے۔جو اس معاملے کو داخلی انداز سے دیکھتے ہیں، اسے آگہی کے قرینے سے تعبیر کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ غم والم سے نرم دلی کے انداز میں گزر رہے ہیں، سرورِ زیست سے وہی آشنا ہیں۔اگر شعری حوالے سے بات کی جائے تو عصری شعری رویہ کچھ زیادہ ہی عمومیت آشنا ہو گیا ہے۔یوں شاعری کے اختصاصی زاویے بدستور کمزور پڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ زمانہ شناسی کے حوالے سے اسی نوع کے ادراکات ذرا شاہدہ لطیف کی زبانی دیکھیے۔

نہ غم کو غم نہ خوشی کو خوشی سمجھتے ہیں
یہ زندگی کو کہاں زندگی سمجھتے ہیں؟
جو دیکھتے ہیں پس و پیش دل کی نظروں سے
اسی قرینے کو ہم آگہی سمجھتے ہیں
غم والم سے جو گزرے ہیں نرم دل لے کر
سرورِ زیست کو بے شک وہی سمجھتے ہیں
نہ جانے رہتے ہیں وہ کس فضا کے دامن میں
جو عام بات کو بھی شاعری سمجھتے ہیں

(ص:74)

وہ اہلِ زمانہ کو زندگی کرنے کا عزم و حوصلہ دیتی ہیں۔وہ بے سروسامانی اور ناسازیءحالات میں بھی ترغیبِ عمل دیتی ہیں۔وہ اپنے سماج سے گویا ہیں کہ جا بجا نمرودی طاقتوں نے اپنے جبرو استبداد سے تسلط قائم کیا ہوا ہے مگر یہ طے ہوا ہے کہ جذبہءحریت کے ساتھ جو بھی کرنا ہے وہ بے خوف و خطر کرنا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ عصری صحافت بھی عدم مقصدیت کا شکار ہے۔لایعنیت کو فروغ حاصل ہے۔عجیب و غریب واقعات نے خبروں کا روپ دھار لیا ہے۔

بے ارادہ تو نہیں لیکن سفر کرنا تو ہے
ہاتھ خالی ہی سہی کچھ بھی مگر کرنا تو ہے

سامنا نمرود سے جب جابجا ہو ہر گھڑی
جو بھی کرنا ہے ہمیں وہ بے خطر کرنا تو ہے
اب صحافت کا چلن بھی شام کا اخبار ہے
واقعہ جیسا بھی ہو اس کو خبر کرنا تو ہے

(ص:82)

اہلِ دنیا کا یہ ایک روایتی رویہ ہے کہ وہ منافقت کے حامل ہوتے ہیں۔ زبانی کلامی خلوص و مروت کے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر وہ بظاہر انجان نظر آتے ہیں۔ شیطانیت روز بروز رو بہ فروغ ہے۔ شیطان کے حواریوں کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر جگہ بہ آسانی دستیاب ہیں۔

پیار کا دعویٰ ہے جن کو
لگتے ہیں انجان بہت
مت ڈھونڈو مل جائیں گے
اس جگ میں شیطان بہت

(ص:89)

زمانہ شناسی کے حوالے سے ان کی ایک پوری غزل قابلِ ذکر ہے جس کا تجزیہ قارئین کی صوابدید پر ہے۔

آئینہ سامنے رکھتے ہیں دکھا دیتے ہیں
ایسی باتوں کی ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں
دیوتا جان کے ہم پوجتے رہتے ہیں جنہیں
چند لمحوں میں وہ اوقات دکھا دیتے ہیں
جتنے اوصاف ہیں سب عیب میں ڈھل جاتے ہیں
جب بھی کردار انہیں اپنا دکھا دیتے ہیں

ہے مروت بھی بڑی چیز مگر ہم اکثر
باتوں باتوں میں بہت کچھ ہی سنا دیتے ہیں

(ص:90)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ محبت، پیار، جنوں اور رومان پرور جذبوں کی ہر عہد میں شعر وسخن کے نقد ونظر کے فیصلے کرنے والوں نے مخالفت کی ہے مگر ان کے ہاتھ نام نہاد جدت پسندی کے سوا کچھ بھی نہیں آیا۔ کیونکہ رومان ہر شعری دور کا ایک محبوب ترین اور لطیف موضوع رہا ہے۔ اس پیش گوئی کو روزِ روشن کے مصداق حقیقت کے طر پر ہر عہد میں تسلیم کیا جاتا رہے گا کہ محبت ہر دور میں تندرست وتوانا رہے گی۔ اس کے مخالفین اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گے۔ اسی آدرش کی جانکاری ان کے درج ذیل مطلع میں دیکھیے جو بحر ہزج مثمن محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروض ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

محبت پھر ہمیں تسلیم کرنا پڑ رہی ہے
جنوں کی کس قدر تکریم کرنا پڑ رہی ہے؟

(ص:95)

اہلِ زمانہ خود غرض اور مفاد پرست ہو گئے ہیں اور ان کی مطلب پرستی عصری بے حسی کو جنم دے رہی ہے۔ سماج میں مادی اقدار روبہ ارتقا ہیں۔ جذبات واحساسات لائقِ اعتنا نہیں رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی قدر ومنزلت اور پذیرائی ہونی چاہیے۔ مادیت کے فروغ نے استحصالی رویوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ایک دوسرے کا حق غصب کرنے کی روش روایت بن چکی ہے۔ منافقت اور دھوکہ دہی کا چلن عام ہے۔ دوہرے رویوں کی عمل داری ہے۔ یہی معاملہ شعر وادب میں بھی کارفرما ہے جنہیں اس حوالے سے اخلاص میسر نہیں ہے۔ وہی ادب کے علمبردار قرار پائے ہیں۔ گویا ادب کی قیادت غیر مخلص لوگوں کے پاس آ گئی ہے۔

سب اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر سجانے نکلے ہیں
ہم اپنے دل میں جذبوں کی تصویر سجانے نکلے ہیں

جو مانگے کی دستار لیے کل اکڑے اکڑے پھرتے تھے
وہ آج کسی کا خوں پی کر جاگیر سجانے نکلے ہیں
یہ بات کسے معلوم نہیں ہم اور بھلا بتلائیں کیا
جو لفظوں سے مانوس نہیں ، تحریر سجانے نکلے ہیں

(ص:96)

عصرِ حاضر میں اگر چہ ہر طرف علم کی روشنی عام ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی ہر طرف جہالت کی تاریکی ہے کہ کسی کو کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا۔ گویا تعلیمی انقلاب اپنے وہ اثرات مرتب نہیں کر سکا جو مثالی دنیا کے خواب کی تعبیر بن سکتے۔ اگر بالواسطہ انداز میں سوچا جائے تو یہاں معاملہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پامالی کا ہے۔ عصری بے حسی اور خود غرضی کا ہے۔ مادیت پسند رویوں نے ہمیں چشمِ بینا سے محروم کر دیا اور ہم حصارِ سود و زیاں میں مقید ہو گئے۔ اسی تناظر میں شاہدہ لطیف کا ایک شعر قابلِ ذکر ہے۔ یہ شعر بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔ واضح رہے کہ'' فعولن'' مفاعیلن کی محذوفی حالت ہے۔

مرے چاروں طرف ہے روشنی سی
کسی کو کچھ یہاں دِکھتا نہیں ہے

(ص:102)

محنت کی عظمت سے آج تک کوئی بھی انحراف نہیں کر سکا۔ گویا اس کی حیثیت ایک عالمگیر حقیقت کی ہے۔ جادۂ منزل پر گامزن رہنے کے لیے اس کا کردار کلیدی ہے۔ حصولِ مقصد میں یہ ایک نویدِ کامیابی و کامرانی ہے مگر اس راہ میں بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ مشکلات کو جھیلنا پڑتا ہے۔ پھر ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب مشکلات آسان ہو کر دم توڑ جاتی ہیں۔ بقول شاعر:

؎ مشکلیں اتنی پڑی مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اسی فکر کی ترجمانی انہوں نے کچھ اس انداز میں کی ہے۔

وہ مشکلوں کو اور بڑھاتے چلے گئے

جو راستے حیات کے آسان ہو گئے

(ص:120)

عہدِ موجود کا المیہ یہ ہے کہ قحط الرجال کا شکار ہے۔جس کے باعث بہت سے سماجی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔آج کا انسان مکارمِ اخلاق کو یکسر فراموش کر چکا ہے۔عصری بے حسی اپنے پنجے یوں گاڑ چکی ہے کہ انسان کردار کی پسماندگی کا اسیر ہو چکا ہے۔اپنے ذاتی تشخص کے مثبت ہونے کا لحاظ ناپید ہو گیا ہے۔وفا کے بدلے میں جفا کا چلن عام ہو گیا ہے۔حتیٰ کہ لوگ وفا کی تمیز تک بھول چکے ہیں اور الزام تراشی وطیرہ بن چکی ہے۔

نصیب اس کو کہاں شاہدؔہ تمیزِ وفا
جو آدمی فقط الزام دھرنے والا ہے

(ص:122)

وہ لوگ ہمیشہ زمانہ ساز ہوا کرتے ہیں جو عزم و حوصلے کے امیں ہوتے ہیں۔ ہمت و جسارت اور جرات و بسالت ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے حالات میں وہ پر جوش رہتے ہیں اور انسانیت کا جذبہ بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ان کے برعکس ایسے لوگ ہوتے ہیں جو انسانیت کے لیے باعثِ ننگ و عار ہوتے ہیں۔جہاں ایسے انسان بستے ہوں، پھر اس معاشرے میں رہنے کے بجائے انسان جنگل میں ہی اپنا مسکن بنانے کو ترجیح دیتا ہے۔ پھر اس کی مانوسیت انسانوں کی بجائے پرندوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اپنا کتھارسز انسانوں کی بجائے پرندوں سے کرنا چاہتا ہے۔ یہ احساسات شدید نوعیت کے احساسِ تنہائی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ جب انسان کو ازمنۂ قدیم کی اقدار و روایات یاد آتی ہیں تو پھر گزشتہ ساعتوں کی بازیافت کا خواہاں ہوتا ہے۔اگرچہ اس عمل کے لیے بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے، پھر بھی وہ نئے سرے سے آغاز کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ پرانی اقدار و روایات سے مانوس ہوتا ہے۔ یہ مانوسیت اس لیے ہوتی ہے کہ اس میں فرحت و تمکنت اور سکھ کے سانس کا سامان موجود ہوتا ہے۔اسی پس منظر میں ان کی غزل کے تین اشعار لائقِ توجہ ہیں جو بحر متقارب مثمن سالم میں

کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ’’فعولن فعولن فعولن فعولن‘‘ ہیں۔

چلو حوصلہ مند آغاز کر لیں
شکستہ پروں سے ہی آغاز کر لیں
یہ انساں تو سنتے نہیں ہیں کسی کی
پرندوں کو ہم اپنا ہم راز کر لیں
پرانے دنوں کی طرف لوٹ جائیں
ہے انجام تو اس کو آغاز کر لیں

(ص:129)

عظیم اور باہمت لوگ تاریخ ساز ہوا کرتے ہیں۔ وہ حالات کی سنگینیوں سے کبھی خائف نہیں ہوتے۔ بقول کسے:

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

جو عزم بالجزم رکھتے ہیں، تاریخ میں ان کا حوالہ معتبر و وقیع نوعیت کا ہوتا ہے۔ شاہدہ لطیف کا ایک اور شعر نذرِ قارئین ہے جو مذکورہ بالا فکری پسِ منظر میں ہے۔ شعر ھذا بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ’’مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن‘‘ ہے۔ یہ شعر خود میں عزم و حوصلے کی نئی نوید رکھتا ہے۔

تاریخ کے اوراق پہ لکھنا ہے بہت کچھ
مت سوچ کہ حالات سے ڈر جائیں گے ہم لوگ

(ص:132)

اہلِ زمانہ میں دوہرے رویوں کا چلن عام ہے۔ اس لیے جیون بے کیف و سرور ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں اچھائی کا صلہ برائی اور وفا کا صلہ جفا کی صورت دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے حالات زندگی کو بے سود ثابت کرنے کے لیے کافی ہوا کرتے ہیں۔ اسی نسبت سے ان کی غزل کا ایک شعر

شاملِ شذرہ ہے جو بحر متقارب مثمن محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعلن فعل'' ہیں۔

مجھے زندگی سے بھلا کیا ملا؟
وفاؤں کے بدلے جفا لے گئی

(ص:138)

جب انسان بالیدہ فکری کی سطح تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسے کتابیں پڑھنے کے پہلو بہ پہلو انسانوں کا مطالعہ کرنے کا ہنر بھی بخوبی آجاتا ہے۔ وہ ہر آنکھ میں موجود مخفی سوالات کو بہ آسانی بھانپ لیتا ہے۔ ہر صورت کی صورتِ حال سے بطریقِ احسن آشنا ہو جاتا ہے۔

جانے کیوں ہر آنکھ سوالی لگتی ہے
ہر صورت ہی دیکھی بھالی لگتی ہے

(ص:144)

جب حالات ناموافق ہوں تو بہت سے بامقصد کام بھی عدم مقصدیت کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ تکلفات محسوس ہوتے ہیں۔ عمرانی رویوں کی ناہمواری کا حاصل یہ شعر دیکھیے جو بحر رمل مسدس مقصور میں ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلان'' ہے۔ واضح رہے کہ ''فاعلان'' فاعلاتن کی مقصوری حالت ہے۔

ناسمجھ ناداں ہے جب سے سارا سماج
کیوں ادب آداب میں رہتے ہیں ہم

(ص:153)

شاہدہ لطیف کے سخن کے فکری و فنی گوشوں کی سیر حاصل غواضی کے بعد یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ ان کا کلام زمانہ شناسی کے وسیع تر اوصاف کا حامل ہے۔ اگر وہ میدانِ شعر میں اسی طرح اپنی کشیدِ جاں تواتر و تسلسل سے لٹاتی رہیں تو زمانہ شناسی کے اعماق و آفاق کے نئے ابواب وا ہوں گے۔

شاہدہ لطیف کا ادراکِ ذات

کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقات کے تجزیاتی مطالعہ کے تناظر میں اس کا ادراکِ ذات خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ اس کی بدولت اس کے فکر وفن اور شخصیت ومزاج کو بہ حسن وخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔اس کی شعریات کی قدر و قیمت کے تعین میں مدو معاون ثابت ہوسکتا ہے۔مگر کسی غزل کے مقطع میں شاعرانہ تعلّی میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے لیکن شاعرانہ تعلّی میں شاعر صنعتِ مبالغہ کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔گویا تحقیق سے ثابت ہوا کہ شاعرانہ تعلّی میں ادراکِ ذات متوازن و معتدل نہیں ہوتا بلکہ افراط کا شکار ہوتا ہے۔گویا شاعرانہ تعلّی کے تجزیاتی مطالعہ میں اس امر کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔اگر مذہبی حوالے سے بات کی جائے تو مقولہ معروف ہے جسے آپ کے قولِ زریں سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔''جس نے اپنے آپ کو پہچانا،اس نے اپنے رب کو پہچانا۔''اگر تصوف کے حوالے سے بات کی جائے تو اس کے مراحل میں ایک مرحلہ فنا فی النفس بھی ادراکِ ذات سے متعلق ہے جسے تصوف میں جہادی حیثیت حاصل ہے۔

شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے سخن کا تجزیہ ادراکِ ذات جسے عرفانِ ذات سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے، کے تناظر میں کر رہے ہیں۔اس سلسلے میں ہم ان کے پانچویں مجموعہء کلام ''محبت ہو نہ جائے'' مطبوعہ جون 2006ء کی منتخب غزلیات اور منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ زیرِ بحث لائیں گے جس کی بدولت ہمیں ان کی ذات وشخصیت اور رجحانات ومیلانات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور ان کے سخن کے مقام ومرتبے کے تعین کے حوالے سے بھی سہولت کا ساماں ہوگا۔

شاہدہ لطیف نے ادراکِ ذات کے ابلاغ کے حوالے سے دو صیغوں یعنی واحد متکلم اور جمع

متکلم کا استخدام کیا ہے۔ واحد متکلم کا صیغہ انفرادی و ذاتی نسبت سے ہے جبکہ جمع متکلم کا صیغہ اجتماعی و انفرادی دونوں پہلوؤں سے ہے۔ مزید برآں دہلوی تہذیب کا نمائندہ بھی ہے کیونکہ دبستانِ دہلی کے شعرا عموماً اپنے لیے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا کرتے تھے جو احترامِ ذات کے پہلو بہ پہلو تہذیبی رکھ رکھاؤ اور وضع داری کی علامت بھی ہے۔ انہوں نے اظہارِ ذات کے حوالے سے جمع متکلم کے صیغے کو بکثرت برتا ہے۔ اس سے یہ امر بھی مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے کلاسیکی شعری روایت سے بھی بھرپور اکتسابِ فیض کیا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار متقدمین و متوسطین کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں مگر انہوں نے معاصر شعری روایت کا بھی بھرپور ساتھ دیا ہے۔

وہ اپنے عہد پر اپنے اثرات مرتسم کرنے کی خواستگار ہیں۔ انہیں اپنی شعریات میں اثر آفرینی درکار ہے اور اپنے دل میں جوش و جذبے کی خواہاں ہیں۔ ان کے ہاں لایعنیت سے شعوری گریز کی صورت کارفرما ہے۔ اس لیے وہ بے روح فلسفوں کی قائل نظر نہیں آتیں۔ انہیں لفظوں میں دھڑکنوں کا ہنر مطلوب ہے۔ وہ مثالی زندگی کی خواستار ہیں۔ جس میں بہار افشانی ہو اور وہ ایسا ہی مسکن چاہتی ہیں۔ ان کا مثالی حیات کا خواب انفرادی و اجتماعی دونوں پس منظر کا حامل ہے۔

اپنی ہر اک نوا کا اثر چاہیے مجھے
اس خاک دانِ دل میں شرر چاہیے مجھے
بے روح فلسفوں کی ضرورت نہیں مجھے
لفظوں میں دھڑکنوں کا ہنر چاہیے مجھے
سبزہ ہو اور ابرِ رواں چارسو محیط
پھولوں کی رہ گزار پہ گھر چاہیے مجھے

(ص:21)

وہ روشن فکریات کی حامل ہیں، فکری بیداری جس کا کلیدی تلازمہ ہے۔ افکار میں بالیدگی ان کے موضوعات کا طرۂ امتیاز ہے۔ جس کی ترسیل وہ اپنے قاری کے لیے پیمانۂ شعر میں کرتی

ہیں۔اس حوالے سے وہ جذبات واحساسات اور تجربات ومشاہدات کی وسعت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

تمہارے آئینہ ء فکر میں نہیں روشن
جو میرے عکسِ درخشاں کے ماہ وسال میں ہیں

(ص:23)

شاہدہ لطیف امن پسندی کی قائل ہیں اور یہ اہم فریضہ وہ اپنی روشن فکر کے توسط سے بطریقِ احسن سرانجام دیتی ہیں۔اس لیے وہ اپنا شمار امن پسندوں میں کرتی ہیں۔اسی نسبت سے ان کی غزل کا ایک شعر دیکھیے جو بحر ہزج مثمن سالم میں کیا گیا ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

جو خنجر سے تہی ہیں روشنی آباد ہے جن سے
میرا ان سدھی سادی آستینوں سے تعلق ہے

(ص:25)

توکل واستغنا ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات ہیں اور وہ اہلِ دنیا سے بے نیازی کا رویہ روا رکھنے کی قائل ہیں۔لیکن اسی بے نیازی کا مفہوم سرد مہری، بے حسی اور عدم توجہی ہرگز نہیں ہے۔ بے نیازی سے مراد ذاتی مفادات سے دستبردار ہونا ہے یعنی ان میں لوبھ اور لالچ کا رویہ نہیں ہے۔ وہ مادیت پسند رویوں سے اجتناب کرتی ہیں اور اخلاص ومروت کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان کی مقبولیت و پذیرائی کا راز بھی اسی امر میں مضمر ہے کیونکہ وہ بے لوث و بے ریا جذبوں کی امین ہیں۔جن کے باعث وہ محبوبِ جہاں قرار پائی ہیں۔اسی نسبت سے ان کی غزل کا ایک شعر قابلِ توجہ ہے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔''فعولن'' مفاعیلن کی محذوفی حالت ہے۔

مری یہ بے نیازی ، کم نگاہی
تجھے مجھ سے محبت ہو نہ جائے

(ص:27)

شاہدہ لطیف کی ذات خلوص و مروت کا استعارہ ہے۔اس حوالے سے وہ جذبہ ایثار کی مالک ہیں ۔آرزوؤں اور امنگوں کا ان کا اپنا ایک جہان ہے۔محبت ہی ان کی چشمِ بصیرت ہے۔صبر و شکر جس کا مبادی تلازمہ ہے۔ بحر متقارب مثمن سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔ اس بحر کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہیں۔

مری چھت ستارے مری آرزو کے
مرے بام و در ہیں محبت کی آنکھیں

(ص:29)

اسی فکری تسلسل کا حامل ان کی غزل کا ایک مطلع جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے،جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے،شاملِ شذرہ کیے دیتے ہیں۔

میں خوابوں میں اترتی جا رہی ہوں
محبت سے سنورتی جا رہی ہوں

عام طور پر محبت کے اثرات کے حوالے سے منفی تاثر کی نسبت سے بات کی جاتی ہے جس کے سبب تباہی و بربادی اور حزن و ملال کا بیان ہوتا ہے لیکن وہ محبت کے تعمیری پہلو کو سامنے لاتی ہیں کیونکہ وہ مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہیں۔ان کے فیصلے بسیط غور و خوض کے حامل ہوتے ہیں جس کے باعث لچک پذیری کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ان کا موقف مستحکم و توانا ہوتا ہے۔ان کے پاس وہ اخلاص و مروت ہے کہ وہ دلوں میں گھر کرنے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں اور زندگی کی بے ثباتی کا بھی ادراک رکھتی ہیں جس کی ترسیل وہ اپنے پیمانہ ہائے اشعار میں کرتی ہیں۔

فیصلے بدلنے کی عادتیں نہیں مجھ کو
بس وہی کروں گی میں دل نے جو بھی ٹھانی ہے
شاہدہ بناتی ہوں میں دلوں میں گھر اپنا
ورنہ زندگی کا کیا ہے زندگی تو فانی ہے

(ص:37)

وہ احترامِ آدمیت کی قائل ہیں جو عزتِ نفس سے مملو ہے۔انہیں اپنے وقار و معیار کا پاس بھی ہے جسے وہ ایک سرسری معاملہ نہیں سمجھتی اور اس حوالے سے کافی سنجیدہ بھی ہیں۔

فقط یہ جنبشِ ابرو تو کوئی بات نہیں
خلوصِ دل سے مجھے وہ سلام تو کرے

(ص:41)

ادراکِ ذات کے حوالے سے شاہدہ لطیف کی ایک پوری غزل بدونِ تبصرہ ملاحظہ کریں جو بحرِ متقارب مثمن سالم میں ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

زمیں اور بھی ہیں زماں اور بھی ہیں
نظر سے چھپے آسماں اور بھی ہیں
ابھی ہم محبت کو سمجھے کہاں ہیں
محبت میں کارِ زیاں اور بھی ہیں
ابھی تازہ دم ہیں اڑانیں ہماری
سفر اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
ستارے، سمندر، یہ صحرا، یہ دریا
مری منزلوں کے نشاں اور بھی ہیں
ہمی تو نہیں اس جہاں میں انوکھے
ہمارے کئی ہم زباں اور بھی ہیں
مسافر ہیں ہم تو نئی منزلوں کے
ہماری نظر میں جہاں اور بھی ہیں

(ص:45)

ان کے نزدیک اصل حقیقت انسان کا باطنی یا داخلی ماحول ہوتا ہے۔اگر اس حوالے سے

شادمانی میسر ہو تو باہر کی دنیا بھی خوشگوار محسوس ہوتی ہے۔آ گہی وہ فضلِ خدا ہے جو مشیت کی طرف سے ہر کسی کو ودیعت نہیں ہوتا بلکہ قدرت اس حوالے سے کسی دیدہ ور شخصیت کا انتخاب کرتی ہے۔ شاہدہ لطیف کے ادراکات بسیط و عریض ہیں۔اس حوالے سے ان کی ایک اور غزل کے دو اشعار دیکھیے جو بحر متدارک مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ''فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن'' ہیں۔

فصلِ گل آ گئی ہے تو ہم کیا کریں
جس سے دل خوش ہو ایسی خبر چاہیے
عام لوگوں کی کب ہے رسائی وہاں
آ گہی کے لیے دیدہ ور چاہیے

(ص:49)

وہ اس امر پر یقین رکھتی ہیں کہ اہلِ زمانہ کے ہاں انصاف پسند رویے بھی پائے جاتے ہیں۔اگر آپ کا موقف معقولیت و منطقیت اور معروضیت پر مبنی ہو تو لوگ ضرور احترام کرتے ہیں۔بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتح:

یقیناً انقلابِ حال میں کچھ دیر لگتی ہے
یہ سچ ہے کہ زمانہ محتسب ہے اور عادل بھی

اسی فکر کی ترجمانی شاہدہ لطیف نے کچھ یوں کی ہے مگر ان کے اظہار کی سادگی مسلم ہے۔

کیوں نہ پھر احترام لوگ کریں
مستند ہو اگر کوئی رائے

(ص:51)

انہیں اس حقیقت کا ادراک ہے کہ یہ شان و شوکت، جاہ و حشمت اور حسن و دولت جو مجھے میسر ہے، اگر میں اسے خاطر میں لاؤں تو مجھ سے اہلِ زمانہ خوف زدہ ہو جائیں۔ان کی یہی فکر ان کی حقیقت نگاری سے عبارت ہے۔

یہ کروفر ، یہ وجاہت، یہ حسن و دولت و مال
جو اپنی ذات میں جھانکیں تو لوگ ڈر جائیں

(ص:52)

وہ محبتوں میں پاسِ وفا کی قائل ہیں، جیسے گھٹن میں تازہ ہوا ضروری ہوتی ہے جبکہ عشق ایک ایسا جذبہ ہے جس میں کسی نوع کے صلے کی کوئی گنجائش نیں ہوتی۔ عشق میں قربتیں بھی ہوتی ہیں مگر ضابطوں کو ملحوظِ خاطر رکھنے کے لیے کچھ دوری بھی ناگزیر ہوا کرتی ہے۔ وہ دل کے راستوں سے گزرنے کے لیے بھی ضابطے کو ضروری خیال کرتی ہیں۔ دل و دماغ خدشات کی آماجگاہ ہوا کرے ہیں مگر لبوں پر حرفِ دعا رکھنا ناگزیر ہوا کرتا ہے۔

محبتوں میں خیالِ وفا ضروری ہے
گھٹن میں جیسے کہ تازہ ہوا ضروری ہے
وہ عشق کیا ہے کہ جس کا صلہ ضروری ہے
ملن بھی ٹھیک مگر فاصلہ ضروری ہے
ہمارے دل سے بھی اک راستہ گزرتا ہے
گزر تو جاؤ مگر ضابطہ ضروری ہے
دل و دماغ میں خدشے ہزار رہتے ہیں
تمہارے لب پہ بھی حرفِ دعا ضروری ہے

(ص:54)

ادراکِ ذات کے حوالے سے ان کی ایک پوری غزل بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین ہے جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

ادھورے غم ادھورے رتجگے اچھے نہیں لگتے
بکھرتے ٹوٹتے سپنے مجھے اچھے نہیں لگتے
میں ہوں تکمیل کی قائل یہی ہے قاعدہ میرا

جدا ہوتے ہوئے سب راستے اچھے نہیں لگتے
محبت میں یقیناً فاصلہ رکھنے کی قائل ہوں
مگر حد سے زیادہ فاصلے اچھے نہیں لگتے
حصارِ ذات میں رہنا مری مجبوریاں بھی ہیں
مجھے لوگوں سے اتنے رابطے اچھے نہیں لگتے
محبت ہو نہ جائے شاہدؔہ یہ خوف ہے مجھ کو
یہ مجنوں کی طرح کے حوصلے اچھے نہیں لگتے

(ص:57)

شاہدؔہ لطیف انتہائی سادہ شخصیت کی مالک ہیں اور طبیعت میں شوخی ان سے گریزاں ہے۔ ایسے افراد کبھی فکرِ رنگ و بو نہیں کرتے۔ ویسے تو ہر احساس کا مداوا ہوتا ہے، ہر درد کی دوا ہوتی ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر درد کی دوا کی جائے۔ اسی کے بمصداق ہر زخم کا رفو ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔

طبیعتاً ہی بہت سادہ ، شوخ طبع نہیں
ہم ایسے لوگ غمِ رنگ و بو نہیں کرتے
یہ کیا ضروری ہے کہ ہر درد کی دوا کی جائے
کچھ ایسے زخم ہیں جن کو رفو نہیں کرتے

(ص:65)

اہلِ صبر کا یہ وطیرہ ہوا کرتا ہے کہ وہ کربِ ذات کے اذیت ناک مرحلے میں خاموش رہتے ہیں اور کسی نوع کی آہ و فغاں نہیں کرتے۔ جن سے دادرسی کی توقع ہو، اگر وہ تعاون نہ بھی کریں تو ان کے حوالے سے منفی اندازِ فکر نہیں رکھتے۔

میں کربِ ذات کے صحرا میں بھی رہی خاموش
وہ کر کے وعدہ نہ آیا تو کچھ نہیں سوچا

(ص:61)

سماج کے ناہموار رویوں کے باعث حریفانہ طرزِ سلوک سے گریز کرنا اور مہر و وفا کے جذبوں سے انحراف نہ کرنا اعلیٰ ظرفی کی علامت ہوا کرتی ہے۔بقول راقم:

اگرچہ نہیں اچھے حالات میرے
نہیں باغیانہ خیالات میرے

اسی فکری تسلسل کی ترجمانی انہوں نے کچھ یوں کی ہے۔

اتنی اعلیٰ روایت سے باغی نہ کر
مجھ کو میری محبت سے باغی نہ کر

(ص:69)

بالیدہ فکری ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔وہ رفاقتوں میں بھی توازن و اعتدال کی قائل ہیں کیونکہ وہ اپنے حوالے سے رائے عامہ کو مثبت رکھنے کی خواہاں ہیں اور مشرقی اقدار و روایات کو بھی ملحوظِ خاطر رکھتی ہیں اور اسلامی تہذیب کو بھی فراموش نہیں کرتیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی فحوائے شعر میں ایک سنجیدگی کی فضا کارفرما ہے۔

رات دن سایہ بن کر نہ ہمراہ چل
مجھ کو میری رفاقت سے باغی نہ کر

(ص:69)

وہ ہر قسم کے حالات میں پاسدارِ مہر و محبت رہتی ہیں اور شمعِ الفت کو ہر حال میں فروزاں رکھتی ہیں۔اگر زمانہ انہیں بے یار و مددگار بھی کر دے تو پھر بھی ان کے حوصلے جواں رہتے ہیں۔اہلِ جہاں کے جور و ستم جس قدر بھی بڑھیں، پھر بھی ان کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آتی۔

آندھیاں ہوں کہ برق و باراں ہو
چاہتوں کا دیا جلانا ہے
اک طرف میں ہوں بے کس و تنہا

دوسری سمت یہ زمانہ ہے

دل ہمارا ہے اس جہاں کا ہدف

برق کی زد پہ آشیانہ ہے

(ص:70)

شاہدؔہ لطیف اس حدیث مبارکہ پر عمل پیرا ہیں کہ مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔اسی فکر کی ترجمانی ان کے اس شعر میں موجود ہے۔

ہے شاہدؔہ لطیف عقیدہ یہی مرا

پہنچے نہ دکھ کسی کو بھی میری زبان سے

(ص:71)

یہ ایک مسلمہ اور تلخ حقیقت ہے کہ اقلیمِ شعر میں حزنیہ افکار کی فزوں تر عمل داری رہی ہے جس سے قاری کو بھی کسی حد تک بیزاری ہوئی ہے مگر مقامِ حیرت واستعجاب ہے کہ انہوں نے اپنی ایک غزل میں ہر نوع کے حزن والم کی تردید کی ہے اور یوں قاری کو بھی سکھ کا سانس میسر آیا ہے۔ ان کی غزل کا یہ کمال ایک ردیفی تقاضا بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ غزل بحرِ رمل مثمن محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔

ہر طرف چوکس ہیں پہرے دار کوئی غم نہیں

اپنے مونس ہیں درو دیوار کوئی غم نہیں

کس طرح ان کو بتائیں ہم یہاں ہیں شادماں؟

جیت ہے کوئی ، نہ کوئی ہار، کوئی غم نہیں

پہلے دل میں تھی تری چاہت کے زخموں کی بہار

اب نہیں غم کے کوئی آثار، کوئی غم نہیں

صاف جب ہم کہہ رہے ہیں کچھ نہیں وجہِ ملال

مانتے پھر کیوں نہیں سرکار، کوئی غم نہیں

بار بار ان کی طرف سے ہے سوالِ رنجِ دل

کہہ رہی ہے شاہدہ ہر بار کوئی غم نہیں

(ص:72)

شاہدہ لطیف خدائے بزرگ و برتر پہ مکمل یقین و اعتماد رکھتی ہیں کہ جو سکھ ملتے ہیں وہ مشیت کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں اور قدرت کی طرف سے ملنے والے دکھوں کو عزم و استقامت سے نبھانے کی قائل ہیں۔اسی حوالے سے ان کی ایک غزل کا مقطع لائقِ التفات ہے۔

جو سکھ ملے وہ شاہدہ رب کی عطا ہوئے

جو دکھ ملے، ہم ان کو نبھاتے چلے گئے

(ص:79)

نورِ خدا کے حوالے سے ان کا نظریہ اور تصور ملاحظہ کریں جو خدائے بزرگ و برتر پر مکمل یقین و اعتماد کی علامت ہے۔ ہر قسم کی عطا اور خوشی کو اسی سے منسوب سمجھتی ہیں۔

دیتا ہے گواہی مرا دل نورِ خدا کی

یہ ایسا دیا ہے کبھی مدہم نہیں ملتا

میں شاہدہ اس در کی گدائی پہ ہوں نازاں

خیرات میں ملتی ہے خوشی، غم نہیں ملتا

(ص:121)

ان کے افکار و تخیلات میں ایک بالیدگی کی فضا پائی جاتی ہے اور ان کا موقف مضبوط و مستحکم ہے جو کبھی تغیر پذیر نہیں ہوتا۔ وہ ہر قسم کے حالات کو مردانہ وار مقابلہ کرتی ہیں۔عزم و حوصلے اور امید کی شمعوں کو ہمیشہ فروزاں رکھتی ہیں۔

مرا خیال تو کوئی بدل نہیں سکتا

جو رائے رکھتی ہوں، بس ایک رائے رکھتی ہوں

ہوا ہو کتنی ہی سرکش فضا ہو یخ بستہ

میں اپنے دل کا الاؤ جلائے رکھتی ہوں

(ص:130)

ان کے ہاں ایک خوداعتمادی کی فضا پائی جاتی ہے۔اس لیے وہ زندگی کے تمام تر امور اپنی ہی صوابدید سے انجام دیتی ہیں۔ اس حوالے سے انہیں کسی خاص مشاورت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

خود اپنے فیصلے کرنے ہیں زندگی میں مجھے
میں زندگی سے نہ پوچھوں گی کیا ارادہ ہے؟

(ص:140)

شاہدہ لطیف کا ادراکِ ذات محققین وناقدین اور قارئین کے لیے خصوصی دلچسپی کا حامل ہے جس میں تصورِ زندگی جوش وولولے اور ہمت واستقامت سے عبارت ہے۔مزید برآں تحقیقی و تنقیدی امکانات کے حوالے سے بہت کچھ پیش رفت ہوسکتی ہے۔

شاہدہ لطیف اور داخلی کیفیات

شعری اظہار کو عمومی طور پر داخلی اور خارجی زمروں سے منسوب کیا جاتا ہے جسے داخلیت اور خارجیت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ایسے تمام جذبات و احساسات جو درونِ ذات سے تعلق رکھتے ہیں، اور حضرتِ دل کے زیرِ اثر بھی ہوتے ہیں اور اسے متاثر بھی کرتے ہیں، داخلی کیفیات سے عبارت ہوتے ہیں۔اس کے برعکس خارجی اظہار خارجیت سے موسوم ہوتا ہے جو خرد کے زیرِ اثر ہوتا ہے اور اسے متاثر بھی کرتا ہے۔داخلی و خارجی اظہار میں توازن کسی غزل یا نظم کی عمدگی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔کسی ایک کی کمی بیشی افراط وتفریط کو جنم دے سکتی ہے۔''شاعراتِ ارض پاک'' کے بسیط تحقیقی وتنقیدی تجارب کی بدولت یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ شعرا کی نسبت شاعرات میں داخلی اظہار کی شرح فزوں تر ہوتی ہے۔جس کا ایک سبب بنتِ حوا کے حوالے سے سماجی جکڑ بندیاں اور اسلامی ومشرقی تہذیبی اقدار وروایات ہیں۔ایک مرد کائنات اور نظامِ کائنات کا مشاہدہ کھلے آسمان کے نیچے کرتا ہے۔اس لیے اس میں خارجی خصائص فزوں تر ہوتے ہیں جبکہ ایک مشرقی عورت دنیا کو کسی روزن یا پردے کی اوٹ سے مشاہدہ کرتی ہے۔اس لیے اس میں داخلی کیفیات فزوں تر ہوتی ہیں۔لیکن عصرِ حاضر میں سوشل میڈیا نے اس مسئلے کو کافی حد تک حل کر دیا ہے اور دنیا ایک گلوبل ویلیج بن گئی ہے۔پھر بھی صنفی مغائرت کے اثرات ابھی تک ضرور پائے جاتے ہیں جو فطری نوعیت کے محسوس ہوتے ہیں۔

عمومی مشاہدے کے اعتبار سے تو شاعرات میں داخلی احساسات فزوں تر ہوتے ہیں لیکن شاہدہ لطیف کے ہاں داخلی وخارجی افکار کے حوالے سے ایک توازن واعتدال کی فضا کارفرما ہے

جس کے اسباب وعلل میں یہ امر مبادی ہے کہ انہیں دنیا کے متعدد مما لک کی سیر و سیاحت کا موقع میسر آیا ہے جس کے باعث ان کے داخلی و خارجی کینوس میں بے پناہ وسعت آئی ہے۔ قبل ازیں کتابِ ھذا یعنی ''شاہدہ لطیف کا تخلیقی ارتقا'' میں ہم ان کی شاعری کے خارجی عوامل کی نسبت سے ایک مبسوط شذرہ رقم کر چکے ہیں جبکہ شذرہ ھذا میں ہم ان کی داخلی کیفیات کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ اسی پس منظر میں ہم ان کے پانچویں شعری مجموعہ ''محبت ہو نہ جائے'' کو زیرِ بحث لائیں گے۔ کتاب ھذا کا نام بھی خود میں ایک داخلی حوالہ رکھتا ہے کیونکہ محبت بھی ایک داخلی جذبہ اور کیفیت کا نام ہے جس کی نمو خارج میں ہوتی ہے۔ مذکورہ مجموعہء کلام کی منتخب غزلیات اور منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ کو بطور استشہادات برائے استخراجات برتیں گے۔ دیگر انتقادی و تجزیاتی تناظرات بھی مباحث کا حصہ ہوں گے۔

محبت ایک داخلی جذبہ اور کیفیت کا نام ہے جس کا مقصد تو مسرت تو تمکنت کا حصول ہوتا ہے مگر انجامِ کار یہ باعثِ اذیت و رسوائی ہوا کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسانی دل کی قدر و قیمت کے کم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سماجی وقار میں کمی بھی قدر و منزلت اور مقام و مرتبے کی پستی کی علامت ہوتی ہے۔ آغازِ محبت میں دل کا معمول خوشی سے مچلنا ہوتا ہے کیونکہ کسی نہ کسی حد تک وصل کی نعمتِ غیر مترقبہ میسر ہوتی ہے مگر مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اس چاہت کو مصیبت بننے کا قوی امکان ہوتا ہے کیونکہ غمِ ہجراں کے مہیب سائے سر پر منڈلا رہے ہوتے ہیں۔ اسی داخلی اظہار و کیفیت کی نمائندگی ان کی غزل کے درج ذیل تین اشعار میں پائی جاتی ہے۔ یہ اشعار بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

کہیں تجھ سے محبت ہو نہ جائے
یہ راحت بھی اذیت ہو نہ جائے

اب ارزانی پہ مائل ہے زمانہ
کہیں کم دل کی قیمت ہو نہ جائے

ابھی تو دل مچلتا ہے خوشی سے

یہی چاہت مصیبت ہو نہ جائے

(ص:27)

شاہدؔہ لطیف کی آمدہ غزل ایک مسلسل غزل ہے جو داخلی کیفیات کے بھرپور حوالے کا درجہ رکھتی ہے جس میں ایک طویل ردیف ''ہیں محبت کی آنکھیں'' کا استخدام کیا گیا ہے۔ اس کو طویل ردیف کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ مصرع کا غالب حصہ ردیف پر مشتمل ہے۔ ردیف ھذا کا فکری مزاج داخلی اظہار سے مملو ہے۔ غزل ھذا بحر متقارب مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

عجب پر اثر ہیں محبت کی آنکھیں
فسوں کا نگر ہیں محبت کی آنکھیں
بہت دور تک دیکھ سکتی ہیں سب کو
مگر بے بصر ہیں محبت کی آنکھیں
طلب کا محل ہیں چمک دار، روشن
وفا کا کھنڈر ہیں محبت کی آنکھیں
ستاروں کی صورت چمکتی ہیں ہر دم
جہاں بھی جدھر ہیں محبت کی آنکھیں
مری چھت ستارے مری آرزو کے
مرے بام و در ہیں محبت کی آنکھیں

(ص:29)

شاہدؔہ لطیف کی ایک اور پوری غزل جو داخلی اظہار و کیفیات کی حامل ہے، جس کی ردیف کا فکری مزاج زمانہ فعل جاری سے علاقہ رکھتا ہے۔ گویا اس غزل میں عہدِ موجود کی کیفیات کو ایک تسلسل کے ساتھ موضوعِ بیان بنایا گیا ہے اور مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہی گئی ہے۔

محبت میں کچھ کچھ اثر ہو رہا ہے

کہ دل اپنا زیر و زبر ہو رہا ہے
قدم میرے رکتے نہیں دو گھڑی بھی
کہ ان کی گلی سے گزر ہو رہا ہے
بڑی دھیرے دھیرے سلگتی ہیں راتیں
سنا ہے یہ سب کچھ ادھر ہو رہا ہے
یہ لگتا ہے اپنی مسافت نہیں ہے
یہ سب ان کی جانب سفر ہو رہا ہے
ہمیں شاہدہ اب سنبھلنا پڑے گا
یہ دل پہ عجب سا اثر ہو رہا ہے

(ص:30)

یہ چاہت بھی ایک طرح کا امتحان ہوا کرتا ہے جس میں محب کی ذات تحلیل نفسی کا شکار ہو کر بکھر جاتی ہے کیونکہ محبوب کی آنکھوں میں وہ شدت وحدت ہوتی ہے جو محب کو جلا اور پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔ جب وعدے وفا نہ ہوں اور خواب درشن سے عاری ہوں تو پھر مجبوراً شہنازِ مرگ کی آغوش میں جانا پڑتا ہے۔ اسی تناظر میں شاہدہ لطیف کی غزل کے تین اشعار جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہیں جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

یہ چاہت بھی عجب سا امتحاں ہے
میں خود میں ہی بکھرتی جا رہی ہوں
تری آنکھوں میں ہے کتنی حرارت؟
میں جلتی اور پگھلتی جا رہی ہوں
ہے تیرا نیند میں ملنے کا وعدہ
بچھا کے خواب مرتی جا رہی ہوں

(ص:31)

آنکھوں میں گھر کرنا جہاں لسانی اعتبار سے ایک محاورہ ہے، وہاں ایک کارِ ہنر بھی ہے۔ محبت میں آنکھوں سے ذریعے دل تک کی مسافت طے کی جاتی ہے اور اسی انداز میں محبت کا عمل طے پاتا ہے۔ محبت کے سربستہ رازوں کی جان کاری بھی جان جوکھوں کا کام ہے۔ جو یہ جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، پھر اسے محبت میں کامیابی کی نوید ملتی ہے۔ خوابوں میں رہنا بھی خیالوں میں سفر کرنے کے مترادف ہوا کرتا ہے۔ انہی داخلی کیفیات کی عکاسی ان کی غزل کے درج ذیل تین اشعار میں پائی جاتی ہے جو مذکورہ بالا بحر و وزن میں ہیں۔

اب اک کارِ ہنر کرنا ہے مجھ کو
تری آنکھوں میں گھر کرنا ہے مجھ کو
تجھی سے پوچھ کر اسمِ محبت
تجھے زیرِ اثر کرنا ہے مجھ کو
ترے خوابوں میں رہنا ہے مسلسل
خیالوں میں سفر کرنا ہے مجھ کو

(ص:33)

دل خواہشوں کی آماجگاہ ہوا کرتا ہے۔ خواہشات کی گنجانی ایک جنگل کے تصور کو جنم دیتی ہے۔ جس پر دل کی حکمرانی ہوتی ہے۔ دل کا کردار دوہری نوعیت کا ہوتا ہے۔ یعنی دل اثر انداز بھی ہوتا ہے اور متاثر بھی ہوتا ہے اور یہی سچے جذبوں کی کہانی قرار پاتی ہے۔ اسی نسبت سے ان کی غزل کا ایک مطلع قابلِ غور ہے جو بحر ہزج مثمن مقبوض میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن'' ہے۔ واضح رہے کہ ''مفاعلن'' مفاعیلن کی مقبوضی حالت ہے۔

خواہشوں کے جنگل میں دل کی حکمرانی ہے
اپنے سچے جذبوں کی صرف یہ کہانی ہے

(ص:37)

اگر محبت اچانک کام آ جائے تو پھر انسان کو اپنی بے چینیوں کا ثمر مل جاتا ہے۔ جنوں کے

جذبوں میں مشیت نے وہ شکتی رکھی ہے جس سے بہت سے کام انجام پاتے ہیں۔اس میں وحشتیں بھی کام آجاتی ہیں۔جن لوگوں کا ظاہر و باطن شفاف آئینے کی طرح ہوتا ہے، وہ لوگ جنسِ صدق و صفا کے امین ہوتے ہیں۔انہی داخلی احساسات و کیفیات کی ترجمانی شاہدہ لطیف نے کچھ یوں کی ہے۔یہ اشعار ع بحر ہزج مثمن سالم میں ہیں جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

اچانک ہی کہیں میری محبت کام آ جائے
تری بے چینیوں کی یہ ریاضت کام آ جائے
بہت سے کام دنیا میں جنوں انجام دیتا ہے
یہ ممکن ہے کہ اب تیری یہ وحشت کام آ جائے
مجھے تو آئینہ سے لوگ بھاتے ہیں ہمیشہ ہی
خبر کیا ہے کہ کب تیری صداقت کام آ جائے

(ص:38)

شاہدہ لطیف کی ایک اور غزل جو تمام تر داخلی کیفیات سے عبارت ہے، جس میں محبت کے حوالے سے مختلف تصورات و نظریات ہیں اور متنوع طریقوں سے محبت کا مفہوم سمجھانے کی سعیِ مشکور کی گئی ہے۔ یہ غزل بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

محبت دو دلوں کا سلسلہ ہے
محبت خود بڑا ہی واقعہ ہے
محبت روح کی تابندگی بھی
محبت کہکشاں کا راستہ ہے
محبت اک سمندر کی طرح ہے
محبت آپ ہی اک معجزہ ہے

محبت شاہدہ ہونے لگی ہے
تو گویا یہ بھی کوئی حادثہ ہے

(ص:40)

مختلف سخنوروں نے محبت کی تعریف اپنے مخصوص انداز اور مزاج کے اعتبار سے کی ہے مگر اس حوالے سے شاہدہ لطیف پیش رفت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کیونکہ ان کی تعریف میں مظاہرِ فطرت کا استخدام بھی ہے، کلاسیکی بہاریہ شاعری کے خصائص بھی ضوفشانی کر رہے ہیں۔ یوں محبت کی تعریف میں شامل فطری رچاؤ کی آمیزش نے اسے مقبولیت و پذیرائی کی سند عطا کر دی ہے۔شعر ھذا بحر ہزج مثمن سالم میں ہے۔

کشش ہے جس میں غنچوں کی مہک ہے جس میں پھولوں کی
سدا رہتا ہے جو دل میں اسے ہم پیار کہتے ہیں

(ص:47)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خوشی ہر کسی کو مطلوب ہوتی ہے مگر شاہدہ لطیف غیر معمولی مزاج و معیار کی مالک ہیں۔ اس لیے انہیں خوشی بھی وقیع و معتبر درکار ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے جذبات واحساس کی گہرائی و گیرائی مثبت اقدار وروایات کے حوالے سے ہے۔اسی پس منظر میں ان کا ایک شعر لائقِ توجہ ہے جو بحر متدارک مثمن سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن'' ہیں۔

ہر کوئی چاہتا ہے جہاں میں خوشی
ہاں مگر ہر خوشی معتبر چاہیے

(ص:49)

اگر کسی شخصیت کی داخلی سچائی کا ادراک مطلوب ہو تو اس کی مظاہرِ فطرت سے وابستگی کا تعین کرنا ہوگا۔اگر اس کی مانوسیت اپنی آخری حد تک پہنچی ہوئی ہے تو اس کی داخلی سچائی کے اعتراف کے حوالے سے کسی نوع کے باک کی کوئی گنجائش روا نہیں رہتی۔شعر ھذا میں شاہدہ لطیف نے اپنی

داخلی سچائی کے اظہار کے لیے مظاہرِ فطرت کا استخدام انتہائی قرینے سے کیا ہے۔اسے ہم ان کی شعوری یا غیر شعوری فطری کاوش قرار دے سکتے ہیں۔اس کے اسباب وعلل میں نسائی جمالیاتی احساس کی کارفرمائی کا رنگ بھی کہہ سکتے ہیں۔اس شعر کی مزید تجزیاتی کاوش ہمیں طولِ بیان کی طرف دھکیلنا چاہتی ہے مگر ہم قاری کی نفاستِ طبع سے اعراض برتنے کی قدرت نہیں رکھتے۔یہ شعر بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے۔اس نوع کی داخلی کیفیت کا بیان صرف شاہدہ لطیف کے سخن کا طرۂ امتیاز ہے۔

میں خوشبو کی دھنک ہوں رنگِ تازہ کی علامت ہوں
مجھے ان تتلیوں کے جگنوؤں کے ساتھ رہنا ہے

(ص:55)

کسی بھی تخلیق کار کا سب سے بڑا کمالِ فن یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر مجسم اشیا کو مجسم اشیا کے طور پر پیش کرتا ہے۔یعنی تجسیم سے عاری عوامل کو مجسم پیکر کے طور پر یہ استعمال کرے۔اسے اعلیٰ سطح کی تخلیقیت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔عصرِ حاضر میں جسے تجریدی آرٹ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔مزید برآں یہ کہ قوتِ ناطقہ سے محروم عناصر کو اذنِ گویائی دے۔فکر وفن کا یہ قرینہ شاہدہ لطیف کے ہاں بھی بخوبی پایا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے بام ودر کے عدم تکلم کا شکوہ کیا ہے۔

خموش رہنے کی عادت ہمیں بھی ہونے لگی
یہ بام و در بھی بہت گفتگو نہیں کرتے

(ص:65)

انہیں داخلی وخارجی اظہار کا بخوبی استحضار رہے۔وہ ہر طرح کے رویوں سے آشنا ہیں۔خیرو شر دونوں طاقتوں کا ادراک رکھتی ہیں۔ان کے ہاں مثبت ومنفی رویوں کا سنگم ایک دلچسپ گنگا جمنی فضا کا غماز ہے۔بحر سریع مثمن مخبون مکسوف میں کہا گیا ان کا یہ شعر جس کا عروضی وزن ''مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن'' ہے، اسی صورت حال کا عکاس ہے۔

کہیں پھول کھل رہے ہیں کسی دامنِ سحر میں

کسی آستینِ شب میں کئی سانپ پل رہے ہیں

(ص:73)

اگر اسلوبیاتی حوالے سے بات کی جائے تو ان کے ہاں ایک لسانی ندرت کارفرما ہے جس میں اختراعی مرکبات کا استخدام خصوصی اہمیت کا حامل ہے جیسے مذکورہ بالا شعر میں آستینِ شب کا نادرالنظیر اختراعی مرکب برتا گیا ہے۔

ان کی فکریات میں خلوص و مروت اور مہر و وفا مرکزی استعارے ہیں جو خود میں بلا کی جاذبیت اور اپنائیت رکھتے ہیں۔ان کا فکری اخلاص فقید المثال ہے اور یہی ان کی فکر کا نکتہء کمال ہے جس سے انحراف حریف و حلیف دونوں کے بس کا یارا نہیں ہے۔اسی نسبت سے ان کی غزل کا ایک مطلع طالبِ التفات ہے۔

ملا جب اتنی دعاؤں سے میرا پیار تمہیں
نہیں ہے ترکِ محبت کا اختیار تمہیں

(ص:75)

داخلی کیفیات کے اظہار کا سب سے معتبر ذریعہ چشم ہوا کرتی ہے جو خود میں راز و نیاز کے معاملات بھی رکھتی ہے اور سربستہ رموز و علائم سے بھی وابستہ ہے مگر کہیں کہیں اس کا انداز انتہائی واضح اور بلیغ ہوا کرتا ہے۔اسی پس منظر میں ان کی غزل کے تین اشعار شاملِ شذرہ ہیں جو اظہار کی متنوع داخلی نوعیت کے حامل ہیں۔ یہ اشعار بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں ہیں جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہیں۔بحر ھذا ایک مرکب بحر ہے۔

راز دل کے یہ آنکھ کہتی ہے
کس روانی سے روز بہتی ہے
ایک آنسو ہے چشمِ حیراں میں
ایک آہٹ سی دل میں رہتی ہے
ایک دریا کہیں سے مڑتا ہے

ایک ندیا سی دل میں بہتی ہے

(ص:86)

داخلیت کا اصل سرچشمہ دل ہے جس سے داخلی اظہار و کیفیات کے تمام تر چشمے پھوٹتے ہیں۔دل حساسیت کے بلند ترین مدارج پر فائز ہے اور اسے سرزمینِ محبت کہلانے کا اعجاز و افتخار بھی حاصل ہے۔خلوص و محبت دل کو سرسبز و شاداب اور ہریالی مزین کرتے ہیں جبکہ نفرتیں اسے طرح طرح کے عوارض سے دوچار کرتی ہیں۔

دل یوں تو سرزمینِ محبت ہے شاہدہ
پڑتا ہے نفرتوں کا اثر بھی کبھی کبھی

(ص:89)

رجائی جذبات و احساسات اور امکانات ہی اصل میں زندگی کرنے کی نوید ہوا کرتے ہیں۔ جب تک آشائیں زندہ رہتی ہیں، تگ و تازِ حیات باقی رہتی ہے۔یہی آرزوئیں ہی انسان کو زندہ رہنے کی شکتی دیتی ہیں۔یوں شریر کا ایک صحت مند تصور اجاگر ہوتا ہے۔زیست کی بقا و ارتقا کا راز اسی میں مضمر ہے۔

کوئی امید تو ہو سرخرو کبھی دل کی
کہیں یہ زندہ امیدوں کا آسرا تو رہے

(ص:99)

شاہدؔہ لطیف کے اظہارِ خلوص میں وہ گہرائی و گیرائی ہے جس کے بیان کے حوالے سے لغاتِ عصر بھی قاصر و عاجز ہیں۔گویا ان کے خلوص کے سامنے سرخم کیے ہوئے ایستادہ الفاظ بھی بے بس ہیں۔ان کے تخلیقی ارتقا کے حوالے سے ہمیں میرتقی میرؔ کے خیالات یاد آ رہے ہیں جو انہوں نے اپنے اعتراف میں کہے تھے،''ہم اقلیمِ سخن کے شہنشاہ ہیں، الفاظ ہمارے باج گزر ہیں جو ہمہ وقت ہمارے روبرو دست بستہ سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں، ہم جنہیں چاہیں شرفِ انتخاب سے نوازیں اور جنہیں چاہیں دھتکار دیں۔'' یہی معاملہ کچھ شاہدؔہ لطیف کا بھی ہے۔بحر

ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ان کا یہ شعر قابلِ غور ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

لغاتِ عصر حاضر ہیں تری توصیف کرنے کو
مصیبت یہ ہے کوئی لفظ پیارا ہی نہیں ملتا

(ص:105)

ان کے سخن میں اکثر خود کلامی کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ ان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں اندازِ تخاطب اپنے محبوب اور اپنے آپ سے بیک وقت محسوس ہوتا ہے۔ یعنی دوہرے پہلوؤں کے حامل ہیں۔ یہی تہ داری اور پہلوداری ان کی وسعتِ فکر کی غمازی کرتی ہے۔ مذکورہ بالا شعر بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

خوشی کے مقابلے میں غم ایک تادیر زندہ رہنے والا جذبہ ہے۔ خوشی کا مفہوم لمحاتی مسرت کی حد تک محدود ہے۔ مشیت نے جس طرح غم کو تاثیرات کی کیفیات سے نوازا ہے اور افتخار بخشا ہے، خوشی جس کا تصور بھی نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ اعزاز خوشی کو ودیعت نہیں ہوا اور جہانِ شعر میں فکری حوالے سے غم کی حیثیت مسلمہ و مصدقہ ہے۔

استادِ فن اور خدائے سخن میر تقی میرؔ کی مقبولیت و پذیرائی کا ایک سبب غم و سوز و گداز بھی ہے۔ اسی طرح شاہدؔہ لطیف نے غم کی نمائندگی ایک عالمگیر جذبے اور حقیقت کے طور پر کی ہے۔ عشق ایک ایسا جذبہ ہے غم جس کا کلیدی استعارہ ہے۔ اس لیے محب حزن و ملال سے ہم آغوش رہتا ہے کیونکہ اسے محبوب کی چشمِ روح افزا میں جذب کا عالم دکھائی نہیں دیتا مگر ان تمام تر کیفیات کے باوجود شاہدؔہ لطیف قدرت سے شاکی و نالاں دکھائی نہیں دیتیں کیونکہ انہیں خدا کی ذات پر مکمل اعتماد ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ اس کے در کی گدائی سے صرف خوشی ملتی ہے، غم نہیں ملتا۔

وہ کون سا دل ہے کہ جسے غم نہیں ملا
کس شخص کو اندوہ کا موسم نہیں ملتا
ہونٹوں پہ تو رہتے ہیں ترے پیار کے نغمے

آنکھوں میں ترے جذب کا عالم نہیں ملتا
میں شاہدہ اس در کی گدائی پہ ہوں نازاں
خیرات میں ملتی ہے خوشی، غم نہیں ملتا

(ص:121)

وفا ایک داخلی جذبہ ہے جس کی نمو خارج میں ہوتی ہے۔ داخلیت و خارجیت کا تال میل اس کی جدت پذیری کا مظہر ہے۔ اسے یوسفِ شہرِ تمنا کے دوہرے اور اختراعی مرکبِ اضافی سے نواز کر شاہدہ لطیف نے اسے مزید مقبول اور ہر دل عزیز بنا دیا ہے مگر اہلِ عصر میں اس کی بے توقیری ظاہر کر کے اسے سوز و گداز سے ہم آغوش کر دیا ہے۔ مزید برآں دام لگانے کے محاورے نے بھی اسے بے مائیگی کے احساس سے دوچار کر دیا ہے۔ اسی حوالے سے ان کا یہ شعر انتہائی قابلِ توجہ ہے۔ شعر ھذا بحر رمل مثمن محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔ واضح رہے کہ ''فاعلن'' فاعلاتن کی محذوفی حالت ہے۔

یوسفِ شہرِ تمنا ہے تو اے حرفِ دعا
دہر والوں نے ترے دام لگائے کیا کیا

(ص:125)

حسن و جمال کا ہوس پرستی کی نذر ہونا صباحت کے لیے کوئی نیک شگون نہیں ہے جسے اہلِ جہاں کی نفس پرستی اور بے حسی بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بقول راقم:

ہوس نے بنائی ہیں سب داستانیں
اسی راہ میں لوگ پاگل ہوئے ہیں

یہ اہلِ زمانہ کی ہوس پرستی، خود غرضی اور مطلب پرستی کا ایک رویہ ہے جسے اہلِ حسن کے زوال کی دلیل بھی کہا جا سکتا ہے۔ حسن جو ایک لطیف تلازمہ ہے، اس کی بے توقیری یقیناً ایک قابلِ افسوس امر ہے۔ اسی داخلی و خارجی کیفیت کا اظہار انھوں نے کچھ یوں کیا ہے۔ ہوس پرست اندھیروں کا فکری تلازمہ یقیناً نادر العظیر ہے۔

ہوس پرست اندھیروں نے اس کو گھیر لیا
افق پہ جب بھی کسی کا مہِ جمال آیا

(ص:135)

سنہری خواہشوں کی قید سے عدم رہائی اور ان آرزوؤں کی آباد کاری کا حوالہ یقیناً داخلی کیفیات کے بیان کی عمدگی کا مظہر ہے اور پھر ان سے دل کی حسرت وتمکنت کا وابستہ ہونا یقیناً ان کی فکری جاذبیت کا ایک پہلو ہے۔خواہشات کے ساتھ قید کا استعارہ پرسوز کیفیت کا حاصل ہے۔ اسی پس منظر میں ان کا یہ شعر دیکھیں جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے،جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

رہا کرنا نہیں ان کو انہیں آباد رکھنا ہے
سنہری خواہشوں کی قید میں دل شاد رکھنا ہے

(ص:135)

رومانوی شاعری میں تصورِ محبوب کے بغیر بہار کا کوئی تصور نہیں ہے۔اسی داخلی ورومانوی کیفیت کو انہوں نے یوں پیش کیا ہے۔اس طرح انہوں نے سہلِ ممتنع کے اسلوب کو فروغ دے کر سہل نگاری کی روایت کو تقویت بخشی ہے۔

نہیں ہو تم کوئی منظر ِ بہار نہیں
ہزار گل ہوں معطر، اگر تمہارے سوا

(ص:139)

شذرہ ھذا میں شامل استشہادات اور تصریحات واستخراجات شاہدہؔ لطیف کی داخلی کیفیات کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہیں۔طولِ بیاں کا خوف مانع تھا اور ہم نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی سعی کی ہے۔یوں ہم نے قاری کی نفاستِ طبع کو ملحوظِ خاطر رکھا۔البتہ ہم یہ بڑے اعتماد ویقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ تصریحات کی روشنی میں نہ صرف ان کی داخلی کیفیات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے بلکہ بخوبی حظ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔مزید برآں یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی داخلی کیفیات کا

کینوس کس قدر وسعت آمیز اور فصیح وبلیغ ہے۔قارئین ومحققین وناقدین کے لیے ان کی داخلی کیفیات کا تجزیاتی مطالعہ خالی از افادہ نہیں ہوگا بلکہ حیرت واستعجاب کی نئی منازل کی طرف پیش رفت ہوگی۔

شاہدہ لطیف کا فروغِ مقصدیت

دنیائے شعروادب میں لایعنیت کے فروغ نے مقصدیت کی اہمیت کو بڑی شدت وحدت سے اجاگر کیا ہے۔ یوں اس کی اہمیت وفوقیت دوبالا ہوگئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارا قاری یہ محسوس کر رہا ہو اور یہ سوال بھی کر رہا ہو کہ لایعنیت نے مقصدیت کی اہمیت کو کس طرح فزوں تر کردیا ہے۔ اس صورتِ حال کو بہ آسانی بذریعہ امثال ودلائل سمجھایا جاسکتا ہے۔جس کی مثال کچھ یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ آپ کسی سخنور کا کوئی مجموعہء کلام ملاحظہ کرتے ہیں جو فکری وفنی کسی بھی حوالے سے آپ کو مطمئن نہیں کر پاتا، جس کے لسانی ادراکات اپنے موقف کو باور کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو وہ مجموعہءشعر ماسوائے فکری بیزاری کے آپ کو کچھ بھی نہیں دے پاتا۔ یوں آپ کا اکتسابِ فیض کرنے کا خواب تشنہءتعبیر رہ جاتا ہے۔جس سے ثابت ہوا کہ اس سخن ساز کی لایعنیت نے مقصدیت کی اہمیت کو اجاگر کردیا ہے۔ مذکورہ بالا معاملہ معاصر ادبیات کا بھی ہے جو بڑی شدت سے لایعنیت کا شکار ہے اور مقصدیت کی اہمیت روز افزوں ہورہی ہے۔ معاصر شعریات میں نہ فنی پختگی ہے نہ فکری بالیدگی ہے یعنی فکری وفنی اور لسانی خصائص کا شدید فقدان ہے۔علمِ عروض کی جانکاری سے اہلِ سخن گریزاں ہیں۔ بحروونزن کا ادراک یکسر مفقود ہے اور اسے اپنے لیے ایک دردِسر خیال کرتے ہیں جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عہدِ موجود کے تخلیق کار نے محنت و ریاضت، خلوص اور لگن کا دامن چھوڑ دیا ہے۔ بقول راقم اس کا موقف یہی ہے۔

عصرِ حاضر کے سخنور کا یہی مقصود ہے

ہو سخن میرا مسجع ندرتِ الہام سے

یہی وجہ ہے کہ ناکامی و نامرادی کی اس سے ہم آغوش ہونے کے لیے مضطرب ہے۔ جب ایسے حالات ہوں تو پھر سخن اور اہلِ سخن کا کیا مستقبل ہوگا؟ ارتقا و ارتقا کی کیا ضمانت ہوگی؟

خدائے بزرگ و برتر کا شاہدہ لطیف پر اپنا خصوصی لطف و کرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سخن لایعنیت سے گریزاں محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک مقصدیت کا دائرہ کار بسیط و عریض ہے جس کا تعین کرنا کارِ فرہاد تو کیا بلکہ ناممکنات کا حصہ ہے۔ جمہوری نظریۂ تنقید کے مطابق ہر موضوع میں مقصدیت کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود ہوتا ہے۔ ہم اس حوالے سے بہت سخت گیر واقع ہوئے ہیں کیونکہ ہم کسی بھی موضوع کو حقیر و ناچیز خیال نہیں کرتے بلکہ اس کی خاص اہمیت جو اس کی مقصدیت سے عبارت ہوتی ہے، کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ مقصدیت کا تعین کارِ دشوار ہے البتہ اس کے کچھ کلیدی فکری و فنی خصائص کا تعین بطریقِ احسن کیا جا سکتا ہے۔ جن میں معقولیت و منطقیت اور معروضیت و مصلحت شامل ہیں۔ گویا یہ چار فکری تلازمات جسے آپ عناصرِ اربعہ کا نام بھی دے سکتے ہیں، مقصدیت کی اساس ہیں۔

شاہدہ لطیف کے سخن میں شعوری و لاشعوری اور فطری طور پر لایعنیت سے گریز کا پہلو پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام بھرپور مقصدیت کا حامل ہے۔ اس لیے شذرہ ھذا میں ہم ان کے فروغِ مقصدیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کے اولیں مجموعۂ کلام ''معجزہ'' مطبوعہ فروری 1999ء کی منتخب غزلیات اور منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ بطور استشہادات برائے استخراجات لائیں گے۔ پائینِ شذرہ آپ یہ بخوبی جان پائیں گے کہ اگر ان کے اولین شعری مجموعہ میں اس قدر فروغِ مقصدیت کا پہلو ہے تو دیگر مجموعہ ہائے سخن میں مقصدیت پسندی کا کیا عالم ہوگا۔ بقولِ شاعر:

؎ نقشِ اول دیکھ آئے نقشِ ثانی دیکھنا

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر موضوع کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ گویا فکر کا ہر پہلو مقصدیت آشنا ہے۔ وہ مقصدیت رومانوی بھی ہوسکتی ہے اور معاشرتی و معاشی بھی ہوسکتی ہے۔

اس کا تعلق تفننِ طبع سے بھی ہو سکتا ہے۔ الغرض مقصدیت صرف چند ایک خاص موضوعات سے وابستہ نہیں ہے بلکہ اس کے دائرہ کار کا تعین ناممکنات کا حصہ ہے۔

راہِ محبت میں دل کی قربانی سے بڑھ کر کوئی قربانی نہیں ہو سکتی۔ جب چاند جیسا دل محبوب کے قدموں میں ڈال دیا تو پھر آسمان سے تارے توڑ ڈالنا بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس طرح بناؤ سنگھار کرنا کہ حقیقی پہچان معدوم ہو جائے، کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہاں یہ امر انتہائی واضح ہے کہ قدرتی حسن کو بالا دستی حاصل ہے۔ مصنوعی تزئین و آرائش اور زیب و زیبائش محض تکلفات کا حصہ ہے اور لایعنیت کی طرف ایک پیش رفت ہے جو مقصدیت کو فراموش کرنے کے مترادف ہے۔ شاہدہ لطیف کے ہاں تشبیہات کا استخدام فطری نوعیت کا ہے جس کے باعث ان کے کلام کی مقبولیت و پذیرائی دوبالا ہوتی ہے۔

سجا کے رکھ تو دیا دل سا چاند قدموں میں
اب آسمان سے تارے بھی توڑ لاؤں کیا؟
حضورِ آئینہ پہچان میری جاتی رہے
میں خود کو شاہدہ اس درجہ بھی سجاؤں کیا؟

(ص:24)

ان کے ہاں جمالیاتی اقدار کے واحیا کے حوالے سے ایک سعیِ مشکور کا رنگ پایا جاتا ہے۔ کلاسیکی بہاریہ شاعری کے خصائص بامِ عروج پر پہنچے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں نسائی طرزِ احساس کی بھی ضیا پاشیاں کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جس کی عمدہ مثال فضا میں آنچل لہرانے سے بھی دی جا سکتی ہے۔ جمالیاتی احساس کی ہمہ گیری ان کی فکر کا نکتہء کمال ہے۔

میرا آنچل فضا میں لہرایا
موسمِ گل تمام شرمایا
ہر طرف شاہدہ منادی ہے
پھول خوشبو میں کس کو بھر لایا؟

(ص:26)

محبوب احساسِ جمال کا بھرپور حوالہ ہوا کرتا ہے۔جس سے منسوب ہونے کے بعد محب بھی جمالیاتی احساس سے ہم آغوش ہوجاتا ہے۔محبوب کے رستوں کا پھول بننا اور خود کو صبا تسلیم کرنا، یہ سب جمالیاتی احساس کے حوالے ہیں اور جمالیات کو مقصدیت میں روحِ رواں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

تیرے لیے ہی رستوں کے ہم پھول بن گئے
تیرے لیے ہی خود کو صبا مانتے ہیں ہم

(ص:29)

جلووں کی بھیک، حسن کی خیرات اور طلبِ ذات یہ سب رومان کے روح پرور تلازمات ہیں۔ضرورت ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جو سنگدل محبوب کو بھی مائل بہ کرم کر دیتی ہے۔ بوقتِ ضرورت وہ بھی خلوص ومروت کا استعارہ بن جاتا ہے۔محبوب کی یہ شفقتِ بے بہا اس کی مفاد پرستی اور خود غرضی سے مربوط ہوتی ہے۔ انسان کو خدا کی ذات پر کامل یقین ہونا چاہیے اور یہ گمان بھی نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی دعا بارآور نہیں ہوتی۔اس لیے انسان کو دن رات محوِ مناجات رہنا چاہیے۔

جلووں کی بھیک حسن کی خیرات چاہیے
یہ کیا کہا کہ تجھ میری ذات چاہیے
اب تو کچھ ایسی صورتِ حالات چاہیے
وہ بھی کہیں ہمیں تو تیرا ساتھ چاہیے
ممکن نہیں کہ کوئی دعا بار ور نہ ہو
دن رات صرف اس سے مناجات چاہیے

مقصدیت سے عاری اعمال و افعال کی کوئی قدر ومنزلت نہیں ہوا کرتی۔اس لیے جادۂ منزل پر گامزن رہنے کے لیے منزلوں اور رابطوں کا تعین بھی ناگزیر ہے۔ بے سود تجگے بے ثمر ہوا کرتے ہیں۔اس لیے غور وخوض کا عمل بہت ضروری ہے اور خوابِ غفلت میں پڑے رہنا بھی کوئی

نیک شگون نہیں ہے۔اس لیے کچھ رتجگوں کی گنجائش رکھنا بھی انتہائی اہم ہے۔بحر رمل مثمن محذوف میں کہے گئے ان کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جن کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

بے طلب ہی بھاگتے رہنا کوئی اچھا نہیں
منزلیں سوچا کرو کچھ رابطے رکھا کرو
عمر بھر کا جاگنا پھر دیکھنا اور سوچنا
نیند کے دریا میں تھوڑے رتجگے رکھا کرو

(ص:33)

انسان کی ذات میں موجود اپنے مقصد کے لیے یکسوئی اسے کامیابی وکامرانی سے نوازنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔جو لوگ اپنی ذات میں خود کفیل اور پر اعتماد ہوتے ہیں،فتح و نصرت بھی ان کے قدم چومتی ہے۔حب الوطنی عظیم لوگوں کی پہچان کا استعارہ ہوا کرتی ہے کیونکہ وہ اپنے وطنِ مالوف کو اپنی جان اور روح سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایک جنگل ہے میرے حدِ نظر
ہے ہدف اور مچان بھی اپنی
نغمہ زن ہوں میں اپنی ہی دھن میں
لے بھی اپنی ہے تان بھی اپنی
اس وطن پر نثار تن من دھن
روح اپنی ہے جان بھی اپنی

(ص:36)

صداقت کی مقصدیت ہر عہد میں مسلم رہی ہے۔سچ کی پاسداری انبیاء و اولیاء کا شیوہ رہا ہے۔جب ہر طرف جھوٹ کا بول بالا ہو،پھر سچ کی لو میں جگمگاتے آئینے اچھے لگتے ہیں۔مندرجہ ذیل شعر بحر رمل مثمن محذوف میں ہے۔

جھوٹ کے ایوان میں مثلِ پیمبر روبرو
سچ کی لو میں جگمگاتے آئینے اچھے لگے

(ص:37)

جب ہرطرف خواہشوں کی خریدوفروخت کا چلن عام ہو پھر صاحب عزت اور صاحبِ دستار ارباب بےبس ومجبور ہوجاتے ہیں۔ کچھ بھی ان کے اختیار میں نہیں رہتا۔ اظہار پر پابندیوں کے باعث قلم پر جب سخت پہرے ہوں اور زبانوں پر مہریں ہوں، پھر رسوائیوں کا خوف بھی لاحق ہوتا ہے، ایسی صورتِ حال میں اظہار کے دائرہ اختیار میں کچھ نہیں رہتا۔ گھر میں اگر امن وسکوں کی فراوانی ہوتو اس کی تشبیہہ جنت سے دی جاتی ہے۔ پھر گھر کے مکینوں میں بھی اس گھر کے لیے قربانی دینے کا جذبہ بھی موجود ہوتا ہے۔ جب صورتِ حال اس کے برعکس ہوتو پھر قربانی کا جذبہ بھی مفقود ہو جاتا ہے۔ انہی عصری رویوں کے تناظر میں شاہدہ لطیف کی غزل کے تین اشعار نذرِ قارئین ہیں جن میں مقصدیت کا پہلو نمایاں ہے۔

بلکنے لگی ہیں خواہشیں اب جابجا یہاں
عزت مآب کیا کرے، دستار کیا کرے؟
پہرہ قلم پہ ہے تو زباں پہ لگی ہے مہر
رسوائیوں کے خوف میں اظہار کیا کرے؟
جس گھر میں ایک لمحہ سکوں کا نہ مل سے
اس گھر کے واسطے کوئی ایثار کیا کرے؟

(ص:41)

تمام اہلِ سخن نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں زندگی کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس سلسلے میں شاہدہ لطیف زیادہ وقیع اور معتبر ٹھہری ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اساتذۂ فن سے بھرپور اکتسابِ فیض کیا ہے۔ اس لیے وہ حصولِ دولتِ افکار کو ایک ہنر گردانتی ہیں۔ اسے اپنا اثاثہ تسلیم کرتی ہیں کیونکہ ان کے علاوہ ان کے پاس دنیا کی کوئی پونجی نہیں ہے۔

نئی سحر میں صبا کا پیام سن لیجئے
عمل ہے زیست کا اک سلسلہ کچھ اور نہیں
حصولِ دولتِ افکار شاہدؔہ ہے ہنر
یہی اثاثہ ہے سب کچھ مرا ، کچھ اور نہیں

شاہدؔہ لطیف کے فکر وفن کا نکتہء کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سخن میں مظاہرِ فطرت کے پیوند کاری زبردست قرینے سے کی ہے اور یہی ان کے سخن کی مقبولیت و پذیرائی کا ایک راز بھی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ان کا کلام فری رچاؤ کا حامل ہے اور سراپا آمد محسوس ہوتا ہے جس میں نہ تصنع ہے نہ تکلف، بلکہ بے ساختگی و بے تکلفی ہے۔

حضرتِ دل محبوب کے درشن کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ اس حوالے سے وہ مختلف جواز اختیار کرتا ہے جن کا مقصد صرف اور صرف وصلِ محبوب ہوتا ہے۔ جب کسی کو کسی سے عشق ہو جائے تو پھر طرح طرح کے افسانے بھی جنم لیا کرتے ہیں۔ پھر کوئی راز راز ہی نہیں رہتا۔ معاملاتِ شوق کا مذکور زبان زدِ عام ہو جاتا ہے۔

تجھ سے ملنے کے کرے دل یہ بہانے کیا کیا؟
عشق ہو جائے تو بنتے ہیں فسانے کیا کیا ؟
اک وہی راز مرے دل میں نہ ٹھہرا پل بھر
اک وہی بات لگی سب کو سنانے کیا کیا ؟

(ص:46)

ہر شخص کا کوئی نہ کوئی مثبت حوالہ ہوا کرتا ہے اور یہ حوالہ ضروری نہیں کہ عالمگیر یا ملک گیر نوعیت کا ہو بلکہ یہ ایک مقامی حوالہ بھی ہوسکتا ہے جسے بنانے کے لیے طویل عرصہ کی تگ و دو شامل ہوتی ہے۔ اس لیے یہ حوالہ انسان کو عزیز از جان ہوتا ہے۔ اگر کچھ حوالے کو نقصان پہنچے یا اسے کھونے کا اندیشہ ہو، تو پھر انسان اپنے آپ کو کوستا ہے۔ حوالے کی بقا میں بھی مقصدیت کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اسی فکر کی ترجمانی ذرا شاہدؔہ لطیف کی زبانی ملاحظہ کریں۔

حوالہ مجھ سے مرا کھو گیا ہے
نجانے کیا مجھے اب ہو گیا ہے ؟

(ص:57)

تلاشِ حقیقت ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے جس میں انسان کو دیوانہ وار سرگرداں رہنا پڑتا ہے اوراس حوالے سے سماج کے مختلف استفسارات بھی ہوتے ہیں۔انسانی فطرت ہمیشہ مثالی دنیا کی خواہاں ہوتی ہے جسے نئ دنیا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔حالانکہ اس کا تصور بہت قدیم ہے۔اس نئ دنیا میں زمین وآسماں نئے خیال کیے جاتے ہیں۔اس لیےاس جہانِ نوکوجنتِ ارضی کا نام بھی دیا جاتا ہے۔جس کے قیام کے لیے انسان کوعمر بھرمحوِ تگ وتاز رہنا پڑتا ہے۔بحرمتقارب مثمن سالم میں کہے گئے یہ دواشعاراسی پس منظر میں ہیں جن کا عروضی وزن''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

تلاشِ حقیقت میں نکلے تھے گھر سے
کوئی ہم سے پوچھے کہ کیا ڈھونڈتے ہیں
نیا اک جہاں شاہدؔہ ہم بنائیں
ہم اپنے ہی ارض و سما ڈھونڈتے ہیں

(ص:52)

اسی فکری تسلسل کی حامل ان کی ایک اورغزل کے چاراشعار جوبحرہزج مثمن سالم میں ہیں، نذرِقارئین ہیں جن کے عروضی ارکان''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔ان اشعار میں عزم وحوصلے اوراعتماد کے پہلو بہ پہلومقصدیت کوانتہائی بلیغ انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

ہمیں کیا سوچنا ہے بے ہنرلوگوں کے بارے میں
مکیں اپنا جو ہو گا تو مکاں اپنا بنائیں گے
ہمیں حاصل ہے یہ قدرت جسے اورجس جگہ چاہیں
وہاں اپنا بنائیں گے یہاں اپنا بنائیں گے
ہمارے گھر کے لوگوں کو نجانے کب خبر ہو گئ؟

کہ کیا اپنا بنائیں گے کہاں اپنا بنائیں گے؟
ہماری سوچ اپنی ہے قلم بھی شاہدؔہ اپنا
ہم اپنی بات لکھیں گے بیاں اپنا بنائیں گے

(ص:56)

حق و باطل کی پہچان ہر کسی کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔ جس نے حق و باطل کا عرفان حاصل کرلیا، وہ طاغوتی طاقتوں کے استبدادی ہتھکنڈوں سے محفوظ و مامون رہا۔ اسی حوالے سے ان کی غزل کا ایک شعر نذرِ قارئین ہے جو بحرِ اوفر مربع سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن'' ہیں۔

مجبوری کی آڑ میں لوگو
اک شیطان کھلا رہتا ہے

(ص:58)

اہلِ حق ہمیشہ اپنے عہد کی ظلمتوں کے خلاف ہوتے ہیں اور تا حیات وہ اپنے حصے کی روشنی کرتے رہتے ہیں۔ اپنے حصے کا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔ یہی معاملہ کچھ شاہدؔہ لطیف کا بھی ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں ان کا ایک شعر دیکھیے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

اندھیروں سے مری بس دشمنی ہے
دیا تو رات بھر جلتا رہے گا

(ص:59)

کسی بھی تخلیق کار کا عرفانِ ذات اس کے تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے جن میں کچھ افکار تعلیاتی تاثر کے بھی حامل ہوتے ہیں جو عصری رویوں کی آمیزش سے مربوط ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں سخنور کے حوالے سے اہلِ جہاں کا خراجِ تحسین کا تاثر بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔

انمول تھے ہم پھر بھی خریدار بہت تھے
ہم ایسے جو ہوتے تو یہ بازار بہت تھے
آتے ہیں جو ہر روز نیا روپ بدل کر
ان چہروں سے ہم پہلے ہی بیزار بہت تھے
تم کہتے ہو تم سب سے جدا سب سے الگ ہو
اے دوست ہمارے بھی طلب گار بہت تھے

(ص:60)

ایک سچے اور کھرے اہلِ قلم کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے آشوب کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور اس کے مداوے کے لیے کوشاں بھی رہتا ہے۔ وہ منفی رویوں اور کرداروں کو بے نقاب بھی کرتا ہے نیز مسائل کے حل کے لیے تدابیر بھی کرتا ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ان کی غزل کے دو شعر اس حوالے سے لائقِ توجہ ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

نجانے روشنی ہے لاپتہ کیوں؟
مقدر کا ستارہ سو گیا ہے
نجانے کھیت کیسا زہر اگلیں؟
کوئی ظلمت کی فصلیں بو گیا ہے

(ص:65)

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں تاحیات زندگی کرنے کا ہنر نہیں آتا اور نہ وہ اپنی اس نااہلی کا کبھی اعتراف کر پاتے ہیں۔ اس طبقے کی نمائندگی انہوں نے کچھ یوں کی ہے۔

ہمیں تو زندگی بھر، زندگی کرنا نہیں آئی
یہ قصہ اور لوگوں کو سنانا ہی نہیں آیا

(ص:66)

شاہدہ لطیف سماج کے مفلوک الحال طبقے سے محبت کرتی ہیں اور ان کی نمائندگی کرنا اپنے لیے باعثِ اعزاز سمجھتی ہیں کیونکہ وہ معاشرے کو اپنے اوپر اوڑھ کر لکھتی ہیں۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا مطلع لائقِ توجہ ہے جو اس پس منظر کا حامل ہے۔

غمِ تشنہ دہانی کہتے کہتے
مرے ہم پانی کہتے کہتے

(ص:67)

بسا اوقات زندگی میں انقلابی تغیرات رونما ہوتے ہیں جو انسان کو ورطہء حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر معاملہ کایا پلٹنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اگر زیست عزم و حوصلے سے عبارت ہو تو پھر جیون میں کچھ بھی ناممکن نہیں رہتا بلکہ ناممکنات کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ جیسے ایک انگریزی مقولہ ہے:

Word impossible is in the dictionary of fool.

یعنی ناممکن کا لفظ بے وقوف لوگوں کی لغت میں ہے۔ اگر سوچ کے جذبے ثمر آور ہوں تو پھر الفاظ کی تاثیر بھی بدل جایا کرتی ہے۔

خواب جاگے ہیں تو تعبیر بدل ڈالی ہے
رنگ بھرتے ہوئے تصویر بدل ڈالی ہے
جن سے کترا کے گزر جائیں گلابی لمحے
ہم نے وہ صورتِ دل گیر بدل ڈالی ہے
یہ مرے سوچ کے جذبوں کا ثمر ہے شاید
لب پہ اترے ہیں تو تاثیر بدل ڈالی ہے

(ص:68)

جو لوگ عمیق حسیات کے حامل ہوتے ہیں وہ ظاہر پر یقین رکھنے کی بجائے باطن کو زیادہ معتبر خیال کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک باطن حقیقت کے زیادہ قریب تر ہوتا ہے۔ اسی

مقصدیت کی آبیاری شاہدہ لطیف نے کچھ یوں کی ہے۔

کسی کے شوق کی زنجیر پر نہیں جانا
سجی ہوئی کسی تصویر پر نہیں جانا
ہمیشہ نیتِ انسان پر نظر رکھنا
کسی لکھی ہوئی تحریر پر نہیں جانا
ستائشِ در و دیوار تو ضروری ہے
مگر نمائشِ تعمیر پر نہیں جانا

(ص:69)

مذکورہ بالا فکری تسلسل کا احیا انہوں نے مختلف النوع طریقہ ہائے بیان سے کیا ہے۔ ان کی مقصدیت پسندی انسان دوستی کے اعلیٰ ترین شواہد پیش کرتی ہے۔

دامن میں دیا چھپا کے رکھنا
سب کی نظریں بچا کے رکھنا
اپنا یہ طرزِ دوستی ہے
دشمن سے بھی بنا کے رکھنا

(ص:72)

مفلوک الحال طبقے کی نمائندگی ان کے سخن کا طرۂ امتیاز ہے جس سے انسانیت کے جذبوں کو نمو میسر آتی ہے اور تاثیرات کی کیفیات فزوں تر ہوتی ہیں اور یوں مقصدیت کی ایک بلیغ صورت جنم لیتی ہے اور بیان کا نکھرا ہوا تصور سامنے آتا ہے۔

کسی مجروح کی آواز اگر آتی ہے
شور گریہ کا کہیں دور تلک اٹھتا ہے

(ص:75)

شاہدہ لطیف کے ہاں مقصدیت کا اعلیٰ وارفع ادراک پیش بندی کی صورت میں بھی جلوہ

ریز نظر آتا ہے اور اکثر اوقات پیش گوئی حرف بہ حرف عین حقیقت کے عالم میں آغوش کشا نظر آتی ہے۔

یقیں ہے شاہدہ آئے گا کوئی اپنے وعدے پر
نشاں جب صفحہء ہستی سے اپنا مٹ چکا ہو گا

(ص:76)

شاعری میں عمل اور ردعمل کا بیان ایک معنی خیز حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ پھر عمل اور ردعمل میں ایک فطری تعلق کو ظاہر کرنا بھی کمالِ فکر وفن سے مملو ہے۔ یوں قاری بسا اوقات ان دیکھی دنیاؤں کی سیر و سیاحت سے بھی وابستہ ہو جاتا ہے جہاں پل پل نئے انکشافات وقوع پذیر ہوتے ہیں جو خود میں اک معماتی سماں بھی رکھتے ہیں۔ بحر ہزج مثمن سالم میں ان کی غزل کے تین اشعار ہمارے تجزیاتی عمل کا حصہ ہیں جن کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

سمندر روٹھ جائیں تو کنارے روٹھ جاتے ہیں
گھرے جو ناؤ طوفاں میں ستارے روٹھ جاتے ہیں
مجھے ذروں سے گھر اپنا بنانا تک نہیں آیا
میں اپنے آنکھ کھولوں تو ستارے ڈوب جاتے ہیں
کسی جنگل کو پانی سے بھلا ڈر کیا رہا ہو گا
کہ شہروں کے سبھی باسی ہمارے ڈوب جاتے ہیں

(ص:77)

بے شک انسان اپنے رب کا بہت بڑا ناشکرا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ کسی بھی حال میں قناعت نہیں کرتی۔ جب چاہتیں بحرِ بے کراں کی صورت ہوتی ہیں تو انسان چاہتا ہے کہ اس سمندر کا بھی کوئی کنارا ہو، جب صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو خواہش بھی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں ان کا یہ شعر اسی تناظر میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہیں۔ یہ ایک مرکب بحر ہے۔

بیکراں چاہتوں میں خواہش ہے
اس سمندر کا بھی کنارا ہو

(ص:78)

شاہدہ لطیف کا کرداراصول وضوابط اورقواعد سے عبارت ہے جس سے ان کے افکار کی مقصدیت واضح ہوتی ہے۔صداقت کو وہ وقیع اور معتبر نہ صرف خیال کرتی ہیں بلکہ اسے باور بھی کراتی ہیں۔

ہم نے کردار کا رستہ مقرر کر لیا
سچ نے بھی آخر کبھی اپنا اثر کرنا تو ہے

(ص:82)

ان کی ایک پوری غزل جومقصدیت سے معمور ہے بدونِ تبصرہ نذرِقارئین ہے۔دیدہ باید کہ قارئین اس کے حوالے سے کیارائے قائم کرتے ہیں؟

پھرتے ہیں چاک چاک جو داماں کیے ہوئے
دل اس قدر نہ رکھتے تھے ارزاں کیے ہوئے
بس انتظار صبح کی پہلی کرن کا تھا
ہم چل پڑے ہیں دل کو چراغاں کیے ہوئے
لوٹیں گے کب وہ جن کے لیے خاک ہم ہوئے
ہر دن کو اپنے شامِ غریباں کیے ہوئے
جو قافلے چلے تھے پہاڑوں کی اوٹ سے
بڑھتے رہے زمانے کو حیراں کیے ہوئے
اس تیرگی میں شاہدہ دم گھٹ کے رہ گیا
آئیں وہ روشنی سرِ مژگاں کیے ہوئے

(ص:83)

شاہدہ لطیف کے سخن میں باریک بینی، تیز قوتِ مشاہدہ اور تجزیاتی اندازِ فکر پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں جزوی وکلی ہر طرح کا موقف پایا جاتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طرزِ فکر ان کے کلام کی مقصدیت سے مربوط ہے۔ حزن وطرب کے حوالے اپنی پوری آن بان سے ملتے ہیں۔ فطری اور بہاریہ تلازمات ان کے سخن کا طرۂ امتیاز ہے۔ اپنائیت اور جاذبیت کے خصائص ان کی شاعری کی دلپذیری میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ گویا وہ اپنے موقف کو باور کرانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔

پھر بھی کمی سی ہے کوئی ورنہ تو اک نگاہ میں
لوگ بھی بے مثال ہیں شہر بھی لاجواب ہے
رخصتِ گل کی یہ فضا ، تشنہ سی ، سوگوار سی
اس پر خزاں کی ہے نظر تازہ جو اک گلاب ہے
تجھ کو پڑھا ہے شوق سے، تجھ کو لکھا ہے ذوق سے
تو ہی سخن کی آبرو، تو ہی مری کتاب ہے

(ص:85)

عاجزی وانکساری حقیقی تخلیق کاروں کا شعار ہوا کرتی ہے۔ یہی آدرش ان کا اپنے قارئین کے لیے بھی ہوا کرتا ہے۔ ہمت وحوصلہ اور جرات واستقامت ان کی سرشت میں ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ حق وصداقت اور صدق وصفا کی پاسداری کرتے ہیں جسے وہ اپنی پہچان خیال کرتے ہیں۔ جس پر انہیں اعزاز وافتخار بھی حاصل ہوتا ہے۔

مت کر خود پہ مان بہت
تو دریا، طوفان بہت
سچ کا ساتھ نبھاتے ہیں
اپنی یہ پہچان بہت

(ص:89)

انہیں عالمِ آب و گل کی ہر شئے کی بے ثباتی کا یقین ہے۔ دنیا کی ہر چیز انجامِ کار زوال آمادہ ہوتی ہے۔ یہی معاملہ حسن و صباحت کا بھی ہے۔ جب انسان غم و آلام کی چکی میں پستا ہے تو اسے اہلِ مسرت و تمکنت فرخندہ نصیب محسوس ہوتے ہیں۔ اسی تاثر کے حامل ان کی غزل کے دو اشعار قابلِ توجہ ہیں جو بحر سریع مثمن مخبون مکسوف میں ہیں۔ اس بحر کا عروضی وزن "مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن" ہے۔ یہ ایک مرکب مزاحف بحر ہے جو اردو میں اولاً تو غیر مستعمل تھی مگر اب کم مستعمل ہے۔

سو بار دیکھتی ہوں پھولوں سی صورتوں کو
کل یہ حسین چہرے نذرِ غبار ہوں گے
ہم تو غموں کے ہاتھوں اس زندگی سے ہارے
وہ خوش نصیب ہیں جو اس غم کے پار ہوں گے

(ص:91)

شاہدہ لطیف کے ہاں ایک مثالی نوعیت کا معیار کارفرما ہے۔ اس حوالے سے ان کے ہاں ایک تعلیاتی تاثر بھی کارگر ہے۔ ان کی شعریات میں ایک خودی اور انا ہے جو وضع داری اور رکھ رکھاؤ سے عبارت ہے۔

مرا معیار مشکل مرحلہ ہے
مقابل ایک بھی سجتا نہیں ہے
مری گردن کو کوئی کاٹ ڈالے
کہ میرا سر کہیں جھکتا نہیں ہے

(ص:102)

شعر و سخن کے شغل کو وہ زندگی قرار دیتی ہیں۔ ان کا یہ ذوق و شوق مستقل نوعیت کا ہے جسے شہنازِ مرگ ہی منقطع کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ عمر بھر کے اس سفر کو وہ جامِ جاوداں قرار دیتی ہیں۔ جامِ جاوداں کا خوب صورت استعاراتی مرکب خود میں خمریاتی خصوصیت بھی رکھتا ہے۔ بحر

ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر اسی حوالے سے لائقِ ستائش ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

یہ شعر و شاعری ہی زندگی ہے
یہ جامِ جاوداں ہم نے پیا ہے

(ص:110)

یہ انسانی فطرت ہے کہ گزشتہ ساعتیں اسے عزیز از دل وجاں ہوتی ہیں اور ان کی بازیافت مطلوب ہوتی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ حالات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں اور یوں انسان کا ازمنہء رفتہ کی بازیافت کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر اسی نسبت سے قابلِ ذکر ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہے۔

پچھلی باتیں بھلا نہ دینا تم
یادِ ماضی بحال رہنے دو

(ص:112)

زندگی عمل سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ عمل مثبت بھی ہوسکتا ہے اور منفی بھی ہوسکتا ہے۔ یہ انسان کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ خیر کی طاقتوں کا معاون بنتا ہے یا پھر شر کی طاقتوں کا آلہء کار بنتا ہے۔

الفت کا یا نفرت کا
بیج کوئی تو بونا ہے

(ص:114)

شاہدہ لطیف کی ایک پوری غزل ملاحظہ فرمائیں جو مختلف مقاصدِ حیات کی ترجمان ہے۔ اس میں مختلف النوع مقتضیاتِ زیست کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

اک امتحان اور ہے اس امتحان کے بعد

صحرا بھی منتظر ہے مرا گلستاں کے بعد
منزل پہ آ سکا تو ملے گا بہت نڈھال
جو قافلہ بھی گزرے مرے کارواں کے بعد
دل کے معاملات تھے دنیار کے نہیں
کیا رہ گیا بھرم غمِ سودو زیاں کے بعد
کر دیں گے رازِ عہدِ وفا فاش ہم اگر
تم کیا بیان دو گے ہمارے بیاں کے بعد
پروردگار تیرے سوا کون ہے مرا
تجھ ایسے بے مثال غنی مہرباں کے بعد
نزدیک میرے شاہدؔہ وہ خوش نصیب ہیں
مسجد پہنچ گئے جو سحر کی اذاں کے بعد

(ص:117)

شاہدؔہ لطیف کی مقصدیتِ شعر میں جنوں سامانی کے شواہد بھی وفور سے پائے جاتے ہیں کیونکہ ان کے شعری مقاصد چند خاص موضوعات تک محدود نہیں ہیں۔ جنوں ایک ایسا جذبہ ہے جس میں ہار ہی جیت خیال کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ راہِ جنوں میں رسوائی کو بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ وہ پاسدارِ جدت بھی ہیں اور تقدیسِ سلف کی وارث و امین بھی ہیں۔ بقول ان کے جب نفس کی بنیاد ذلت پر استوار ہو تو جنسِ محبت لٹ جاتی ہے۔ پھر اہلِ وفا چپکے سے دنیا سے کنارا کشی اختیار کرتے ہیں۔

جیت ان کی نہیں ہے قسمت میں وہ جان کو ہارا کرتے ہیں
کچھ لوگ محبت میں اپنی رسوائی گوارا کرتے ہیں
بازارِ ترقی میں آ کر جدت کو خریدا ہے ہم نے
تقدیسِ سلف کے وارث ہم ہر کام نیارا کرتے ہیں

جب ذلت ہو بنیادِ نفس اور جنسِ محبت لٹ جائے
تب چپکے چپکے اہلِ وفا دنیا سے کنارا کرتے ہیں

(ص:118)

ان کے ہاں محرومیٔ قسمت کا بیان متنوع انداز میں ملتا ہے جس میں شدتِ احساس اور زورِ بیاں کے تلازمات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں بہت سی قربانیوں کا مذکور بھی پایا جاتا ہے جس کے پہلو بہ پہلو دعائیہ طرزِ فکر بھی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدائے بزرگ و برتر کی ذات پر مکمل یقین رکھتی ہیں۔ انسان زندگی میں مختلف منازل کا تعین کرتا رہتا ہے مگر اس کی حقیقی منزل شہنازِ مرگ سے ہم آغوش ہونا ہے۔ انہی مقاصد سے وابستہ ان کی ایک غزل کے چار اشعار شاملِ شذرہ ہیں جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

کھلے پانی سے لوٹیں تو کنارا ختم ہو جائے
عطا ہو جب بھی بینائی نظارہ ختم ہو جائے
اسے سارے زمانے میں کوئی اپنا نہیں ملتا
وہ جس کی پہلی الفت کا سہارا ختم ہو جائے
بڑا ہی خوں بہایا ہے بڑی مشکل سے سینچا ہے
مری مٹی کے مالک اب خسارہ ختم ہو جائے
وہیں سمجھو کہ منزل ہے ہماری شاہدؔہ آخر
کہیں پر سانس لینا جب ہمارا ختم ہو جائے

(ص:119)

محبت ایک بے لوث اور بے ریا جذبہ ہے۔ اس حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلے محبوب کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں فارسی کا ایک معروف مقولہ ہے کہ اول محبت در دلِ محبوب پیدا می شود۔۔۔ دوسرے مرحلے میں محب کے دل میں محبوب کی محبت پیدا ہوتی

ہے۔اس نادرالنظیر موضوع کو شاہدہ لطیف نے کچھ یوں نبھایا ہے جس سے مقصدیت کی بلیغ عکاسی ہوتی ہے۔یوں ترجیحات ومیلانات کی نسبت تعین سہل تر ہو گیا ہے۔

ہم خود وفورِ شوق کا سامان ہو گئے
جب سے تری نگاہ میں مہمان ہو گئے

(ص:120)

شاہدہ لطیف کے سخن میں عمیق رومانویت پائی جاتی ہے جس سے ہندی گیتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس کے لوازمات میں فطری رچاؤ اور فطری تلازمات شامل ہیں۔ان کے ہاں انسان دوستی کے عمیق شواہد موجود ہیں۔وہ مفلوک الحال اور محروم طبقے کی نمائندگی پر مامور ہیں جس سے ان کی ترقی پسند فکر کی غمازی ہوتی ہے۔وہ اپنے پیغام کو نالہء نارسا سے تعبیر کرتی ہیں۔شاید وہ اس انداز میں عصری بے حسی کی شکایت کرتی ہیں۔ان کے نزدیک قحط الرجال کی کیفیت ہے۔دیدہ ور ارباب معدوم ہیں ورنہ وہ تاریخِ محبت کا وقیع حوالہ ٹھہرتی۔

تتلی ہوتی تو میں اڑتی ترے گھر تک جاتی
بیل ہوتی لچکتی ترے در تک جاتی
صرف خوشبو سے نہ پیغام رسانی کرتی
میں خزاں یافتہ لوگوں کی خبر تک جاتی
مجھ کو تاریخِ محبت کا بھی گوشہ ملتا
داستاں میری اگر اہلِ نظر تک جاتی

(ص:121)

ہمارے نزدیک مصائب و آلام صرف زندگی کا حصہ ہیں کیونکہ ہم رفتگاں کے مسائل کا ادراک رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے گویا بعداز مرگ انسان ہر طرح کے دکھوں سے مکتی پا لیتا ہے۔

دکھوں کا آخری موسم گزرنے والا ہے
سفینہ بحرِ فنا میں اُترنے والا ہے

شاہدہ لطیف کے شعری رجحانات و میلانات میں رجائی جذبوں کو فوقیت حاصل ہے مگر بیم و یاس کا احساس بھی مستقل نوعیت کا ہوتا ہے۔ گویا یوں ایک گنگا جمنی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور گومگو کے عالم میں حیات بسر ہو جاتی ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ نظروں سے گر جاتے ہیں وہ کبھی بھی اپنا مقام و مرتبہ بحال نہیں کر پاتے۔ وہ اپنی شعری ریاضتوں سے مطمئن نظر آتی ہیں۔ اس لیے وہ امید افزا احساسات کی مالک ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ خراجِ تحسین کی دولت ضرور ان کے حصے میں آئے گی۔

جدائیاں بھی ضروری ہیں پھر سے ملنے کو
کبھی تو ہو گا میسر وصال بیٹھے ہیں
وفا کے باب میں شاید تمہارا نام ملے
صحیفہ عشق کا ہم تو کھنگال بیٹھے ہیں
گرا دیا تھا نظر سے جنہیں کبھی ہم نے
ہوا ہے ان کو سنبھلنا محال بیٹھے ہیں
ملے گی دادِ سخن تجھ کو شاہدہ ان سے
بہت سے اہلِ نظر باکمال بیٹھے ہیں

(ص:125)

شاہدہ لطیف کی ایک اور پوری غزل جو فروغِ مقصدیت میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے، نذرِ قارئین ہے۔

ماحول مرا آج تو غم ناک نہیں ہے
میں خوش ہوں کہ دشمن سرِ افلاک نہیں ہے
دیوانہ ہی کہہ دیتا ہے بے درد زمانہ
صد شکر کہ دامن تو میرا چاک نہیں ہے
اس دور میں ہے جرم بڑا جراتِ اظہار

زندہ ہے وہی آج جو بے باک نہیں ہے
اس گھر میں رہوں کیسے کوئی مجھ کو بتا دے
اس گھر میں اداسی کے سوا خاک نہیں ہے
اے شاہدہ اس آنکھ کو کس طرح کہیں آنکھ
جو غم میں کسی اور کے نمناک نہیں ہے

(ص:127)

ان کے ہاں فلسفیانہ افکار کا استخدام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ان کے نفسیاتی اعماق وآفاق ان کے سخن کے حسیاتی گراف کو بلند کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ان کے کلام کی بالیدہ فکری منطقیت ومعروضیت اور معقولیت کی دلیل ہے جس میں ایک وضع داری اور خوداعتمادی کا عنصر کارفرما ہے جوفکری ترفع کی علامت ہے۔بحر متقارب مثمن سالم میں کہا گیا ان کا یہ شعر خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

در و بام سے گفتگو کرتے کرتے
خود اپنی صدا کو ہم آواز کر لیں

(ص:129)

شاہدہ لطیف کا جوش وجذبہ جواں ہے۔مظاہرِ فطرت سے موانست کا پہلو اپنی پوری آب وتاب سے پایا جاتا ہے۔ایک سنجیدگی کی فضا ہے جو فحوائے شعر کی روح ورواں ہے۔اسلاف کی عزت وعظمت اپنے پورے کروفر سے کارگر ہے۔روایت پسندی کا عنصر نمایاں ہے۔ایثار و مروت کے خصائص کلام کی ہردلعزیزی میں اہم کردار ادا کررہے ہیں۔کہیں کہیں گومگو کی کیفیت فکری انتشار سے مربوط محسوس ہوتی ہے۔خودمختیاری اور خودانحصاری ان کے پورے اعتماد کی علامت ہے۔استفہامیہ اشارات ان کے سخن کے نفسیاتی اعماق وآفاق کے لیے ابواب وا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس پس منظر میں ان کی غزل قابلِ توجہ ہے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

افق چھونے کی ہمت کر رہی ہوں
پرندوں سے محبت کر رہی ہوں
جو کارِ زندگی کرنا ہے لازم
وہی حسبِ ضرورت کر رہی ہوں
بزرگوں سے چلی جو آ رہی ہے
میں تازہ وہ روایت کر رہی ہوں
کوئی منزل مری منزل نہیں ہے
میں تکمیلِ مسافت کر رہی ہوں
بساطیں اور مہرے سامنے ہیں
میں گھر بیٹھے سیاست کر رہی ہوں
گواہی کیوں ادھوری ہے ہماری
ہوں پوری اور حجت کر رہی ہوں

(ص:131)

شاہدہ لطیف کی شعریات میں مزاحمتی اور انقلابی فکر کی کارفرمائی بھی ملتی ہے جہاں ہمت و حوصلے کی نئی داستان رقم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ان کے شعری مقتضیات میں ایک بہار افشانی ہے جو احساسِ طرب کو جنم دے رہی ہے۔ یوں قاری پر خوشگوار اور لطیف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

سورج کی شعاعوں کی طرح قید سے آزاد
ظلمات کے سینے میں اُتر جائیں گے ہم لوگ
ماحول کو ہے فصلِ بہاراں کی ضرورت
کچھ پھول کھلائیں گے جدھر جائیں گے

(ص:)

وہ سماجی رویوں کو نہ صرف زیرِ بحث لاتی ہیں بلکہ ان کا تجزیاتی مطالعہ بھی نذرِ قارئین کرتی ہیں اور اسی حکمتِ عملی کی توقع وہ اپنے قاری سے بھی رکھتی ہیں۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک مقطع لائقِ توجہ ہے۔

ہمیں تو شاہدہؔ یہ دیکھنا ہے
کوئی کیسی نظر سے دیکھتا ہے ؟

(ص:139)

ان کے ہاں بسا اوقات یاس و نا امیدی کی کیفیت بھی محسوس ہوتی ہے جس کے اسباب و علل میں اقدار و روایات کی زبوں حالی کے پہلو بہ پہلو عصری بے حسی اور مکارمِ اخلاق کا فقدان معلوم ہوتا ہے۔

کوئی کرن کوئی تارا نظر نہیں آتا
اب اپنا آپ ہمارا نظر نہیں آتا
ہمارے چارسو اتنا بڑا سمندر ہے
کوئی امید کنارا نظر نہیں آتا
یہ کیسی دھند ہے جو شاہدہؔ مسلط ہے ؟
یہاں تو کوئی نظارا نظر نہیں آتا

ان کی ایک پوری غزل جو مقصدیت سے معمور سے شاملِ شذرہ ہے۔

یہ نہیں نور کے تابندہ حوالے کم ہیں
شمعیں روشن ہیں مگر ان کے اجالے کم ہیں
دکھ فقط یہ ہے کہ محدود ہیں سوچیں سب کی
ذہن لاکھوں ہیں مگر سوچنے والے کم ہیں
یہ سفر کم تو نہیں، طے جو کیا ہے میں نے
پھر بھی حیراں ہوں مرے پاؤں کے چھالے کم ہیں

جس گلستان کو سینچا ہے لہو سے برسوں
اس کی تاریخ میں پھولوں کے حوالے کم ہیں
اس کی رحمت نے قناعت بھی تو بخشی ہے تمہیں
کیوں یہ کہتے ہو کہ تھالی میں نوالے کم ہیں؟
کیوں خبر رکھتا نہیں صورتِ حالات کی دل؟
کیا مرے شہر میں اخبار رسالے کم ہیں؟
مطمئن ہوں کہ مجھے خوفِ جہاں کوئی نہیں
دوست بھی رکھے ہیں کم سانپ بھی پالے کم ہیں

(ص:143)

شاہدہ لطیف کا شعری کینوس وسیع تر مقصدیت کا حامل ہے جو موضوعاتی تنوع جدتِ فکر سے عبارت ہے۔ ان کا ہر موضوع اعلیٰ و ارفع مقاصد کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے کلام کا افادی پہلو رفعتِ فکر سے مربوط ہے۔ نجی و سطحی معاملات و موضوعات سے شعوری و غیر شعوری اور فطری گریز کی صورتِ حال پائی جاتی ہے۔ اگر وہ جہانِ سخن میں اسی طرح اپنی کشیدِ جاں لٹاتی رہیں گی تو ان کا سخن تواتر سے ترجمانِ مقصدیت رہے گا جسے ان کے تخلیقی ارتقا کی ضمانت سمجھا جائے گا۔

شاہدہ لطیف کی غزل کے فکری امکانات

کسی بھی سخن ساز کی غزل اس کے فکری و فنی ادراکات کا مظہر ہوتی ہے۔ اگر اس کی موضوعاتی وسعت کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو اس کی غزل کے فکری امکانات کا تجزیاتی مطالعہ از حد ناگزیر ہے۔ شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کی غزل کے فکری امکانات کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ تنقیدی اکائی کے طور پر اس حوالے سے ہم ان کے اولین شعری مجموعہ ''معجزہ'' مطبوعہ فروری 1999ء کے آخری دسویں حصے کی غزلیات اور غزلیات کے اشعارِ منتخبہ زیرِ تجزیہ لائیں گے۔ مزید برآں ان کے آخری مجموعہ کلام یعنی نویں شعری مجموعہ کے نصف اول کی غزلیات اور غزلیات کے منتخب اشعار بطور استشہادات برائے استخراجات لائیں گے تا کہ اجتماعی تاثر کی نمائندگی کی جا سکے۔ علاوہ ازیں تمام تر انتقادی پہلوؤں کو بھی بروئے کار لائیں گے۔

عصری بے حسی، مکارمِ اخلاق کی پامالی اور اقدار و روایات کی زبوں حالی ہمارے سماج کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اس لیے ہمیں ہر طرف غم و آلام کے مہیب سائے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں تنقیدی رویے بھی وفور سے پائے جاتے ہیں۔ اکثر اوقات ان کا کردار ایک غیر جانبدار تماشائی سا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی ذات کے حوالے سے بھی غیر جانبدار محسوس ہوتی ہیں۔ دوہرے رویے انھیں اذیت ناک محسوس ہوتے ہیں۔ اسی تناظر میں ان کی غزل کے چار شعر قابلِ ذکر ہیں۔

اندھا اندھا ہے یہ سورج آخر کیوں؟
جانے کیوں یہ دنیا کالی لگتی ہے؟
جس کی ذات کو میں شفاف سمجھتی تھی

اب یہ میری خام خیالی لگتی ہے
جو میرے کردار سے ہم آمیز نہ ہو
وہ تعریف بھی مجھ کو گالی لگتی ہے
تم جو چاہو اس کو دو الزام مگر
صورت اس کی الفت والی لگتی ہے

(ص:144)

وہ سماجی منظر نامے کا بنظرِ غائر مشاہدہ کرتی ہیں۔ان کے سخن میں عصری آشوب کی بازگشت بھی پائی جاتی ہے۔وہ معاشرے کے سربستہ اسرار و رموز کا ادراک رکھتی ہیں۔منفی رویوں کی براہِ راست اور بالواسطہ طور پر مذمت کرتی ہیں۔خیر کی طاقتوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں ورشر کی قوتوں کو ہدفِ تنقید بناتی ہیں۔ان کے رومانوی افکار میں شدت و حدت کارفرما ہے۔وہ اپنی فہم و فراست کو من جانب اللہ سمجھتی ہیں۔اسی پس منظر میں ان کی ایک غزل لائقِ توجہ ہے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

مجھے کیا کچھ دکھائی دے رہا ہے
یہاں ہر اک دہائی دے رہا ہے
سمندر کی تہوں میں ہے خموشی
مجھے لیکن سنائی دے رہا ہے
گنہ سرزد ہوا ہے کس سے آخر
کوئی کس کی صفائی دے رہا ہے
سزا رہتی ہے باقی زندگی کی
وہ کیوں خود کو رہائی دے رہا ہے
ابھی ملنے کی گھڑیاں آ گئی ہیں
ابھی سے وہ جدائی دے رہا ہے

اسی کو شاہدہ کہتے ہیں القا
مجھے جو کچھ سجھائی دے رہا ہے

(ص:145)

شاہدہ لطیف کے ہاں فکری عمومیت کے بھی خوب صورت رنگ پائے جاتے ہیں جن میں داخلی و خارجی احساسات بھی شامل ہیں۔ رومانوی افکار کلام کی جاذبیت اور دلپذیری میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں جن میں متنوع رویوں کی جلوہ آرائی بھی پائی جاتی ہے،حزن و ملال کی کیفیت سوز و گداز کا سماں پیدا کر رہی ہے۔

تیرا آنا تیرا جانا نہیں دیکھا جاتا
روز بنتا ہے فسانہ نہیں دیکھا جاتا
اب وہ چاہت وہ تعلق وہ رفاقت کیسی؟
اب حوالہ بھی پرانا نہیں دیکھا جاتا
شاہدہ تو ہے بہت دورِ بہاراں میں ملول
اس سے موسم بھی سہانا نہیں دیکھا جاتا

(ص:146)

ہمارے سماج میں خود غرضی اور مفاد پرستی کے رویے فروغ پا رہے ہیں جن کے باعث عصرِ حاضر کا انسان شدید قسم کے احساسِ تنہائی کا شکار ہے۔اس لیے وہ حصارِ ضبط کے مضبوط و مستحکم ہونے کی تلقین کرتی ہیں۔سعیِ پیہم کا حسیں آدرش ان کے سخن میں روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔نفسا نفسی کی روش نے مکارمِ اخلاق کو اپنی بساط لپیٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔اس لیے ان کے ہاں ایثار و مروت کی آبیاری بطریقِ احسن ہوتی ہے۔بحرِ اوفر مسدس سالم میں کہی گئی ان کی یہ غزل انہی تناظرات کا حصہ ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن'' ہیں۔

میرے سارے دکھ اپنانے کون آئے گا؟
میری بگڑی بات بنانے کون آئے گا؟

میں تو اپنے سارے آنسو پی سکتی ہوں
لیکن تیرے درد چھپانے کون آئے گا؟
پہروں خود سے لڑتے لڑتے تھک جاتی ہوں
خوابوں کی تعبیر بتانے کون آئے گا؟
اپنا رستہ اپنی منزل بھاگ رہی ہوں
تجھ کو تیری راہ دکھانے کون آئے گا؟
میں نے تجھ پر اپنا جیون وارا ہے
میرے بعد یہ سب بتلانے کون آئے گا؟

(ص:148)

راہِ محبت میں جراتِ اظہار ہر کسی کو میسر نہیں آتی اور یوں محبت خاموش راستوں پر گامزن رہتی ہے۔ جب حریفوں کی بجائے حلیفوں کی طرف سے دشمنی کا سامنا ہو تو یہ صورتِ حال زیادہ خطرناک ہوا کرتی ہے۔ جب یہ کیفیت اجتماعی نوعیت کی ہو تو اجتماعی خودکشی کی نوبت آ سکتی ہے۔ جب حریف دوست بن جائیں تو یہ معاملہ انسان کو جہانِ حیرت و استعجاب سے ہم آغوش کر دیتا ہے۔ جب عصری رویے من مرضی کے مرہونِ منت ہوں تو ہر کسی کی بندگی کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے۔ انہی فکری امکانات کی عکاسی ان کی غزل کے درج ذیل اشعار میں پائی جاتی ہے۔

ہمیں یہ فکر کبھی دل کی بات کہہ نہ سکے
ہمارے ساتھ کسی دل نے دل لگی کر لی
فصیلِ شہر کو اپنوں نے توڑ ڈالا ہے
تو سارے شہر نے خود کشی کر لی
تمہارے ڈھنگ عجب ہیں سمجھ نہیں آتے
حریف بن کے ملے اور دوستی کر لی
یہ کیا چلن ہے زمانے کا شاہدؔہ دیکھو

ہر ایک شخص نے مرضی سے بندگی کر لی

(ص:149)

شاہدہ لطیف کے ہاں ہمت و جسارت کی ایک نئی فضا کارفرما ہے۔اس لیےان کے فحوائے سخن میں انقلابی و مزاحمتی روح پائی جاتی ہے۔اگر انسان کا ربط وضبط اپنے خالقِ حقیقی سے منقطع ہو جائے تو پھر مشیت سے کسی نوع کے شکوہ وشکایت کا مجاز نہیں رہتا۔کیونکہ قدرت سے مضبوط و مستحکم تعلق ہی انسان کو کامیاب وکامران بناتا ہے۔

ہیں کون جو اپنی صدا روک رہے ہیں؟
ہاتھوں پہ دیے رکھ کے ہوا روک رہے ہیں
کس منہ سے کہیں گے کہ ہمیں ہار ہوئی ؟
جو جنگ کی حالت میں دعا روک رہے ہیں

(ص:150)

کسی دانشور کا قول ہے کہ حرف انسان کو کبھی کھوٹا نہیں ہونے دیتا۔یہ بات صرف قول کی حد تک نہیں ہے بلکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کیونکہ حروف تاریخ بن کر اپنے آپ کو، اپنے لکھنے والوں کو اور جس کے حوالے سے لکھے جائیں، اسے امر کر دیتے ہیں۔بقا کی اس تثلیث کا مشاہدہ و مطالعہ تاریخِ ادبیات کی بدولت بہ حسن وخوبی کیا جا سکتا ہے۔یہی راز ہے جو ادب کی بقا کے پہلو بہ پہلو اس کے ارتقا میں بھی مضمر ہے۔جب انسان کی سعی لاحاصل ٹھہرے اور اسے ناکام ونامراد ٹھہرنا پڑے تو بسا اوقات نوبت بہ ایں جا رسید کہ اپنی ذلت و رسوائی پر انسان خود ہی قہقہے لگانے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔اس نوع کی فکر مرزا غالبؔ سے بھی منسوب ہے مگر شاعرہ موصوفہ کے ہاں معاملہ کچھ اور نوعیت کا ہے۔کیونکہ ان کے ہاں ہمزاد کے ہنسنے کا حوالہ ہے جسے آپ اپنے ضمیر کا استعاراتی جامہ بھی پہنا سکتے ہیں۔مظاہرِ فطرت میں بہت سے عوامل ایسے ہیں جو ہمیں ہمت و حوصلے اور مستقل مزاجی کا سندیس دیتے ہیں۔اس کی مثال انہوں نے تیز وتند ہوا میں پنچھی کے شاخ پر بیٹھنے سے دی ہے جو خالص فطری نوعیت کی ہے اور ان کے سخن میں فطری رچاؤ کی بھی

عکاسی کرتی ہے۔نظامِ کائنات ایک خاص نفسیاتی آہنگ سے چل رہا ہے۔اگر معاملہ کہیں خلافِ معمول ہو جائے تو وہ عجیب سا اور خلافِ فطرت محسوس ہوتا ہے۔سماج کے دوہرے رویوں کا ادراک صرف ایک زیرک انسان ہی کرسکتا ہے لیکن بفضلِ تعالیٰ اس حوالے سے شاہدؔہ لطیف اسمِ بامسمیٰ ہیں۔غزل ھذا بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

نجانے ذہن کیا کیا سوچتا ہے ؟
مرا لکھا ہوا پھر بولتا ہے
بہت بھاگے ہیں دشتِ بے صدا میں
مرا ہمزاد مجھ پر ہنس رہا ہے
ہوائیں چیختی ہیں مر رہی ہیں
پرندہ شاخ پر بیٹھا ہوا ہے
نہیں ہے نام سے میرے جو واقف
اسے ملنے کا حق کس نے دیا ہے؟
ملا جو شخص مجھ سے یہ ہی سمجھا
کہ شاید وہ مرا درد آشنا ہے
میں اپنی فکر میں ہوں باخبر
کہ میرا نام ہی تو شاہدؔہ ہے

(ص:151)

حکمت و دانائی اور فہم و فراست عطائے مشیتِ ایزدی ہے۔جو انسان اپنے آپ سے مخلص نہیں ہے، وہ دوسرے سے اخلاص و مروت کا مظاہرہ کیسے کرسکتا ہے۔جو اپنے آپ سے ہمدرد ہے، وہ دوسروں کے لیے بھی مونس و مہربان ہوسکتا ہے۔کامیاب سماجی زندگی کے لیے زمانہ شناسی کا فن بھی ناگزیر ہے۔جو فردِ فرید اس ہنر سے آشنا ہو جاتا ہے، وہ کامیاب معاشرتی زندگی

کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ ہر انسان کو اپنا عمرانی وقار عزیز ہوتا ہے۔ ذلت و رسوائی اذیت ناک ہوتی ہے۔ جب رفاقتیں ناگوار ہو جائیں تو پھر راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی جاں گسل لمحوں کی اذیت سے گزرتا ہے تو پھر اسے منزلِ مرگ قریب تر محسوس ہوتی ہے۔ غزل کے درج ذیل اشعار مذکورہ بحر و وزن میں کہے گئے ہیں۔

ابھی تک وہ نہیں سمجھا وفا کو
ابھی تک بے وفائی ہو رہی ہے
اسے کہہ دو ہمارا نام مت لے
بڑی ہی جگ ہنسائی ہو رہی ہے
ابھی تو ساتھ چلنا مسئلہ تھا
ابھی سے بس جدائی ہو رہی ہے
خبر ہے شاہدہؔ اتنی مجھے تو
کہ سانسوں سے رہائی ہو رہی ہے

(ص:152)

شاہدہؔ لطیف کے سخن میں رجائی احساسات پر کیف اور خوشگوار و لطیف فضا کو تشکیل دے رہے ہیں۔ اس لیے ان کے افکار میں ایک بہار افشانی کا سماں موجود ہے۔ خلوص و مروت کے فقدان کے باعث آج کا انسان شدید قسم کے احساسِ تنہائی کا شکار ہے۔ محفل میں بھی خود کو تنہا خیال کرتا ہے۔ گویا جلوت میں بھی خلوت کا ماحول ہے۔ جنوں جذبے انسانی دل کو کمزور و ناتواں کر دیتے ہیں۔ ان کی غزل کے یہ اشعار بحر رمل مسدس محذوف میں ہیں جن کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔

اپنی سوچوں میں کھلے رہتے ہیں پھول
وادیءِ شاداب میں رہتے ہیں ہم
خوفِ تنہائی ہے دامن گیر کیوں؟

حلقۂ احباب میں رہتے ہیں ہم
شاہدؔہ تاب و توانائی کہاں؟
اک دلِ بے تاب میں رہتے ہیں ہم

(ص:153)

شاہدؔہ لطیف کی اسلوبیات میں عربی و فارسی شبدوں کی سندرتا اور کوملتا موجود ہے۔ایک نظامِ مرکبات ہے جو کلام کی مقبولیت و پذیرائی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ان کے اسلوب میں اردو کی تمام تشکیلاتی زبانیں مستعد و متحرک محسوس ہوتی ہیں۔ان کا مدعا نگاری کا قرینہ قاری کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہے۔وہ ہر نوع کے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہیں اور ہر حوالے سے اس کی سہولت کا خیال رکھتی ہیں۔جمہوری تنقیدی رویہ بھی یہی ہے کہ جو تخلیق کار قاری کی جتنی زیادہ آسانی کو مدنظر رکھتا ہے، وہ اتنا بڑا قلم کار ہے۔انہوں نے اسی اصولِ زریں کو پیشِ نظر رکھا ہوا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لسانی ادراکات کس قدر بسیط و عریض ہیں۔

وہ اپنے سماج میں فکری انتشار Agitation کی کیفیت مشاہدہ کرتی ہیں جو معمول کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جس پر کسی کو حیرت اور تعجب نہ ہے اور یہ معاملہ ان کے لیے باعثِ اذیت ہے۔وہ اپنے اسرارِ حیات کی حفاظت کے ہنر سے بخوبی آشنا ہیں۔وہ معاشرے میں استبدادی طبقے کے خوف کو بھی بے نقاب کرتی ہیں۔اسی فکری تاثر کے حامل ان کی غزل کے یہ اشعار بحر ہزج مسدس محذوف میں ہیں جن کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

بہت الجھا ہوا ہے شہر سارا
کسی کو بھی مگر حیرت نہیں ہے
ہمارے دل میں کیا ہے کون جانے؟
ہمیں کہنے کی بس عادت نہیں ہے
امیرِ شہر ہے اپنے ہی ڈھب کا
کوئی بولے، مگر جرات نہیں ہے

(ص:154)

خدائے بزرگ و برتر نے اپنی کوئی بھی مخلوق کسی مصلحت کے بغیر خلق نہیں کی اور ہر چیز اپنے آپ میں کچھ نہ کچھ افادی پہلو ضرور رکھتی ہے۔اس کے کچھ مضرات بھی ہوتے ہیں۔کسی چیز کا ایک نقصان دہ پہلو کسی انسان کے لیے فائدہ بخش بھی ہوسکتا ہے۔وفورِ خواہشات انسان کو طرح طرح کے مصائب و آلام اور گوناگوں مسائل سے دوچار کردیتا ہے۔ ہر وہ خواہش جو پوری نہیں ہو پاتی، وہ حضرتِ دل کے شہرِ خموشاں میں دفن ہوجاتی ہے۔پھر حسرت بن کے تاحیات زندہ رہ کر تکمیل کا تقاضا کرتی رہتی ہے۔جبکہ ایک قناعت پسند انسان پرسکون وقانع زندگی بسر کرتا ہے۔ان کے تمام تر امکانات کے پہلو بہ پہلو مظاہرِ فطرت کی حاشیہ آرائی ان کے شعری کینوس کو مقبول و ہردلعزیز بنا رہی ہے۔ان کے یہ اشعار بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں ہیں جن کے عروضی ارکان ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہیں۔

پہلے گھر کی گھٹن مٹا دیں گی
پھر ہوائیں دیا بجھا دیں گی
آگ ہیں آگ ، دور ہی رہنا
خواہشیں خاک میں ملا دیں گی
ان سے کہنا کبھی نہ دل کے راز
تتلیاں اور بھی ہوا دیں گی

(ص:155)

شاہدہ لطیف کی شعریات میں عصری آشوب اپنی تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ پایا جاتا ہے۔مصائب و آلام کی کیفیات دورِ حاضر کی منظرکشی کرتی ہیں۔نہ ذہنی سکون ہے نہ جسمانی راحت ہے، نہ دنیا سنور رہی ہے نہ عقبیٰ کے حوالے سے سدھار کی کوئی صورت ہے، نہ اپنی ذات کا ہوش نہ معاشرے کی فکر ہے، گویا زندگی پر ایک ہیجانی ماحول کی راجدھانی ہے۔عدل و انصاف ناپید ہے۔شرم و حیا مفقود ہے۔ یہاں کچھ بھی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔مقبولیت و پذیرائی جو آج

حاصل ہے، ضروری نہیں کہ وہ فردائی ادوار میں بھی میسر ہو۔

بس سانس چل رہی ہے ہوا نام کو نہیں
لب خشک ہو گئے ہیں دعا نام کو نہیں
اس عہدِ کم سواد میں کیا ہو کوئی امید
بے جرم بھی سزا ہے عطا نام کو نہیں
آزاد پھر رہے ہیں سبھی خود سے بے نیاز
کیا دور ہے کہ شرم و حیا نام کو نہیں
ہے آج شاہدہ کی پذیرائی ہر طرف
کیا بیت جائے کل یہ پتا نام کو نہیں

(ص:156)

شاہدہ لطیف دنیاوی اسباب وعلل پر یقین نہیں رکھتیں۔ ان کے نزدیک مادیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انہیں خدائے قدوس پر مکمل اعتماد ہے اور اس پر ہی بھروسا ہے۔ ان کے ہاں حب الوطنی کا جذبہ مثالی نوعیت کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصنیف ھذا کا انتساب بھی ان کے جذبہ حب الوطنی کے نام کیا گیا ہے۔ وہ نہ صرف ملک وقوم کی سلامتی چاہتی ہیں بلکہ اپنے دیس کی تزئین وآرائش کے حوالے سے بھی فکر مند ہیں۔

سفینہ اپنا نہیں ناخدا بھی اپنا نہیں
مگر محافظِ بحر و بر تو اپنا ہے
وطن کی خیر رہے شاہدہ یہی ہے تڑپ
نہ کیوں سجائیں ہم اس کو یہ گھر تو اپنا ہے

(ص:157)

ان کے ہاں انسان دوستی کے وسیع تر شواہد ملتے ہیں۔ وہ انسانیت کا فزوں تر دکھ درد رکھتی ہیں۔ جس کی ترسیل وہ اپنے پیمانۂ شعر میں کرتی ہیں۔ وہ اپنے زخمی دل کو مشیتِ ایزدی کی مصلحت

گردانتی ہیں تا کہ وہ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کر سکیں۔ان کی فکریات میں ترقی پسند فکر کی انتہائی عمدہ عکاسی موجود ہے۔

میں دوسروں کے دکھوں کو بھی کر سکوں محسوس
اس لیے مجھے قدرت نے دل فگار دیا

(ص:158)

ان کے شعری کینوس میں بسیط و عریض فلسفیانہ اور نفسیاتی وحسیاتی امکانات پائے جاتے ہیں۔فطرت اور مظاہرِ فطرت سے ان کی محبت نا قابلِ بیان ہے۔عزم وحوصلے کا وفوران کی مستقل مزاجی کی علامت ہے۔ وہ عمرانی حوالے سے فلاح و اصلاح کے اصول پر کاربند ہیں۔ان کی رومانویت کی چاشنی شعریت اور تغزل میں اہم کردار ادا کر رہی ہے جس میں طربیہ تاثرات اور طربیہ حوالے موجود ہیں۔

آگ کو آگ میں دکھا دوں گی
خاک کو خاک میں ملا دوں گی
ذات کے گم شدہ جزیرے سے
کب تلک خود کو میں صدا دوں گی
میں پرندوں کے دکھ سمجھتی ہوں
جابجا میں شجر لگا دوں گی
خواہشوں اور اپنی ذات کے بیچ
جو بھی دیوار ہے، گرا دوں گی
جن سے بستی میں آگ لگتی ہو
ان چراغوں کو میں بجھا دوں گی
وہ ہے عنواں مرے فسانے کا
جلدی کیا ہے اسے بتا دوں گی

وہ بھی ہنس دے گا دیکھ کر مجھ کو
شاہدہ میں بھی مسکرا دوں گی

(ص:159)

اب ہم شاہدہ لطیف کی غزل کے فکری امکانات کے حوالے سے ان کے نویں شعری مجموعے ''خواب سونے نہیں دیتے'' مطبوعہ ستمبر 2017ء کی نسبت سے نفسِ مضمون کو آگے بڑھاتے ہیں۔ تنقیدی اکائی کے طور پر ہم نے ان کے مجموعہءمذکور کے نصف اول کو منتخب کیا ہے۔ اس حوالے سے ہم منتخب غزلیات اور غزلیات کے اشعارِ منتخبہ بطور استشہادات برائے استخراجات شاملِ شذرہ کریں گے اور تمام تر انتقادی تناظرات بروئے کار لائیں گے۔ نیز اجتماعی تجزیاتی تاثر کو اجاگر کرنے کی سعیِ مندوب کی جائے گی۔

ان کی شعری کائنات میں تعلیاتی افکار وفور سے پائے جاتے ہیں۔ جن میں ادراکِ ذات کے شواہد بھی موجود ہیں جس سے ان کی منفرد شخصیت کی بھی عکاسی ہوتی ہے جس سے ان کا اہلِ احتیاط ہونا ثابت ہوتا ہے۔

موجوں کے زور سے بھی اچھالی نہ جا سکوں
گہری تہوں میں ہوں کہ نکالی نہ جا سکوں
سیماب تو نہیں مگر ایسا مزاج ہے
دونوں ہتھیلیوں سے سنبھالی نہ جا سکوں

(ص:18)

ان کے کام میں ایک فطری بے ساختگی کارفرما ہے جس کے باعث ان کا سخن سراپا آمد محسوس ہوتا ہے۔ کہیں بھی تصنع اور تکلف کی آلائشیں مشاہدہ نہیں کی جاسکتیں۔ یوں ان کی شاعری میں ایک غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔

صبح ہوئی اب تھک سے گئے ہیں کلیاں، جگنو، بادل
شب بھر میرے ساتھ رہے ہیں کلیاں، جگنو، بادل

(ص:20)

شاہدہ لطیف مضبوط و مستحکم حصارِ ضبط کی مالک ہیں۔ اس لیے ان کا شمار اہلِ احتیاط میں ہوتا ہے۔ ان کی فکر میں وہ گہرائی و گیرائی ہے کہ ان پر کبھی مافوق الفطرت ہونے کا گماں ہوتا ہے۔ انہیں اپنی عمرِ عزیز سے یہ شکایت ہے کہ اس نے انہیں محبت سے نہیں نوازا۔ انہیں مغربی تہذیب مرغوب نہیں ہے۔ وہ اسلامی و مشرقی تہذیب اور اقدار وروایات کی دلدادہ ہیں۔

میں دل کو بھٹکنے کی اجازت نہیں دیتی
بھٹکے تو پلٹنے کی ضمانت نہیں دیتی
آواز ہوں سو دوشِ ہوا پر بھی ہوں لیکن
ہر شخص کو میں اذنِ سماعت نہیں دیتی
چلتی ہے مرے ہمراہ مری عمر ہے لیکن
ہاتھوں میں مرے دستِ محبت نہیں دیتی
گھل مل کے رہوں ان سے جو ہیں غیر مہذب
یہ اذن مجھے ذاتی ثقافت نہیں دیتی

(ص:21)

کہیں کہیں ان کے ہاں نسائی احساسات کی جھلک بھی نمایاں طور پر مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ مگر زیست کی مقتضیات نے انہیں اس طرف پلٹنے کا موقع میسر نہیں کیا۔ بقول کسے:

یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا
کھلا ضرور مگر کھل کے مسکرا نہیں سکا

اسی فکری تسلسل کا اعادہ ان کے ہاں کچھ یوں ہے۔

خوشبو ہوں پر بکھرنے کا موقع نہیں ملا
اظہارِ ذات کا کوئی لمحہ نہیں ملا

(ص:22)

محبت کے تمام تر تلازمات کا استخدام ان کی شاعری میں اپنے پورے کروفر کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ وفا کا درس ان کے شاملِ نصاب ہے۔ گویا وہ پڑھے جانے کے لائق ہیں کیونکہ وہ محبت کے باب کا حصہ ہیں۔ اس لیے انہیں پڑھا جائے اور سراہا جائے۔ وہ اسی استحقاق کی حامل ہیں۔

وفا کے درس میں شامل نصاب میں بھی ہوں
مجھے بھی پڑھ کے محبت کا باب میں بھی ہوں

(ص:24)

شاہدہ لطیف کے ہاں نسائیت اپنی تمام تر رعنائیوں سے کارفرما ہے۔ جمالیاتی احساس جس میں روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں ان کے ہاں جمالیاتی اقدار کے فروغ کی سعیِ مندوب پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سخن میں داخلی عوامل کی بازگشت مبینہ طور پر سنی جاسکتی ہے۔

پتوں کی طرح مجھ کو بکھرنے نہیں دینا
آشاؤں کو میری کبھی مرنے نہیں دینا
آئینہ تو کہتا ہے مرے سامنے بیٹھو
حاسد کی یہ کوشش کہ سنورنے نہیں دینا

وہ اپنے فکروفن سے مکمل طور پر مخلص ہیں۔ نہ انہیں کسی نوع کے صلے کی تمنا ہے اور نہ کسی قسم کی ستائش کی آرزو ہے بلکہ وہ انتہائی درویشی اور جانفشانی سے اپنا کام کیے جا رہی ہیں۔ فکری بیداری ان کے کلام کا نمایاں وصف ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے کمال کے حوالے سے کسی طرح کے سمجھوتے کی قائل نہیں ہیں۔ وہ جادۂ منزل پر خلوص اور لگن سے رواں دواں ہیں۔

کمال میں تو نہ ہو گی کبھی کمی واقع
کوئی نگاہِ ستائش ادھر نہیں نہ سہی
میں بوئے گل ہوں مسلسل سفر میں رہتی ہوں
تمہارے شہر میں وا کوئی در نہیں نہ سہی
میں جیتے جاگتے لمحوں کا استعارہ ہوں

مرے وجود کی ان کو خبر نہیں نہ سہی

(ص:28)

ان کے ہاں تنقیدی رویے اپنی پوری حرارت کے ساتھ موجزن ہیں۔ان کے ہاں محبوب بھی ہدفِ تنقید بنتا ہے جسے کلاسیکی، نیوکلاسیکی اور معاصر شعریات میں عام طور پر نشانہء تنقید نہیں بنایا جاتا۔ان کے ہاں محرومی، غربت و افلاس اور خوشحالی و امارت کے تقابلی مطالعہ کی فضا پائی جاتی ہے۔

بات سنتے ہی نہیں آپ کدھر ہیں صاحب؟
کیا لگے آپ میں سرخاب کے پر ہیں صاحب؟
پوچھیے ہم سے کہ صحراؤں کا کیا عالم ہے؟
آپ کے خواب میں بس چاندنگر ہیں صاحب؟

(ص:29)

شاہدہ لطیف کے سخن میں حیات کی بے ثباتی کے منطقی شواہد ملتے ہیں۔انہیں اس امر کا یقین ہے کہ چاہے جتنا بھی جی لیا جائے، آخر ایک دن تو یومِ قضا نے آنا ہے۔

بالآخر کوچ تو کرنا ہے اپنی روح کو اک دن
کوئی کب تک مقید چار دیواری میں رہتا ہے؟

(ص:31)

ان کے فحوائے شعر میں اظہار کا ایک غیر معمولی انداز ملتا ہے جسے ان کی فکری جدت پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے۔ان کے افکار میں فلسفیانہ اور نفسیاتی وحسیاتی ادراکات پائے جاتے ہیں۔ ان کے احساسات عصری متقضیات سے ہم آہنگ ہیں۔مکارمِ اخلاق کی پاسداری ان کے سخن کا طرئہ امتیاز ہے۔ان کے ہاں مشرقی واسلامی تہذیبی خصائص بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

وفا کا درد بھی پاسِ حیا بھی رکھتی ہوں
سدا خیالِ مزاجِ ہوا بھی رکھتی ہوں

(ص:33)

شاہدہ لطیف ایک مضبوط و مستحکم حصارِ ضبط کی مالک ہیں۔ ان کا شمار اہلِ احتیاط میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ایک وضع داری اور راز داری کا پہلو بھی ملتا ہے۔ اس لیے ان کے سخن میں عالمِ فراق میں بھی وصال کا تذکرہ ملتا ہے۔

جو دیکھ سکتے ہو دیکھو کمالِ ضبط مرا
کٹی فراق میں اور تذکرہ وصال کا ہے

(ص:34)

انسان دوستی کے وسیع تر شواہدان کے خلوص و مروت کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ مفلوک الحال طبقے کی نمائندگی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ محروم طبقے سے وہ بے پناہ محبت کرتی ہیں اور دل سے ان کا عزت واحترام کرتی ہیں۔

یہ خستہ حال، پسماندہ، غریبِ شہر، لاوارث
سرِ زیرِ عمارت بے بس و لاچار بیٹھے ہیں

(ص:35)

وہ سماج کے دوہرے رویوں کے نہ صرف خلاف ہیں بلکہ ان کی مذمت بھی کرتی ہیں۔ یوں وہ براہِ راست اور بالواسطہ طور پر درسِ انسانیت دیتی ہیں۔

صفائی جو بھی دیتے ہو جہاں کو
حقیقت میں دل تمہارا بھی جانتا ہے

(ص:38)

ان کے ہاں سماج اور محبوب کے حوالے سے سخت تنقیدی رویے پائے جاتے ہیں حالانکہ کلاسیکی اور نیوکلاسیکی شعریات میں عام طور پر محبوب کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا جاتا۔ البتہ اس سے شکوہ وشکایت کے پہلو ضرور ملتے ہیں۔ معاصر شعری رویوں میں محبوب پر تنقید کی زیادہ گنجائش موجود ہے جسے جدید شعری رویہ بھی کہا جاتا ہے۔

ہمارے پیار کے لائق تو تم نہیں پھر بھی
تمہارے پیار کی شدت سے کیا ملے گا ہمیں؟
ہمارے پیار کے لائق تو پہلے بن جاؤ
تمہاری خالی محبت سے کیا ملے گا ہمیں؟

(ص:42)

شاہدؔہ لطیف کے فحوائے بیان میں ایک تجزیاتی عمل کارفرما ہے جو کسی تخلیق کار کے معتبر ہونے کی دلیل ہوا کرتا ہے۔جس میں عمومی واختصاصی ہر طرح کے زاویے پائے جاتے ہیں۔وہ اپنے آپ کو بھی کھلی کتاب کے بمصداق سامنے پیش کر دیتی ہیں۔گویا ان کے ہاں ایک غیر جانبداری ہے جو ذات وکائنات دونوں پر محیط ہے۔

منفرد تو بھی نہیں تجزیہ کہتا ہے مرا
تجھ میں ہر بات ہے موجود زمانے والی
ساری دنیا پہ عیاں ہے مرا ظاہر باطن
شاہدؔہ کون سی ہے بات چھپانے والی

(ص:44)

ان کے ہاں مادیت اور خودغرضی کی مذمت ملتی ہے۔وہ ذاتی مفادات کو خاطر میں نہ لانے کی قائل ہیں اور یہی توقع اپنی معاشرت سے بھی رکھتی ہیں۔یہی معاملہ ایک سچے اور کھرے سخنور کے شایانِ شان ہوا کرتا ہے۔

اختلاف اس سے اگر ہے تو اسی بات پہ ہے
زور سب اس کا فقط اپنے مفادات پہ ہے

(ص:47)

وہ محبت میں رازداری اور شرم وحیا سے مربوط ہیں جس سے ان کی وضع داری اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کی عکاسی ہوتی ہے۔وہ خود اہلِ خلوص ہیں اور مروت کی متلاشی بھی ہیں۔بحر ہزج مثمن سالم

میں کہے گئے ان کی غزل کے دو اشعار درج ذیل ہیں جن کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

مجھے تجھ سے محبت ہے مگر میں کہہ نہیں سکتی
فقط تیری ضرورت ہے مگر میں کہہ نہیں سکتی
وفا کہتے ہیں جس کو جاں نثاری جس کا ساحل ہے
اسی کی مجھ کو حاجت ہے مگر میں کہہ نہیں سکتی

(ص:51)

ان کا اخلاص تاثرات سے مالا مال ہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز بھی ہے۔ انہیں سماج سے کسی نوعیت کی ستائش درکار نہیں ہے بلکہ وہ صرف اور صرف عزت وتوقیر کی خواہش مند ہیں۔ جہانِ حرف وصوت سے وہ بے پناہ محبت کرتی ہیں اور اس محبت کو منطقی اور تمثیلاتی انداز میں پیش کرتی ہیں۔

جاننا چاہتے ہو جاری سفر ہے کیوں کر؟
یہ کہانی مرے اخلاص کی تاثیر کی ہے
میرے مداح ستائش نہیں درکار مجھے
آرزو تجھ سے فقط عزت و توقیر کی ہے
شاہدہؔ ایسا ہے رشتہ مرا الفاظ کے ساتھ
وہ رفاقت جو کسی پاؤں سے زنجیر کی ہے

شاہدہؔ لطیف کی درج ذیل غزل میں مظاہرِ فطرت کا استخدام ملاحظہ کریں۔ غزل ھذا بحر رجز مثمن سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن'' ہیں۔ اس غزل سے ان کے سخن میں فطری رچاؤ کا تعین بہ حسن وخوبی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی غزل میں جچی تلی اور برمحل ردیفیں بروئے کار لاتی ہیں۔

بھیگی رتوں کے درمیاں بادل، پرندے، آسماں

میرے شریکِ کارواں بادل، پرندے ، آسماں
گنجِ چمن میں کھو گئی میں تتلیوں کی ہو گئی
ڈھونڈیں گے اب مجھ کو کہاں بادل، پرندے، آسماں
ہے قیمتی کتنا فلک ،حیران ہو ں یہ دیکھ کر
سب کچھ میسر ہے وہاں بادل، پرندے ، آسماں
دوشِ ہوا پر ہیں رواں، کونجوں کے جوڑے کی طرح
اب تیرے میرے درمیاں بادل، پرندے، آسماں
میں چاہتی ہوں کاش ہو ایسی فضا ، ایسا سماں
اک شاخِ گل پر آشیاں، بادل، پرندے، آسماں
کھل کر کبھی میں کہہ سکوں یہ ہے مرا دن شاہدؔہ
میری زمیں، میرا زماں، بادل، پرندے، آسماں

(ص:66)

شاہدؔہ لطیف نے ذات سے کائنات کا سفر انتہائی سرعت سے کیا ہے۔اب وہ فکرِ ذات کے حصار سے نکل کر فکرِ کائنات کے حصار میں داخل ہو چکی ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہوا کرتی ہے کیونکہ ایسے مقام سے واپسی کوئی چاہتا ہی نہیں ہے۔بھلا کیونکر چاہے گا؟

مرا وجود امانت ہے میرے خالق کی
گنواؤں وقت میں کیوں فکرِ ذات کرتے ہوئے؟

(ص:73)

رازداری کا وصف انسان کی پختہ فکر اور سنجیدہ شخصیت کا غماز ہوتا ہے۔گویا جس نے رازداری کا سلیقہ پایا،اس نے سب کچھ پالیا۔اسی حوالے سے ان کی ایک پوری غزل نذرِقارئین ہے۔

پائے غم کیا نہیں کہ تم سے کہیں

اپنا شیوہ نہیں کہ تم سے کہیں

روح کا گھاؤ جانے ، ہم جانیں
تم مسیحا نہیں کہ تم سے کہیں

جمع ہیں دل میں سینکڑوں باتیں
وقت ملتا نہیں کہ تم سے کہیں

ضبط مرہم، مگر یہ دوا
آزمودہ نہیں کہ تم سے کہیں

آج تک جو بھی دل پہ گزری ہے
ہم نے چاہا نہیں کہ تم سے کہیں

شاہدہ کو صلاح دل کی ہے
حال ایسا نہیں کہ تم سے کہیں

(ص:75)

شاہدہ لطیف شعر سازی کے شعبہ میں کمال دستگاہ رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ہاں ہر نوع کے شواہد موجود ہیں۔ چاہے ان کا تعلق اسلوب سے ہو یا علمِ عروض سے، شعر کی ترتیب سے ہو یا ترکیب سے ہو، معاملہ قوافی کا ہو یا ردیفوں کا، آسان زمینیں ہوں یو سنگلاخ، شعری اظہار عمومی حوالے کا حامل ہو یا اختصاصی زاویوں کا امین ہو، وہ ہر حوالے سے لائقِ اعتراف ہیں۔ انہوں نے مختصر، متوسط اور طویل ردیفوں کو برموقع اور برمحل انتہائی فنی چابکدستی سے برتا ہے۔ مذکورہ بالا غزل کی ردیف بھی طویل ردیفوں کے زمرے کی حامل ہے۔ دوسرے مصرع میں اکثر مقامات پر قافیہ سے ماقبل ایک لفظ کی گنجائش رکھی گئے ہے۔ ایک مصرع میں تو وہ ایک لفظ بھی قافیہ میں ضم کر دیا گیا ہے۔ اب قارئین و محققین یہ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ ان کی فنی چابکدستی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

شاہدہ لطیف کی غزل کے فکری امکانات کو حیطۂ تحریر میں لانے کے لیے پی ایچ۔ ڈی کا

مقالہ بھی تنگیٔ داماں کا شکار ہو جائے گا۔ مذکورہ بالا استشہادات و استخراجات اس ضمن میں ایک خفیف سی کاوش محسوس ہوتی ہے البتہ ان کے موضوعات کے بحرِ بے کراں کی وسعت کا کچھ نہ کچھ تعین کرنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔ کیونکہ ہم اس حوالے سے اسی مقولے پر کاربند تھے کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔

؎ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

شاہدہ لطیف کا پندارِ انا

انا ایک ایسا جذبہ ہے، ایک ایسی سوچ ہے، ایک ایسی خوشبو ہے، ایک ایسا احساس ہے، ایک ایسا طرزِ ادا ہے جو سب سے منفرد ہے، جسے خودی، خود اعتمادی، خود انحصاری، اولوالعزمی، توکل، ایثار، حصارِ ضبط، درویشی، استغنا اور اعزاز و افتخار سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے پندارِ انا کے حوالے سے کچھ استشہادات و استخراجات سپردِ قرطاس کریں گے۔ اس پسِ منظر میں ہم ان کے پہلے اور آخری مجموعہ کلام کی غزلیات اور غزلیات کے اشعارِ منتخبہ زیرِ بحث لائیں گے۔

ہمارے اس تجزیاتی عمل میں دیگر انتقادی تناظرات بھی شاملِ شذرہ ہوں گے۔ پہلے مجموعہ کلام سے مراد ''معجزہ'' اور آخری مجموعہء شعر سے مراد ''خواب سونے نہیں دیتے'' ہے۔ پہلے اور آخری شعری مجموعہ کو زیرِ بحث لانے سے ہمارا مقصد بتدریج اجتماعی تاثر کی نمائندگی ہے تاکہ کہیں بھی انصاف کے تقاضے فراموش نہ ہونے پائیں۔ اولاً ہم ان کے اولیں شعری مجموعہ کو شاملِ شذرہ کریں گے۔

شاہدہ لطیف کے سخن میں انا کے حوالے سے متنوع رویے ملتے ہیں جن کے باعث یکسانیت اور بیزاری کا سماں پیدا نہیں ہوتا۔ بسا اوقات ان کے ہاں ضد اور انا کا تقابلی مطالعہ بھی ملتا ہے۔ کچھ احباب ضد اور انا کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ضد میں ہٹ دھرمی بھی شامل ہوتی ہے جبکہ مستقل مزاجی انا کا خاصا ہے۔ ہٹ دھرمی انسان کی کمزوری ہے جبکہ مستقل مزاجی انسان کی طاقت ہے۔ ضد خود میں ایک منفی تاثر بھی رکھتی ہے جبکہ انا

مثبت اقدار و روایات کی امین ہے۔ ضد معیوب سمجھی جاتی ہے جبکہ انا ایک قابلِ رشک جذبہ ہے۔ ان کے ہاں ضد کا تاثر سماج اور محبوب دونوں کے حوالوں سے پایا جاتا ہے۔ اسی تناظر میں ان کی ایک غزل کا ایک شعر جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے، قابلِ ذکر ہے۔ اس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

تمہاری ضد کے رستے میں انا میری ہے پتھر سی
کہ دریا تھم گئے اور ہوا اپنی جگہ ہے

(ص:35)

مذکورہ بالا شعر میں انا کی پیش رفت یا بالادستی کو ظاہر کیا گیا ہے جو شاعرہ موصوفہ سے منسوب ہے۔ یعنی یہاں وہ کامیاب و کامران دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں ضد کے لیے دریا کا استعارہ لایا گیا ہے جبکہ انا کو پتھر سے تشبیہہ دی گئی ہے اور اس کے لے ہوا کا استعارہ بھی بروئے کار لایا گیا ہے گویا شعر ھذا میں صنعت لف ونشر مرتب کا بھی استخدام کیا گیا ہے۔ اس شعر میں انا کے مقابلے میں ضد کمزور حیثیت کی حامل ہے۔ حقیقی اور فطری طور پر بھی انا غالب رہتی ہے۔ اس شعر کی استعاراتی وتشبیہاتی فضا اور صنعت لف ونشر مرتب کا التزام موضوعاتی مزاج کے عین مطابق ہے۔ گویا یہ شعر سراپا آمد محسوس ہوتا ہے جو خالص فطری نوعیت کا ہے اور فطری رچاؤ کا حامل بھی ہے۔

شاہدہ لطیف کا کمالِ فکر وفن یہ ہے کہ وہ بہت سے مواقع پر لفظ انا استعمال کیے بغیر انا کے موضوع کو انتہائی خوبصورتی سے نبھا جاتی ہیں۔ بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں ان کی ایک غزل کا مطلع ملاحظہ کریں جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہے۔ شعر ھذا میں انا کے موضوع کو براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر بروئے کار لایا گیا ہے۔

تیر اپنے کمان بھی اپنی
اور پھر آن بان بھی اپنی

(ص:36)

انہوں نے انا کو مختلف دلکش طریقہ ہائے اظہار سے پیش کیا ہے۔ کہیں اس کی وابستگی الہام

سے کی ہے تو کہیں اسے جام سے مربوط کیا ہے۔ کہیں اسے خودی سے موسوم کیا ہے تو کہیں اسے کیف وسرور سے منسوب کیا ہے اوراس کی نشاط سامانی کوز ودِ بیاں کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ کہیں اسے خمریاتی رنگ دے کر اسے مقبول و دلفریب بنا دیا ہے۔

خودی کا جام پلا ساقیا کچھ اور نہیں
خودی سے بڑھ کر ہمارا نشہ کچھ اور نہیں

(ص:42)

ان کے ہاں انا اعلیٰ وارفع اقدار وروایات کی حامل ہے جس میں تہذیبی وضع داری اور رکھ رکھاؤ بھی شامل ہے جو عطائے مشیتِ ایزدی ہے۔ جس کی حیثیت آفاقی والہامی بھی ہے۔ ظرف و ضمیر کا استعارہ ہے۔ بحرِ اوفر مربع سالم میں ان کا یہ شعر دیکھیے جس کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہیں۔

جس کا جتنا ظرف ہے اس کو
اتنا ہی الہام بہت ہے

(ص:43)

شاہدہ لطیف کو انا کی خصوصیت نے مقبول و ہردلعزیز بنا دیا ہے جو خود میں ایک تعلیاتی تاثر بھی رکھتی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانیت کا حقیقی جوہر انا میں ہی پنہاں ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں ان کی غزل کا ایک مطلع طالبِ التفات ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

بھلائے کس طرح وہ شاہدہ کو؟
انا کے معجزے کا یہ اثر ہے

(ص:48)

مذکورہ بالا شعر نے اس اصلیت کی قلعی بھی کھول دی ہے کہ انا خود میں ایک معجزاتی پہلو بھی رکھتی ہے۔ ان کے ہاں انا کا ایک اور منفرد انداز لائقِ توجہ ہے۔

وہ دریا ٹوٹیں گے کیوں کر؟
جو اپنے کنارے رکھتے ہیں

(ص:50)

شاہدہ لطیف کی انا بتدریج محوِ ارتقا ہے۔ان کے لیے انا مسئلہ نہیں ہے بلکہ انا کی بقا مسئلہ ہے۔جس کے استحکام کے لیے وہ شب و روز کوشاں ہیں۔بحر متقارب مثمن سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر اسی حوالے سے ہے جس کا عروضی وزن ’’فعولن فعولن فعولن فعولن‘‘ ہے۔

ہمارا تو بس مسئلہ اک یہی ہے
ہم اپنا انا کی بقا ڈھونڈتے ہیں

(ص:52)

ان کی انا خودداری کا ایک مستحکم حوالہ ہے جس میں خوداعتمادی بھی ہے اور خودانحصاری بھی ہے۔ان کے ہاں کسی قسم کی محتاجی کا کوئی تصور نہیں ہے۔بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک مطلع ان کے نظریہ انانیت کو انتہائی بلیغ انداز میں پیش کر رہا ہے۔اس کے عروضی ارکان ’’مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن‘‘ ہیں۔

زمیں اپنی بنائیں گے جہاں اپنا بنائیں گے
انا کا مسئلہ ہے آسماں اپنا بنائیں گے

(ص:56)

بسا اوقات ان کی انا شاعرانہ تعلّی کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔اس حوالے سے وہ صنعتِ مبالغہ کو بھی بروئے کار لاتی ہیں۔

وہ اپنے قد سے جو باہر نکل بھی آئے تو
پہنچ نہ پائے، مرے کہکشاں کی وسعت میں

(ص:64)

شاہدہ لطیف کا تصورِ انا محض خودستائی سے عبارت نہیں ہے بلکہ زمینی حقائق سے وابستہ ہے۔

اس حقیقت کو جاننے کے لیے ہمیں ان کی شخصیت، مزاج، کردار اور ان کے شعری موقف کا تقابلی مطالعہ کرنا ہوگا۔اس تجزیاتی مطالعہ کے بعد یہ حقیقیت مبینہ طور پر واضح ہوتی ہے کہ ان کا نظریہء انانیت حقیقت پسندی سے منسوب ہے۔ وہ ہر نوع کی کٹھنائیوں اور سنگینیوں کا پامردی سے مقابلہ کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ان کی کامیاب زندگی ان کے تصورِ انا کی صداقت کو ثابت کرتی ہے۔ وہ اہلِ زمانہ سے اپنے آپ کو مختلف پاتی ہیں کیونکہ ان کی فکر اور مزاج غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے شعروسخن کے بنظرِ غائر مطالعہ سے یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ انانیت سے مماثل افکار ان کے ہاں وفور سے پائے جاتے ہیں۔انا کے حوالے سے جتنا ان کے پاس مواد ہے، ہمیں وہ کسی سخن ور کے ہاں نظر نہیں آتا۔وہ انا کو اپنا سب سے قیمتی اثاثہ سمجھتی ہیں۔ان کے نزدیک ان کی اصل دولت یہی ہے۔حتیٰ کہ وہ محبت کے مقابلے میں انا کو فوقیت دیتی ہیں۔ بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ان کی غزل کے تین اشعار اسی فکری پس منظر کے حامل ہیں جن کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

یہ دیکھو ابھی ہم میں دم خم ہے کتنا
جلا کر دیے ہم ہوا مانگتے ہیں
خدا کی قسم ہم بہت مختلف ہیں
خدائی نہیں ہم خدا مانگتے ہیں
ہمیں شاہدہ وہ سمجھتے نہیں ہیں
محبت نہیں ہم انا مانگتے ہیں

(ص:80)

شاہدہ لطیف کے نظریہ انا میں فزوں تر وسعت پائی جاتی ہے۔شخصیت کی تعلیم و تربیت اور ارتقا کے لیے وہ انا کو ناگزیر خیال کرتی ہیں۔ان کے نزدیک زندگی کرنے کا حقیقی ہنر انانیت میں ہی پوشیدہ ہے۔یہی انا ہے جو انہیں ملول و غمگین نہیں ہونے دیتی اور ان کے شریر کو شکتی بخشتی ہے۔ انا کے دم قدم سے ہی ان کے عزائم جواں ہیں۔

حوصلے ہم ہار کر بیٹھے نہیں ہیں شاہدہ
اس انا کے زعم میں کسبِ ہنر کرنا تو ہے

(ص:82)

ان کے فحوائے شعر میں انا کا بیاں متنوع ومنفرد انداز میں ملتا ہے۔ان کے نزدیک انا ایک سربستہ راز بھی ہے جو کبھی ایک خواب کی صورت ہے تو کبھی کسی اور رنگ ڈھنگ میں ہے۔البتہ ان کی خودداری اور خوداعتمادی وخودانحصاری ہر جگہ نمایاں ہے۔

سر پہ ہے کوئی سائباں اور نہ کوئی سحاب ہے
اپنی پناہ کے لیے ایک ردائے خواب ہے

(ص:85)

انہوں نے نسائیت کے پہلو بہ پہلو انانیت کو بھی انتہائی عمدگی سے پیش کیا ہے جس کی مثال معاصر نسائی شاعری میں شاذ ہی ملتی ہے۔

گو میں عورت ہوں مگر راہ بنائی اپنی
کوئی تو ہو جو کبھی میرے مقابل ٹھہرے

(ص:97)

اسی فکری تسلسل کے حامل ان کی غزل کے تین اشعار سپردِ قرطاس ہیں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

مرا معیار مشکل مرحلہ ہے
مقابل ایک بھی سجتا نہیں ہے
مری گردن کو کوئی کاٹ ڈالے
کہ مرا سر کہیں جھکتا نہیں ہے
یہ ضد ہے شاہدہ میری انا کی
یہ دل اب غیر کا ہوتا نہیں ہے

(ص:102)

شاہدہ لطیف انا کے مقابلے میں ضد کی مذمت کرتی ہیں اور ان کے نزدیک ضد ایک سفلی جذبہ ہے جو قابلِ مذمت ہے۔ اس کے برعکس انا میں انسانیت کا اصل جوہر چھپا ہوا ہے جو قابلِ رشک ہے۔ بحرِ خفیف مخبون محذوف میں کہے گئے ان کی غزل کے دو اشعار طالبِ التفات ہیں جن کا عروضی وزن ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہے۔

ربط کچھ تو بحال رہنے دو
اپنی ضد کا سوال رہنے دو
نفرتیں بھی ہنر میں آتی ہیں
اپنے سارے کمال رہنے دو

(ص:112)

مضبوط نوعیت کا حصارِ ضبط بھی ان کے مستحکم ہونے کی دلیل ہوا کرتا ہے جو وسیع تر عزم و حوصلے کی علامت بھی ہے جس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں خرد آموزی کے فزوں تر شواہد موجود ہیں۔

کتابِ دل سے تجھے ہم نکال بیٹھے ہیں
نجانے کس طرح خود کو سنبھال بیٹھے ہیں

(ص:125)

بیانیہ حوالے سے ان کے ہاں مختلف نوعیت کے کامیاب تجارب موجود ہیں جو ایک قاری اور محقق و نقاد کو ورطہء حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کا بیانیہ انداز بسا اوقات ایک موضوع کو کمزور ثابت کر دیتا ہے مگر کبھی کبھی اسی موضوع کو طاقت ور بھی باور کرا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ موضوعات کے نفسیاتی و حسیاتی اور فلسفیانہ ادراک کے باعث ہی ممکن ہے۔ جسے ان کی شعوری و لاشعوری یا فطری صلاحت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کی مثال کچھ یوں بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ ضد جو انا کے مقابلے میں منفی اور سفلی جذبہ ہے لیکن یہی ضد جب انا کے معاون موضوع کے طور پر سامنے

آتی ہے تو پھر اس کا تاثر مثبت اور خوشگوار و لطیف ہو جاتا ہے جسے شاہدہ لطیف کے بیان کی نادرہ کاری سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جو ان کے فکر و فن کی کرشمہ کاری کی دلیل ہے۔

انا پرستی کی ضد تھی سمجھ نہیں آئی
بھرا قبیلہ تھا کوئی مجال کیا کرتے

(ص:126)

ان کے کلام کے غائرانہ تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ ان کی انا فطری اور پیدائشی نوعیت کی ہے جس میں تصنع و تکلف کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اسے ان کی بالیدہ فکری کا ثمر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس امر کے شواہد ہمیں ان کے اولین شعری مجموعہ سے ملے ہیں۔ یہ شعر بحر متقارب مثمن محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعل'' ہے۔

مجھے شاہدہ مت اکیلا سمجھ
جہاں بھی گئی میں انا لے گئی

(ص:138)

ان کے سخن کا ایک اور خاصا یہ بھی ہے کہ وہ کبھی کبھی ضد کو انا کے متبادل کے طور پر بھی بروئے کار لاتی ہیں کیونکہ انا کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور جب ضد کا فیصلہ اٹل ہو جائے تو یہ تعین کرنا انتہائی آسان ہو جاتا ہے کہ ضد انا کے دائرہ کار میں کام کر رہی ہے۔ یہ شعر بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

ہوں منکر میں اسے پہچاننے سے
یہ میری ضد ہے ، میرا فیصلہ ہے

(ص:139)

بسا اوقات ان کی انا تنقیدی رویوں کا ذریعہ بھی بنتی ہے، پھر وہ سماج اور محبوب دونوں کے رویوں کو ہدفِ تنقید بناتی ہیں کیونکہ یہ انا ہی ہے جو کسی کی ضد کی حریف ٹھہرتی ہے اور اس کے

مقابل کھڑی ہوتی ہے۔

کس بانجھ رت میں تجھ کو بچھڑنے کی ضد رہی
سب کچھ ہے تیرے پاس وفا نام کو نہیں

(ص:156)

شاہدہ لطیف کے شعری بیانہ میں انا اور ضد کا خوبصورت تقابلی مطالعہ بھی پایا جاتا ہے اور یہ امر بھی طے شدہ ہے کہ اہلِ ضد ہمیشہ غیر مخلص، کج رو اور بے وفا ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے برعکس اہلِ انا باوقار، ہمدرد اور پر خلوص ہوتے ہیں۔

اگر ان کے مقام و مرتبے، قدر و منزلت، شہرت و پذیرائی اور مقبولیت و پسندیدگی کا انتقادی مطالعہ کیا جائے تو ان سب عوامل کا سرچشمہ ان کی انا قرار پاتی ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا تمام امور کا اعزاز و افتخار ان کی انا کو ہی جاتا ہے۔ انا کی سربلندی اور سرخوشی کا عالم ذرا ان کے اس مقطع میں ملاحظہ کریں۔

میں سارے شہر میں جو سر اٹھا کے چلتی ہوں
مری انا نے مجھے شاہدہ وقار دیا

(ص:158)

اب ہم شاہدہ لطیف کے موخر الطباعت شعری مجموعہ ''خوب سونے نہیں دیتے'' مطبوعہ ستمبر 2017ء کی نسبت سے شذرہ ھذا کے نفسِ مضمون کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مجموعہ ھذا کی منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ بطور استشہادات برائے استخراجات مذکورہ موضوع کے تناظر میں پیش کیے جائیں گے اور ان کے پندارِ انا کو زیادہ بلیغ انداز میں پیش کیا جائے گا۔

وہ اپنی انا کے حوالے سے کسی بھی نوع کے سمجھوتہ کی روادار نہیں ہیں کیونکہ ان کی انا ہی ان کا بھرم ہے۔ ان کا جیون ہے۔ ان کا سنسار ہے۔ ان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ ان کا جوہرِ حیات ہے۔

کچھ رہنے بھی دو میری انا کی خاطر

جس بات سے انکار ہے کیوں پوچھتے ہو؟

(ص:26)

انہیں اپنے صبر وضبط کا امتحان تو گوارا ہے مگر انہیں پاسِ انا مطلوب ہے۔یعنی ان کے لیے ان کی انا کا بھرم ہر حال میں مقدم ہے۔انہوں نے اپنے اسی موقف کو یوں باور کرایا ہے۔

تم امتحان مرے صبر و ضبط کا لے لو
مگر خیال رہے میں انا بھی رکھتی ہوں

(ص:33)

ان کی انا ان کے کمالِ ضبط سے عبارت ہے اور وہ کمالِ ضبط کیا ہے، ان کا پندارِ انا اور مضبوط حصارِ ضبط ہے جو مستحکم شخصیت و کردار اور مزاج کی علامت ہے۔جس کی آغوش میں تمام تر کامیابیاں اور کامرانیاں پنہاں ہیں۔

انہیں کسی بھی صورت انا کی مذمت اور تذلیل گوارا نہیں ہے۔جب وہ اپنے سماج میں انا کی تنزلی اور پستی مشاہدہ کرتی ہیں تو انہیں دلی طور پر سخت نوعیت کا قلق ہوتا ہے۔انا کے خلاف رویے انہیں سخت ناپسند ہیں کیونکہ ان کے نزدیک انا کا زوال ہر نوع کی تباہی و بربادی ہے۔بحر ہزج مثمن محذوف میں ان کی غزل کا ایک شعر دیکھیے جس کے عروضی ارکان ”مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن“ ہیں۔

دکانوں پر چمکتے بورڈ بھی آویزاں ہیں
انائیں بیچنے والے سرِ بازار بیٹھے ہیں

(ص:35)

شاہدہ لطیف کا تصورِ انا کیا ہے؟ بالکل وہی ہے جو علامہ اقبال کا نظریہءخودی ہے۔پھر ان میں حدِ تفاوت کیا ہے؟ وہ ان کے اپنے اپنے عہد کے تقاضے ہیں۔اگر اقبال کے ہاں زورِ بیاں زیادہ ہے اور اسلوبیاتی گراف بلند ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہماری قوم غلام تھی مگر یہ تلازمات شاہدہ لطیف کے ہاں کچھ پر سکون انداز کے حامل ہیں۔تو اس کا سبب یہ ہے

کہ اب قوم آزاد ہے۔ البتہ قوم کو متحد ہونے کی ضرورت ہر دور میں رہے گی۔ ہماری قوم کا فطری مزاج یہی ہے کہ اسے ہر دور میں محکومی اور غلامی سخت ناپسند رہی ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم میں ان کا یہ شعر دیکھیے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

یہ بستی سچے لوگوں کی انا فطرت پرستوں کی
تمہارے ہاتھ اس کا اقتدار آئے تو کیوں آئے

(ص:80)

شذرہ ھذا میں موجود شواہد کا تعلق فقط ان کے پہلے اور آخری مجموعہ سے ہے حالانکہ ان کے تمام تر مجموعہ ہائے کلام میں ان کے پندارِ انا کے حوالے سے استشہادات ملتی ہیں۔ شاہدہ لطیف نے نظریہء انا کی اسی طرح خدمت کی ہے جس طرح علامہ اقبال نے تصورِ خودی کے حوالے سے کام کیا ہے۔ اگر ان میں کچھ فرق ہے تو وہ ان کے اپنے اپنے عہد کی مقتضیات کا ہے جن کی توضیح و تصریح ہم قبل ازیں کر چکے ہیں۔

شاہدہ لطیف کا شعری بیانیہ

بیان کا مفہوم کوئی بات کھول کر توضیح و تصریح سے پیش کرنا ہے۔ اسی سے بیانیہ وجود میں آتا ہے۔ اگر شعری بیانیہ کے تناظر میں بات کریں تو اس سے مراد سخنور کا فحوائے شعر ہے اور اس میں معائب ومحاسن کے لحاظ سے کیا پہلو پائے جاتے ہیں، شذرہ ھذا میں ہم شاہدہ لطیف کے شعری بیانیہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کے چھ مجموعہ ہائے کے صرف غزلیہ کینوس کو زیرِ بحث لائیں گے تا کہ طولِ بیان سے بھی بچا جا سکے اور تنقیدی اکائی کا بھی تعین ضروری ہے۔ اس نسبت سے ہم ان کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار بطور استشہادات برائے استخراجات لائیں گے اور ان کے مشمولہ شعری مجموعوں کو زمانی ترتیب کے اعتبار سے زیرِ بحث لایا جائے گا۔

شذرہ ھذا کے نفسِ مضمون کی ابتدا ان کے اولیں شعری مجموعہ ''معجزہ'' مطبوعہ فروری 1999ء سے کرتے ہیں۔ شاہدہ لطیف ایک زود گو شاعرہ ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نو تخلیقی تصانیف ہیں۔ ان کے ہاں نوع بہ نوع مضامین اور لسانی تشکیلات آغوش کشا نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں بے پناہ موضوعاتی وسعت ہے۔ فکر وفن کا حسین امتزاج ہے اور ان کا ہیئتی کینوس وسیع تر ہے۔ ان کے غزلیہ کینوس میں مسلسل اور غیر مسلسل ہر نوع کی غزلیات پائی جاتی ہیں۔ نادر قوافی اور ردیفوں کا استخدام تغزل کی شان بڑھا رہا ہے۔ مرکب ومفرد اور محذوف بحور کا التزام ان کی قادر الکلامی کا مظہر ہے۔ عروضی تلازمات کا اہتمام بطریقِ احسن کیا گیا ہے جس کی مثال معاصر شاعرات میں ملنا محال ہے۔ ان کی شعریات میں تین منظوم سفر نامے اور ایک نعتیہ مجموعہ بھی شامل

ہے۔ان کے چھ شعری مجموعوں کو زیرِ تجزیہ لانے کا مقصد یہ ہے کہ بتدریج تخلیقی ارتقا کو بلیغ انداز میں پیش کیا جاسکے۔

شاہدہ لطیف مشرقی اقدار وروایات کو کبھی فراموش نہیں کرتیں کیونکہ مشرقیت ان کی سرشت میں ہے۔وہ اپنے آپ کو ایک مشرقی عورت سمجھتی ہیں اور یہ بخوبی جانتی ہیں کہ مشرقی عورت کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔اس لیے ان کے ہاں ایک رازداری کا پہلو بھی پایا جاتا ہے جو انتہائی مضبوط و توانا ہے۔گویا وہ ایک مضبوط حصارِ ضبط کی مالک ہیں۔ان کے سخن میں کہیں کہیں نسائیت کے شواہد بھی نمایاں ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جسے نسائیت کی چھاپ ہرگز نہیں کہا جا سکتا مگر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کے کلام میں نسائی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔

جو خواب دیکھتی ہوں تمہیں سناؤں کیا ؟
میں ایک مشرقی عورت ہوں بھول جاؤں کیا؟

(ص:24)

ان کا نفسیاتی وحسیاتی اور فلسفیانہ گراف بہت بلند ہے۔ ان کے شعری کینوس میں فکری حوالے سے گہرائی وگیرائی کے خصائص پائے جاتے ہیں۔بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں ان کی ایک غزل کا مطلع ملاحظہ کریں جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' ہیں۔

دوریوں کے جہاں بھی ملتے ہیں
یہ زمیں آسماں بھی ملتے ہیں

(ص:27)

ان کے ادراکاتی کینوس میں رجائی امکانات پورے جوش وخروش کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔مصائب وآلام اور صعوبتوں کے باوجود حزنیہ عوامل ان کے قریب ہی نہیں بھٹکتے۔شاید یہی ان کے عزم وحوصلے کی دلیل ہے۔ان کی رجائیت کا خوبصورت اور خوشگوار و لطیف پہلو یہ ہے کہ ان کے ہاں حوصلہ افزا امکانات رومان کی ردا اوڑھے ہوئے ہیں۔

ہے ہجر کے سفر میں تصور ہی رہنما

صحرا میں تجھ کو کالی گھٹا مانتے ہیں ہم

(ص:29)

شاہدہ لطیف کے شعری بیانے میں بے سروسامانی اور احساسِ محرومی کی کیفیات بھی شدت و حدت کے پیرائے میں ملتی ہیں۔ جس سے ان کا مقصد عصری بے حسی کا اظہار ہے۔ گویا کہیں کہیں ان کا سخن مرگِ اقدار کا نوحہ بن جاتا ہے جہاں مکارمِ اخلاق کی بساط لپٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ایک نفسا نفسی کا عالم واضح طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر اسی تناظر میں ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

اتنی شدت کی پڑے دھوپ کہ جل جائے بدن
جب نہیں ہے کوئی سایہ بھی اقامت کے لیے

(ص:39)

ان کی فکریات و معاملات میں توکل باللہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ وہ از منہ فردا سے بہتر توقعات کی حامل ہیں۔ یہی امید و حوصلہ انہیں زندگی کرنے کی شکتی دیتا ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم میں ان کا یہ شعر دیکھیے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

ہم اس کے در سے وابستہ ہیں جن کے فیض سے بے شک
ٹلے گا ہم سے بھی آخر عتاب آہستہ آہستہ

(ص:45)

ہجر و وصال کی کیفیات ان کے ہاں صبر آزما صورت میں ملتی ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں کے معاملات انتہائی کٹھن ہیں۔ جدائی بھی اذیت ناک ہے اور ملن بھی بے چین کرتا ہے۔ اسی حوالے سے ان کی غزل کا ایک شعر قابلِ غور ہے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

میں تیرا ہاتھ تھامے چل رہی ہوں
یہ جانے مجھ سے کیوں ہوتا نہیں ہے؟

(ص:47)

شاہدہ لطیف تاریکی اور ظلمت کے خلاف ہیں۔ ان کے قلب وخرد پر روشنی کا تسلط ہے۔ اس لیے انہیں اپنے چارسو روشنی محسوس ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا بحر ووزن میں ان کی غزل کا ایک مطلع اسی حوالے سے قابلِ توجہ ہے۔

نہ جانے دل پہ یہ کیسا اثر ہے
کوئی اک روشنی حدِ نظر ہے

(ص:48)

بسا اوقات ان کی حزنیہ شعری طبع بھی رفعت آشنا ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا بیان بلیغ وسادہ ہوتا ہے جو سہلِ ممتنع کے قریں تر ہوتا ہے۔ ان کا اسلوب مقصدیت سے مملو ہے جس میں فکری ولسانی شعبدہ بازیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یوں ان کی مدعا نگاری کا ایک قرینہ سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری میں فکری ولسانی ہر نوع کی دقیقہ سنجی سے ایک شعوری اور فطری گریز کی صورتِ حال پائی جاتی ہے۔

دکھ جتنے دل کے باب میں ہیں
سارے کے سارے رکھتے ہیں

(ص:50)

ان کے ہاں حزن والم کی متنوع کیفیات ملتی ہیں جس کے باعث نہ ان کے ہاں یکسانیت ہے اور نہ سپاٹ پن ہے اور قاری کو کسی نوع کی بیزاری کا احساس نہیں ہوتا۔ بسا اوقات ان کے ہاں غم کی تھکا دینے والی کیفیت بھی ملتی ہے۔ گویا یہ بھی ان کا ایک طرح کا اندازِ استراحت ہے جس میں بیم ویاس کا تاثر اجاگر نہیں ہونے پاتا۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک مقطع سپردِ قرطاس ہے۔

عجب ہے شاہدہ تھک ہار کر دل
غموں کو اوڑھ کر اب سو گیا ہے

(ص:51)

شاہدہ لطیف کے شعری بیانیے میں ایک پندارِ انا ہے، ایک تہذیبی وضع داری ہے، ایک رکھ رکھاؤ ہے۔ وہ اسلامی و مشرقی اقدار و روایات کی سختی سے قائل ہیں۔ ان کا حقیقی سرمایہ ان کے حوالے سے رکھی جانے والی مثبت و شستہ رائے ہے۔ مغربیت سے انہیں شدید نفرت ہے۔ ان کا شمار اہلِ احتیاط میں ہوتا ہے۔ سستی شہرت کے ہتھکنڈوں سے اپنے آپ کو محفوظ و مامون رکھتی ہیں۔ ان کی شعریات کے معاملات میں ایک کلاسیکی روح کارفرما ہے۔ وہ اپنے آپ کو عصری بے راہ روی اور فکری انتشار سے بچا کے رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں مشرقی و اسلامی تہذیب کے پرچار کی ایک صورت پائی جاتی ہے۔

اس پہ خوش ہوں کہ ہوں روشن کسی دل کی صورت
بزم کی شمع نہیں میں تو ہوں گھر میں روشن

(ص:66)

ان کے فحوائے بیان میں ذات کی بازیافت کا عمل بھی وقوع پذیر ہوتا ہوا محسوس ہتا ہے۔ تحلیلِ نفسی کے شواہد آشکار ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے غم کی وسعت میں ایک بیکرانی کا پہلو بھی پایا جاتا ہے لیکن قابلِ حیرت امر یہ ہے کہ ان کے ہاں غم والم کے حوالے سے غم و غصہ کی کیفیت ہرگز نہیں ہے کیونکہ وہ غم کو بھی جیون کا ایک حصہ سمجھتی ہیں کیونکہ اس کے بغیر بھی زندگی کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔

کہوں یہ کیسے کہ خود کو تلاش کرنا ہے ؟
میں کھو گئی ہوں غمِ بے کراں کی وسعت میں

(ص:64)

نادر قوافی اور ردیفوں کا چلن ان کے شعری کینوس میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے جو تغزل کی چاشنی میں خصوصی کردار ادا کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ آہنگ و غنائیت میں اضافہ ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ صوتی، صوری اور سماعتی حسن دوچند ہو رہا ہے۔ شعریت کی چاشنی دوبالا ہو رہی ہے۔

محبوب کا تصور ان کے ہاں نادر النظیر ، منفرد اور مثالی نوعیت کا ہے۔ ان کی شاعری میں معرفت و مجاز کے تلازمات باہم مربوط ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں ایک صنعت ایہام کا التزام کارگر ہے۔ ان کے سخن میں تصوف، معرفت اور رومان کی ایک گنگا جمنی فضا ہے جنہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا دشوار نظر آتا ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں ان کی ایک غزل کا مطلع قابلِ غور ہے۔

کسے چاہوں کوئی جچتا نہیں ہے
کوئی بھی شہر میں تجھ سا نہیں ہے

(ص:102)

نسائیت اور اس کے تقاضوں کو وہ اپنے ارتقا میں رکاوٹ خیال کرتی ہیں۔ مغربی تہذیب بھی انہیں سخت ناپسند ہے۔ اگر ان کے عزائم کے حوالے سے بات کی جائے تو وہ بہت بلند ہیں۔

آنچل کے احترام نے پابند کر دیا
اڑنا تھا دور تک موجِ ہوا کے ساتھ

(ص:106)

رومانوی حوالے سے ان کے ہاں اپنے موقف کو باور کرانے کی خصوصیت پائی جاتی ہے جو بہت حوصلہ افزا امکانات کی حامل ہے۔ جو چیز ان کی معاون و مددگار رہے، وہ اپنے پروردگار پر ان کا اعتبار ہے جو کہیں انہیں متزلزل نہیں ہونے دیتا بلکہ انہیں مضبوط و مستحکم رکھتا ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر قابلِ توجہ ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

اگر ضد میں تو اپنے سارے وعدے توڑ ڈالے گا
جو مانگی تھیں تری خاطر دعائیں لوٹ آئیں گی

(ص:111)

متضاد و متنوع موضوعات کا بیان ان کے ہاں خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کی بدولت ان

کے سخن کا فلسفیانہ اور نفسیاتی وحسیاتی گراف بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انہیں ہر طرف روشنی دکھائی دیتی ہے اور محسوس بھی ہوتی ہے لیکن انہیں اس کے ثمرات نظر نہیں آتے گویا روشنی تو ہے لیکن اس کا افادی پہلو معدوم ہے۔ گویا وہ عصری بے حسی کے حوالے سے بالواسطہ اور براہِ راست دونوں انداز میں بات کرتی ہیں۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں ان کی غزل کا ایک شعر شاملِ شذرہ ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

ہمارے ہر طرف ہے روشنی سی
کہیں کچھ بھی نظر آتا نہیں ہے

(ص:113)

شاہدہ لطیف حیات کی بے ثباتی کا ادراک رکھتی ہیں۔ زندگی کا انہیں کوئی بھروسا نہیں ہے۔ بقول حیرت الٰہ آبادی:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

ان کا یہ ادراک اسلامی تصورات سے وابستہ ہے۔ اس قسم کے احساسات انسان کی عاجزی وانکساری اور صلہ رحمی سے مربوط ہوتے ہیں۔ جو انسان دوستی کا عظیم آدرش دیتے ہیں۔

قریب نزع کے عالم میں ہے یہ دورِ حیات
مریض جیسے کسی پل بھی مرنے والا ہے

(ص:122)

اگر کلاسیکی، نیو کلاسیکی اور معاصر شعریات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ہجر کو ایک سزا کے طور پر گردانا گیا ہے جبکہ شاہدہ لطیف کے نزدیک یہ کوئی سزا نہیں ہے بلکہ ایک امتحان ہے۔ جس سے محب کے حصارِ ضبط کی ایک کڑی آزمائش ہوتی ہے۔ اس کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کا تعین کیا جاتا ہے۔ جسے ذات سے ذات تک کا مستقل سفر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ذات سے ذات کی طرف ایک سفر ہے مستقل

ہجر تو امتحان ہے یہ کوئی سزا نہیں

(ص:123)

ان کے افکار میں اسلامی تقدس کی روح کارفرما ہے۔ان کا نسائی اظہار تطہیر کی ردا اوڑھے ہوئے ہے۔انھوں نے نسائیت کو مقبولیت و پذیرائی کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا جیسا کہ عموماً شاعرات کے ہاں ہوتا ہے۔ان کا دعائیہ طرز کا کلام ان کی خدا خوفی کی علامت ہے۔ بحر متقارب مثمن محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر اسی طرزِ احساس کا مظہر ہے۔شعر کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعل'' ہیں۔

کٹھن منزلوں کا سفر جب ہوا
میں آنچل میں باندھے دعا لے گئی

(ص:138)

وہ کلاسیکی اقدار و روایات کی شیدا اور شیفتہ ہیں۔ازمنہء رفتہ کی بازیافت ان کا محبوب ترین موضوع ہے۔انہیں عہدِ موجود کی نیرنگیاں جو آداب و اخلاقیات سے عاری ہیں، انہیں سخت ناپسند ہیں۔اس لیے وہ عہدِ گزشتہ کو صدا دیتی ہیں۔ بحر رمل مثمن محذوف مخبون میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر اسی حوالے کا حامل ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فعلن'' ہے۔

کاش آ جائے وہی عہدِ گریزاں پھر سے
یہ نیا رنگِ زمانہ نہیں دیکھا جاتا

(ص:146)

شاہدہ لطیف کے ہاں ایک مصروف زندگی کا تصور ملتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک حیات عمل سے عبارت ہے اور عمل ہی انسان کو کامیابی و کامرانی عطا کرتا ہے۔فراغت و بے عملی انہیں زیبا نہیں ہے۔وہ اسے اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتی۔ یہ عمل اور مصروفیت کا ہی ثمر ہے کہ ان کے ہاں ناکامی و نامرادی کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ کسی حیرت کا وجود ہے۔بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی ایک غزل کا ایک مطلع محلِ نظر ہے جس کے عروضی ارکان '' مفاعیلن مفاعیلن فعولن''

ہیں۔

یہ سچ ہے اب کوئی حسرت نہیں ہے
ہمیں تو اک گھڑی فرصت نہیں ہے

(ص:154)

اب ہم شاہدہ لطیف کے دوسرے شعری مجموعہ ''میں پاکستانی ہوں'' مطبوعہ 14 اگست 2000ء کی نسبت سے شذرہ ھذا کے نفسِ مضمون کو آگے بڑھاتے ہیں۔مجموعہ ھذا خود میں قومی و ملی حوالہ بھی رکھتا ہے جس میں فزوں تر غزلیات و نظمیات شامل ہیں۔نظمیاتی حوالے سے متنوع ہیئتی تجارب کتاب ھذا کا حصہ ہیں۔ان کی یہ تخلیقی تصنیف فکری و فنی اعتبار سے منفرد نوعیت کی حامل ہے جس میں جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کا ایک جہاں آباد ہے۔اس شعری مجموعہ نے انہیں جہانِ ادب میں فزوں تر عزت و شہرت اور قدر و منزلت سے نوازا ہے اور ان کی پذیرائی میں خاطرخواہ اضافہ ہوا ہے۔فکری بیداری بھی مجموعہ ھذا کا ایک خصوصی حوالہ ہے۔عموماً کسی بھی سخنور سے دوسرے شعری مجموعہ کے طور پر فکر و فن کے ایسے عمدہ معیار کی توقع نہیں کی جا سکتی مگر یہ صرف شاہدہ ہی کی خصوصیت ہے جسے ان کی معراجِ فکر و فن اور تخلیقی ارتقا سے عبارت کیا جا سکتا ہے۔

ان کی فکریات میں خلوص و مروت اور مہر و وفا کی آبیاری ملتی ہے۔انہوں نے بڑے دل نشیں انداز میں اخلاص و محبت کو پیش کیا ہے۔وہ انسانیت کا بھلا چاہتی ہیں۔وہ چاہتی ہیں کہ دلوں میں درد اور نگاہوں میں پیار زندہ رہے۔دعا ہے کہ وفا کی اقدار و روایات زندہ و تابندہ رہیں۔

دلوں میں درد نگاہوں میں پیار زندہ رہے
خدا کرے کہ وفا کا شعار زندہ رہے

(ص:30)

ان کے فحوائے بیان میں بنتِ حوا کا ایک تقدیس آمیز تصور ملتا ہے جس میں کسی نوع کے عصری لہو و لعب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔وہ لایعنیت کی بجائے مقصدیت کی قائل ہیں جہاں وہ

بحیثیتِ عورت اپنے ذاتی حوالے سے بات کرتی ہیں۔ دراصل وہاں مستوراتِ عصر کی تعلیم و تربیت کا پہلو بھی پنہاں ہوتا ہے۔ ان کی شعریات میں شرم وحیا اور صدق وشرافت کی جیتی جاگتی تصویریں بھی ملتی ہیں۔

نگاہ بھر کے نہ دیکھا کبھی زمانے کو
ہمیشہ گھر سے میں سر کو جھکا کے نکلی ہوں

(ص:33)

تحیر ان کے شعری کینوس میں ایک خصوصی تلازمہ ہے جس میں حیرت واستعجاب کی دنیائیں آباد ہیں۔ ان کے سخن کا یہ معجزاتی پہلو خود میں رجائی امکانات بھی سموئے ہوئے ہے جس میں قدرت کی معجز سامانیوں کی نمو بھی ہے۔

ڈوبے کئی جزیرے مگر وہ بچا رہا
اک گھر جو عین گہرے سمندر کے پاس تھا

(ص:36)

ان کی شاعری میں ایسے اسلامی تصورات ہیں جو عبد و معبود کے مابین ترسیلِ ادراک کا کام کر رہے ہیں جس میں انسان دوستی اور ترقی پسندی کے حقیقی شواہد موجود ہیں اور مکارمِ اخلاق کی ترغیب وترویج میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

خدا کے بندوں کی چاہت بسیرا جس میں کرے
وہ دل تو منبر و محراب سے بھی بڑھ کر ہے

(ص:38)

شاہدہ لطیف مشرقی تہذیب کی شیدا و شیفتہ ہیں۔ مشرقیت کے گن گانا ان کے سخن کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے رگ و پے میں مشرقی اقدار وروایات رچی بسی ہیں۔ ان کے نزدیک انہیں صراطِ مستقیم پر کاربند رہنے کے حوالے سے بھی مشرقی تہذیب کا ایک اہم کردار ہے جس کا بندھن انسان کو ہر نوع کی بے راہ روی سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔

ہاں شاہدہ اس مشرقی تہذیب کا بندھن
دیتا نہیں ہرگز مجھے رستے سے بھٹکنے

(ص:50)

تقریباً اکثر و بیشتر ہر سخن ور نے عظمتِ میرؔ کا اعتراف کیا ہے اور وہ بھی اس حوالے سے کبھی پیچھے نہیں رہیں مگر شعری حوالے سے دیگر شعراء و شاعرات کی طرح کسی خوش فہمی و غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں کیونکہ ذکرِ میرؔ کے پہلو بہ پہلو وہ عاجزی و انکساری کو بھی ناگزیر خیال کرتی ہیں۔ احترام و ادب کا تقاضا بھی یہی ہے کہ میرؔ کے تذکرہ کے ساتھ اظہارِ عجز و انکسار انتہائی ضروری ہے۔ مزید بر آں ویسے بھی ان کے ہاں خلوص و مروت اور انسان دوستی کے وسیع تر شواہد ملتے ہیں۔ وہ انسانوں کے اندر مہر و وفا کی آبیاری کرنا چاہتی ہیں۔ وہ ایسے تمام کٹھور دل اور سنگ دل لوگوں کو موم کرنا چاہتی ہیں جو انسانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ان کے غزل کے دو اشعار اسی تناظر میں قابلِ ذکر ہیں جن کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

کہیں گے شعر کچھ کچھ میرؔ جیسے
ابھی تو ہم ریاضت کر رہے ہیں
میں ان پتھر دلوں کو موم کر دوں
جو انسانوں سے نفرت کر رہے ہیں

(ص:56)

شاہدہ لطیف کے شعری کینوس میں معرفت و تصوف کے تناظر میں فزوں تر اشعار ملتے ہیں۔ توحید پرستی ان کا شعار ہے۔ بحیثیتِ انسان انہیں فکری حوالے سے اپنی کم مائیگی کا ادراک ہے جس کا اظہار وہ اپنے خالقِ حقیقی سے بھی کرتی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ان کی عقل محدود ہے اور خدائے بزرگ و برتر کی ذات ان کے وہم و گماں سے بھی ماورا ہے۔ ان کا فلسفہ یہی ہے کہ طلب کے دامن میں محض خسارہ ہی خسارہ ہے۔ اس لیے ان کی فکر ماورائے سود و زیاں ہے۔ بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں ان کی غزل کے دو اشعار لائقِ توجہ ہیں جن کے عروضی ارکان

’’مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن‘‘ ہیں۔

معبود مری عقل ہے محدود نہایت
اورتو کہ مرے وہم و گماں سے بھی ہے آگے
سودائے طلب محض خسارہ ہی خسارہ
اورفکر مری سود و زیاں سے بھی ہے آگے

(ص:59)

وہ فطرت اور مظاہرِ فطرت سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔اس لیے ان کے سخن میں مظاہرِ فطرت کا فزوں تیرا استخدام پایا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس انسان کی آموزش کے لیے وسیع تر ادراکات پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ انسان خودغرض ہے۔گویا وہ انسانیت کے احیا وارتقا کے لیے انسان ہی کو ہدفِ تنقید بناتی ہیں۔وہ سماج کے دوہرے رویوں کی بھی نقاب کشائی کرتی ہیں۔اس سلسلے میں جسے عرفِ عام میں مجنوں بھی کہا جاتا ہے، کی اساطیری تلمیح کو بروئے کار لاتی ہیں۔ان کا موقف یہی ہے کہ قیس کے لبادے میں بہت سے بہروپیے موجود ہیں اوران کا اصل چہرہ بھی یہی ہے۔

پھول کھلتے ہیں قطاروں میں گلستانوں میں
خودغرض سوچ اگر ہے تو ہے انسانوں میں
اس حقیقت سے فقط قیس ہی واقف ہو گا
کتنے بہروپیے موجود ہیں دیوانوں میں

(ص:63)

وہ حقوقِ نسواں کی پاسدار وعلمبردار ہیں۔مذہبی وشعری اعتبار سے دوعورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے۔یعنی عورت کی گواہی نصف گواہی کا مذہبی اختیار رکھتی ہے۔اس لیے انہوں نے موقف اختیار کیا ہے کہ میں ایک مکمل عورت ہوں اور مجھے مکمل گواہی کا حق دیا جائے۔اس شعر کو شاعرانہ تعلّی کے زمرے میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔بہرحال یہ ان کی فکر کا ایک غالب اور

تندرست وتوانا پہلو ہے جسے کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے نزدیک نصف گواہی قرینِ انصاف نہیں ہو سکتی۔ انصاف کی مقتضیات میں مکمل گواہی ہی لائقِ اعتبار ہے۔ شعر ھذا ان کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔

کب مری نصف گواہی سے ہوا ہے انصاف
پوری عورت ہوں ، مکمل مجھے حق لینا ہے

(ص:66)

وہ اپنے ذاتی حوالے سے گویا ہیں کہ میرا شمار صنفِ نازک میں پھولوں کی طرح ہے۔ اپنے آپ کو پھول سے تشبیہہ دینا بھی ان کے جمالیاتی احساس کا مظہر ہے۔ وہ اپنے آپ کو نڈر محسوس کرتی ہیں۔ اگرچہ ڈر بھی ان کی ذات کا حصہ ہے اور جس سے ایک عورت کی سماجی حیثیت بھی واضح ہوتی ہے کیونکہ عورت بے خوف بھی ہوتی ہے اور اسے خوف بھی لاحق ہوتا ہے۔ گویا دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی حد تک ہوتی ہیں۔ شاہدہ لطیف اپنے اشعار میں متضاد و متنوع مضامین باندھنے کا ملکہ رکھتی ہیں جن میں ایک گریز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

میرا شمار ہے صنفِ نازک میں مثلِ گل
لیکن بہت نڈر بھی ہوں میں اپنے ڈر سمیت

(ص:67)

فکری بیداری ان کے سخن کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ عصری بے حسی کے خلاف سراپا احتجاج دکھائی دیتی ہیں۔ انسان دوستی کا فروغ ان کا مقصدِ شعر ہے۔ مکارمِ اخلاق کا ان کے ہاں براہِ راست اور بالواسطہ طور پر اہتمام پایا جاتا ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں ان کی غزل کے دو شعر قابلِ ذکر ہیں جن کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

روش پتھر کی ہم اپنا رہے ہیں
جبھی بے حس ہوتے جا رہے ہیں
اندھیرے میں کوئی تو راہ پائے

اسی خواہش میں جلتے جا رہے ہیں

(ص:70)

وہ عصری حوالے سے بہت سے استفسارات کی حامل ہیں۔اس لیے ان کے ہاں تنقیدی رویے بھی پائے جاتے ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ مثالیت کی قائل ہیں اور مثالی دنیا کا خواب دیکھتی ہیں جس کی انہیں تعبیر مطلوب ہے۔ان کا سخن زریں آدرش، امن وآشتی اور خلوص و مروت ہے جسے انسان دوستی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔اس سے بڑھ کر ترقی پسندی کیا ہو سکتی ہے۔ بحر سریع مثمن مخبون مکسوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر لائقِ توجہ ہے جس کے عروضی ارکان ''مستفعلن فعولن مستفعلن فعولن'' ہیں۔

یہ زمیں بھی کیا زمیں ہے، کہیں امن ہی نہیں ہے
کہیں تیغ نفرتوں کی، کہیں رنجشوں کا بھالا

(ص:71)

دیش بھگتی شاہدہ لطیف کی سرشت میں ہے۔وہ وطن کی بقا کو اپنی بقا خیال کرتی ہیں اور انہیں اس حوالے سے اعزاز و افتخار حاصل ہے۔

میرے لیے تو اس کی مٹی سونا ہے
پاکستان کا ہونا میرا ہونا ہے

(ص:75)

سماجی حوالوں سے تنقیدی رویوں کا وفور ان کی فکری بیداری کی علامت ہے۔معاشرے میں عزت و افتخار کا ہر شخص خواہاں ہے مگر اس کے لیے بھی ایک خاص اہلیت درکار ہوتی ہے جو عمرانی حوالے سے معدوم نظر آتی ہے۔

دستار کا جشن ہے بہت اہلِ شہر کو
اتنے سروں میں لائقِ توقیر بھی تو ہو

(ص:83)

انہیں جان کی امان مطلوب نہیں بلکہ اس عہدِ بے حسی میں اذنِ بیاں درکار ہے۔ وہ اظہار کو ناگزیر خیال کرتی ہیں۔ وہ ممکنہ مغربی تہذیبی یلغار سے بھی باخبر ہیں جس میں زبان کو بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ ان اساتذہ کو بھی آڑے ہاتھوں لیتی ہیں جو بچوں سے بدیسی زبان انگریزی بولنے کی توقع رکھتی ہیں۔

اور ہی لوگ ہیں جو جاں کی اماں مانگتے ہیں
عہدِ ناگفتہ سے ہم اذنِ بیاں مانگتے ہیں
یہ معلم ہیں کہ کارندے ہیں بیگانوں کے
میرے بچوں سے جو غیروں کی زباں مانگتے ہیں

(ص:84)

وہ سیاست اور اربابِ سیاست کی کارستانیوں کو بھی ہدفِ تنقید بناتی ہیں۔ خصوصاً وہ سیاست دان جن کی بدعنوانیوں کے باعث قوم قرضوں کے بھوت کا شکار ہوگئی اور نئی نسل کے خواب عفریت آمیز ہو گئے ہیں۔ جب یہ صورتِ حال ہو تو پھر کیسی خوشی اور کیسی سیاست کیونکہ جب قوم مبتلائے غم واضطراب ہو تو پھر ہر نوع کی خوشی کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے۔

اے رہنماؤ ڈال گئے کس عذاب میں؟
قرضوں کے بھوت آ گئے نسلوں کے خواب میں
کیسی خوشی، کہاں کی سیاست، کہاں کا عیش؟
جب قوم مبتلا ہو غم و اضطراب میں

(ص:87)

وہ ہر نوع کے اظہار جس کی مقتضیات میں انصاف شامل ہو، کی قائل ہیں اور وہ یہ مشاہدہ کرنا چاہتی ہیں کہ کس میں کتنی حق و سچ کو بیان کرنے کی جرات ہے۔ اس شعر کی فکریات اس مرکزی نقطے کے گرد گھومتی ہیں کہ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہاد ہے۔ وہ معاشرے میں مادیت پسند رویوں کو ناپسند کرتی ہیں اور عصری عمرانی نظام کو ہدفِ تنقید بناتی ہیں جس میں انسان کی

قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ مال وزر کو فوقیت حاصل ہے۔ وہ سماج کے محروم اور پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں اور یہی شاہدہ لطیف کے شعری بیانیے کا نقطہ عروج ہے۔

ہمارے عہد کو اظہار کی ضرورت ہے
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس میں اتنی جرات ہے؟
عجب نظامِ بصارت پنپ رہا ہے یہاں
کسی بشر کی نہیں ، مال و زر کی وقعت ہے
جو ہو سکے تو حمایت ہو بے نواؤں کی
اسی میں ذہنی سکوں اور دل کی راحت ہے

(ص:89)

یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ادبی حوالے سے کلاسیکی اقدار اور روایات پر کاربند ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ جدت وندرت سے بیگانہ ہیں۔ اسی موضوع کو انہوں نے ایک فطری اور تشبیہاتی انداز میں پیش کیا ہے جس میں مظاہرِ فطرت کا بھی استخدام ہوا ہے جس کی بدولت ان کے سخن میں فطری رچاؤ آشکار ہوتا ہے اور یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ ان کا کلام تصنع و تکلف کی آلائشوں سے مبرا و ماورا ہے۔

چلو ہم اپنی طرزِ کہن بدلتے ہیں
درخت جیسے نئے پیرہن بدلتے ہیں

(ص:99)

ان کی شعریات میں انسان دوستی کا درسِ زریں وفور سے ملتا ہے کیونکہ وہ دنیا میں امن و آشتی کی خواہاں ہیں اور مثالی دنیا کا نہ صرف خواب دیکھتی ہیں بلکہ اس کی تعمیر بھی چاہتی ہیں۔ ایسے ہی اربابِ خلوص و مروت کی وہ تقلید کرنا چاہتی ہیں اور ان کی اقتدا کی دعوت بھی دیتی ہیں۔

دنیا کو دے سکوں وہ دولت کہ خوش ہوں لوگ
گر دیکھنا ہے زندہ ضمیروں کی سمت دیکھ

(ص:101)

وہ اپنی روز مرہ زندگی میں جدید معاونات کی اہمیت سے آشنا ہیں۔ وہ جدید معاونات چاہے ان کا تعلق دنیائے رومان سے کیوں نہ ہو۔sms کے حوالے سے ان کا یہ شعر قابلِ غور ہے جو بحر رمل مثمن محذوف میں ہے۔اس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔واضح رہے کہ ''فاعلن'' 'فاعلاتن کی محذوفی حالت ہے۔

جب سے sms کی نعمت آ گئی ہے ہاتھ میں
خط جو لکھتے تھے ہمیں، اب خط لکھا کرتے نہیں

(ص:102)

شاہدہ لطیف کو جب اپنے اردگرد یاوری ودستگیری کے امکانات نظر نہیں آتے، یعنی جب کرم مائل بہ التفات نظر نہیں آتا، تب بھی ان کا مزاج انہیں دستِ سوال دراز کرنے پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ یہ صورتِ حال ان کے مضبوط نوعیت کے حصارِ ضبط کی بدولت ہے جس سے ان کے پاسِ انا کا پہلو سامنے آتا ہے۔ان کی وضع داری اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کی عکاسی ہوتی ہے۔ایک مستحکم شخصیت وکردار کے خصائص نمو پذیر ہوتے ہیں۔بحر ہزج مثمن سالم میں ان کی ایک غزل کا مطلع قابلِ دید ہے جس کے عروضی ارکان'' مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

کرم مشکل کشائی پر بھی آمادہ نہیں لگتا
مزاج اپنا گدائی پر بھی آمادہ نہیں لگتا

(ص:106)

وہ ایک جہاں دیدہ اور زمانہ شناس شخصیت ہیں اور وہ اہلِ زمانہ کے نازیبا رویوں کی بخوبی جانکاری رکھتی ہیں۔ان کی ایک غزل کا ایک شعر زیبِ قرطاس ہے جو ان کے تجارب ومشاہداتِ حیات کا حاصل معلوم ہوتا ہے۔

اب تک کے تجربوں نے سکھایا ہے یہ سبق
جھوٹے تمام لوگ مکرتے ضرور ہیں

ان کا سخن بہت سی نادرہ کاریوں اور کرشمہ کاریوں سے عبارت ہے جن کی نویعت لسانی بھی ہے اور فکری بھی ہے جن میں صنائع و بدائع بھی ہیں اور رموز و وقائع بھی ہیں۔ ایک خوبصورت تمثیلاتی انداز ہے جو قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتا ہے اور ان کی تشبیہات خالص فطری نوعیت کی ہوتی ہیں جو مظاہرِ فطرت کی ردا اوڑھے ہوئے ہیں۔ یوں ان کا کلام فطری رچاؤ کا نادر نمونہ محسوس ہوتا ہے۔

ہم روش چھوڑ نہیں پائے وضع داری کی
دھوپ پہنے ہوئے صحرا میں شجر کاری کی

(ص:109)

شاہدہ لطیف اپنے آپ کو حقوقِ نسواں کی علمبردار گردانتی ہیں۔ ایک خاتون ہونے کی حیثیت سے اور انسانیت کے تقاضوں کے تحت بھی وہ ایک انسان دوست شاعرہ کا کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ خلوص و مروت اور امن و آشتی کی قائل ہیں۔ انسانی مساوات کا آفاقی پیغام بھی ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسی تناظر میں ان کی ایک غزل کے تین اشعار دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں جو بحر رمل مثمن محذوف میں ہیں جن کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

غیر کی بیٹی کے دکھ میں کم سے کم اتنا تو ہو
اپنا تحفہ کہہ کے زیور بانٹ دینا چاہیے
نوکروں کی بھوک بھی ملحوظِ خاطر ہو سدا
اپنا کھانا بھی برابر بانٹ دینا چاہیے
جب نہ ہو گنجائش اک دوسرے سے بات کی
دل نہ آپس میں ملیں گھر بانٹ دینا چاہیے

(ص:112)

وہ نہ صرف روایت پسند ہیں بلکہ روایت پسند ہونے پر فاخر و نازاں بھی ہیں۔ ہمیشہ انہوں نے اقدار و روایات کا دفاع کیا ہے اور ان کے احیا و ارتقا میں سنگِ میل کا کردار ادا کیا ہے کیونکہ

انہیں اس امر کا ادراک ہے۔ بقول ٹی ایس ایلیٹ:

''عظیم ادب کی بنیاد روایت پر استوار ہوتی ہے۔''

وہ روایات و اقدار کی بقا کو ملک و ملت اور معاشرے کی حیات قرار دیتی ہیں۔ بزرگوں کا احترام ان کے ضابطۂ حیات میں شامل ہے۔

مشرقی روایات کی میں نے شان رکھی ہے
سامنے بزرگوں کے چپ کی زبان رکھی ہے
جن روایتوں سے ہے یہ جڑا ہوا رشتہ
ساری زندگی میں نے ان کی آن رکھی ہے

(ص:113)

شاہدہ لطیف کا شعری بیانیہ بہت سے تغیرات کا حامل ہے جس میں نت نئی جدتیں نمودار ہوتی ہیں۔ وہ مصلحت پسندی کیا ہے جسے ہم عصری مقتضیات سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ ان کے فحوائے بیان میں تنقیدی رویوں کا وفور پایا جاتا ہے جن میں سماج سدھار کی مقصدیت کارفرما ہے کیونکہ تنقید کا وجود ہی انسان کو ارتقا کے لیے زینوں سے آشنا کرتا ہے۔

زمیں نہیں تو چلو آسماں بدلتے ہیں
ہم اپنے رنگ سے رنگِ جہاں بدلتے ہیں
جو اپنے گھر ہی کی حالت بدل نہیں سکتے
وہ کہہ رہے ہیں کہ سارا جہاں بدلتے ہیں

(ص:119)

وہ اپنی اقدار و روایات کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کی قائل ہیں اور یہ ترغیب و تلقین ان کی اپنے قارئین کے لیے بھی ہے۔ گویا وہ ترسیلِ ادراک کا ایک اہم فریضہ سرانجام دے رہی ہیں۔ مذکورہ بالا بحر و وزن میں ان کی ایک غزل کا ایک شعر نذرِ قارئین ہے۔

مٹ رہی ہے لحظہ لحظہ جو ہمارے ہاتھ سے

اب تو اس تاریخ کو لکھ کر بچانا چاہیے

(ص:123)

اسلامی و تاریخی تلمیحات کا استخدام ان کی شعریات میں ایک خاص شان وشوکت کا حامل ہے ۔غرور وتکبر کے اظہار کے لیے انہوں نے نمرود کی تاریخی تلمیح کو برتا ہے۔فنا اور بے ثباتی کے حوالے سے ان کے ہاں دو بڑے بتوں لات ومنات کی تلمیحات کو استعمال کیا ہے اور غداری کی ذیل میں انہوں نے ٹیپو سلطان کی شہادت کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔

نمرود بھی بنا تھا خدا اپنی ذات میں
پھر دفن ہو کے رہ گیا لات و منات میں
ٹیپو کبھی شہید نہ ہوتا قرینِ قصر
سازش میں دستِ راست رہا اس کی گھات میں

(ص:124)

شاہدہ لطیف کی شاعری میں جا بجا مضبوط حصارِ ضبط کے شواہد ملتے ہیں جو ان کی بالیدہ فکری کی دلیل ہیں جس سے ان کے عزم وحوصلے کا تعین بہ حسن وخوبی کیا جا سکتا ہے۔ایک سنجیدہ اور معتبر شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔صبر وایثار کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہے پارہ پارہ دل اور ہونٹ ہیں چپ
ہمارے ضبطِ غم کی حد تو دیکھو

وہ نونہالانِ چمن سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ان کے حقوق کے تحفظ کی خواہاں ہیں۔وہ سماج میں موجود چائلڈ لیبر اور بچوں کی خرید وفروخت کے سخت خلاف ہیں۔وہ ایسی دنیا کی مذمت کرتی ہیں جہاں بچوں کو آزادانہ طور پر خریدا اور بیچا جاتا ہے۔

پھولوں کی قیمت لگتی ہو تازہ غنچے بکتے ہوں
ایسی دنیا کیسی دنیا جس میں بچے بکتے ہوں

(ص:132)

ان کا یقین ہے کہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔انسان کے اچھے عمل کی جزا دنیا و عقبیٰ دونوں میں ملتی ہے۔اسی طرح برائی کی سزا بھی دنیا و آخرت دونوں میں ملتی ہے۔ جیسے مشہور کہاوت ہے،''جو بوؤ گے،سو کاٹو گے۔۔۔''

As you sow, so shall you reap.

دوسروں کو جو اذیت میں رکھیں گے ناحق
پیچ در پیچ وہ الجھن میں بھی آ سکتے ہیں

(ص:134)

وہ زمانہ شناسی کا ہنر جانتی ہیں اور عصری کامیابی کے معیار سے خوب واقفیت رکھتی ہیں۔ خصوصاً شعبۂ تجارت کے حوالے سے ناز یبا رویوں کی نہ صرف نقاب کشائی کرتی ہیں بلکہ ان کی بھرپور مذمت بھی کرتی ہیں کیونکہ ہماری تجارت کا المیہ یہ ہے کہ جھوٹ کو فروغ حاصل ہے اور اسے کلیدِ کامیابی سمجھا جاتا ہے جبکہ وہ اخلاقِ جمیلہ کی قائل ہیں اور اخلاقِ رذیلہ سے انہیں شدید نفرت ہے۔ گویا وہ مکارمِ اخلاق کی براہِ راست اور بالواسطہ طور پر تعلیم و تربیت دیتی ہیں۔یہی پیغام ان کا اپنے قاری کے لیے بھی ہے۔

تاجر کامیاب ہے وہی جو
جھوٹ کی منڈیاں سجائے گا

(ص:135)

وہ صدقِ دل،خلوص اور لگن کے ساتھ کام کرنے کی قائل ہیں جس میں صحیح معنوں میں عرق ریزی اور جانفشانی کا عنصر شامل ہو۔اس عمل سے کامیابی سے گزرنے کے بعد پھر وہ حوصلہ افزا امکانات و نتائج کی امید رکھتی ہیں۔ان کا رجائی کینوس بسیط و عریض ہے جس میں یقین و اعتماد کی فضا پائی جاتی ہے۔

میرا بھی شہرِ تمنا میں حوالہ ہو گا
جب مورخ کوئی سچ بولنے والا ہو گا

(ص:142)

شاہدہ لطیف کے افکار و تخیلات سے بہ تعین یہ حسن و خوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہ رجعت پسند یا قدامت پسند ہرگز نہیں ہیں لیکن اقدار و روایات سے محبت کرنا ایک الگ موضوع ہے۔ جسے قدامت پسند کی ذیل میں نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ جدید معاونات کی نہ صرف قائل ہیں بلکہ بھرپور استفادہ کی خواہاں ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں وہ جدید معاونات کے استعمال کی خواہش رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ہاں پیش بینی، پیش بندی اور پیش گوئی کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ خصوصاً شعبہء صحافت کے حوالے سے وہ یہ پیش گوئی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ فردائی ادوار میں نہ کوئی اخبار ہوگا اور نہ کوئی رسالہ ہوگا بلکہ لوگ صرف ریموٹ کے ذریعے دنیا کی خبر رکھیں گے۔

لوگ ریموٹ سے دنیا کی خبر رکھیں گے
کوئی اخبار نہ ہو گا نہ رسالہ ہو گا

(ص:142)

شاہدہ لطیف ادب کے دونوں نظریوں یعنی ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی قائل ہیں۔ ان کے ہاں کسی نوع کی انتہا پسندی اور افراط و تفریط نہیں ہے۔ ان کے ہاں ہر طرح کے شواہد فراوانی سے میسر ہیں۔ مگر ان کے ہاں نظریہء زندگی کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی امکانات پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کے حوالے سے مختلف تصورات و نظریات ملتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی ایک غزل جس کی ردیف ”ہے زندگی“ ہے، نظریہء ادب برائے زندگی کی حامل ہے جس کا تذکرہً تنگ و تازِ حیات بھی ہے، عکسِ یقین و گماں بھی ہے، سنگینیوں اور کٹھنائیوں کا ذکر بھی ہے، امتحانوں کا حوالہ بھی ہے، زندگی کے بادباں کے کھلنے اور بند ہونے کی بات بھی ہے، زمین تا آسماں اس سلسلے کی درازی کا مذکور ہے، گل و خار اور گلستاں کے استعاروں سے زیست کو نوازا گیا ہے، کبھی زندگی درد کے روپ میں ہے تو کبھی فغاں کی حالت میں ہے، کبھی خوش بیانی سے منسوب ہے تو کبھی ترجمانی سے موسوم ہے، کبھی غبارِ راہ ہے تو کبھی کارواں ہے، زیست کے پہلو بہ پہلو کشتِ مکارمِ اخلاق کی

آبیاری بھی کی جا رہی ہے، اسے جسم اور سانس کا رازداں قرار دیا گیا ہے، کبھی اس کا مقام خواہش اور خواب کے درمیان ہے تو کبھی رباعی کا استعارہ دیا گیا ہے، تو کبھی داستان کا روپ بخشا گیا ہے ۔۔۔اگر نظر اٹھا کر دیکھا جائے تو زندگی کی بے کرانی اور وسعت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بحر ہزج مربع مقبوض میں کہی گئی ان کی غزل مذکورہ تناظر میں قابلِ ذکر ہے۔

رواں دواں ہے زندگی
یہاں وہاں ہے زندگی
کبھی کبھی یقین ہے
کبھی گماں ہے زندگی
ہیں مشکلیں ہی مشکلیں
اک امتحاں ہے زندگی
کبھی کھلا ، کبھی نہیں
یہ بادباں ہے زندگی
گویا زمیں کا سلسلہ
تا آسماں ہے زندگی
ہیں اس میں گل بھی خار بھی
یہ گلستاں ہے زندگی
خوش بیاں ہے زندگی
ترجماں ہے زندگی
ہے غبار اِدھر اُدھر
کارواں ہے زندگی
مہر سے ہوں گرم آپ
مہرباں ہے زندگی

جسم اور سانس کی
رازداں ہے زندگی
خواہش اور خواب کے
درمیاں ہے زندگی
ہے کوئی رباعی یا
داستاں ہے زندگی
شاہدہ نظر اٹھا
بے کراں ہے زندگی

(ص:143-144)

شاہدہ لطیف کے شعری بیانیے میں مرورِ ایام کا کرب اپنی پوری آب وتاب سے پایا جاتا ہے۔ان کے ہاں آموزشِ عصر کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ جولوگ عصری مقتضیات کا ساتھ نہیں دے پاتے، آشوبِ عصر کے باعث خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔

کانٹوں پہ کیسے پھینک دیا ان کو دہر نے ؟
عادی تھے لوگ جبکہ گلوں کے مساج میں

(ص:149)

ان کے ہاں جہاں بھی نسائیت کا اظہار ہوتا ہے، بھرپور طریقے سے ہوتا ہے۔ان کے ہاں نسوانیت کے پہلو بہ پہلو مشرقیت کا رنگ بھی ضو پاشیاں کر رہا ہے اور اس کی وسعت کا اظہار کیا گیا ہے۔وہ اپنے آپ کو دخترِ حاتم تو نہیں سمجھتیں مگر اپنا شمار اہلِ سخا میں بھی کرتی ہیں۔ دخترِ حاتم کا اختراعی مرکب بھی اسلوبیاتی ندرت کا مظہر ہے۔اہلِ زمانہ کی روش انہیں محوِ حیرت واستعجاب کر دیتی ہیں۔بحرِ رمل مثمن محذوف کے چند اشعار اسی نسبت سے لائقِ توجہ ہیں۔

گھر کی عزت بھی ہوں میں آنچل کی حرمت بھی ہوں میں

شاعری اپنی جگہ ہے ایک عورت بھی ہوں میں
مصر سے ایران اور عراق تک پھیلی ہوئی
مشرقی اقدار کا رنگِ ثقافت بھی ہوں میں
دخترِ حاتم نہیں لیکن ہے کچھ ایسا مزاج
ہر گھڑی آمادۂ رسمِ سخاوت بھی ہوں میں
شاہدؔہ اس مختصر سی زندگی کے کھیل میں
دیکھ کر دنیا کی چالیں محوِ حیرت بھی ہوں میں

(ص:150)

شاہدؔہ لطیف کے کلام میں پندارِ انا کے فوائد و ثمرات وافادی پہلو سامنے آتے ہیں کیونکہ اہلِ انا کو جہاں کے مخالف رویوں کا زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی موضوع کو انہوں نے بڑے خوب صورت فطری اور تمثیلاتی انداز میں پیش کیا ہے۔

جو اونچا پیڑ ہے اس سے ہوا الجھتی ہے
نظر میں صاحبِ پندار پہلے آتا ہے

(ص:155)

ان کے شعری کینوس میں جا بجا پندارِ انا اور مضبوط حصارِ ضبط کے حوالے ملتے ہیں۔ وہ اپنے مسائل اور خامیوں کو مکنونِ خاطر قرار دیتی ہیں اور ان کی رازداری کا یہ پہلو تمام تر حیات بلکہ بعد از حیات تک محیط ہے۔

سہوں گی میں خموشی سے اذیت اپنے سینے کی
کسی محفل میں زخموں کو زباں ہونے نہیں دوں گی

(ص:156)

درویشی و استغنا ان کی فطری خصوصیات ہیں۔ مادیت کا کوئی بھی لوبھ ان کے من میں نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو اسیرِ آرزو نہیں سمجھتیں اور قناعت کی دولت پر اکتفا کرتی ہیں۔ نہ وہ

خواہشات کی غلام ہیں اور نہ ہی خواہشات ان کی کمزوری ہیں۔حرص و ہوس جیسے سماجی عوارض و خبائث سے مبرا و ماورا ہیں۔ وہ کسی قسم کے لوبھ اور لالچ کو اپنے قریب ہی نہیں بھٹکنے دیتیں۔ بحر ہزج مثمن مقبوض میں کہے گئے ان کی غزل کے دو اشعار اسی نسبت سے زیبِ قرطاس ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن'' ہیں۔

قناعتوں نے ایسی مجھ کو راحتیں نصیب کیں
میں خود کو خواہشات کی غلام کر نہیں سکی
میں اعتراف کر رہی ہوں وادیء ہوس کبھی
عبور کر نہیں سکی، مدام کر نہیں سکی

(ص:159)

شاہدہ لطیف کی شاعری میں عصری آشوب کے فزوں تر شواہد ملتے ہیں۔مگر انہیں شکوہ ہے کہ یہ مصائب و آلام چشمِ فلک سے پوشیدہ کیوں ہیں۔چشمِ فلک ان کا نظارہ کیوں نہیں کرتی۔ دراصل یہ بھی قدرت سے ایک قسم کے شکوے کا ایک کلاسیکی انداز ہے کیونکہ متقدمین یا کلاسک شعرا شکوے کے اظہار کے لیے گردوں، آسمان اور فلک جیسے استعارون کو بروئے کار لاتے ہیں۔گویا ان کے سخن میں کلاسیکیت کی روح کارفرما ہے۔انہوں نے روایت سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ادبی حوالے سے ان کے معتبر ہونے کی یہ ایک معتبر دلیل ہے۔

کیا دیکھتی کبھی نہیں چشمِ فلک اسے؟
برپا جو روز ہوتا ہے محشر زمین پر

(ص:160)

ان کے کلام میں لوک داستانوں کا رنگ بھی ملتا ہے۔خصوصاً ایسی داستانیں جو عموماً سینہ بہ سینہ، نسل در نسل سفر کرتی رہی ہیں۔ جیسے بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ چاند پر ایک بڑھیا رہتی ہے جو چرخہ کات رہی ہے۔بحرِ وافر مثمن محذوف میں ان کی غزل کا یہ شعر دیکھیے جس کا عروضی وزن ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن مفعولن'' ہے۔

کتنا چرخہ کات لیا ہے اس نے لوگوں کی خاطر؟
اک دن چاند میں رہنے والی بڑھیا سے جا ملتے ہیں

(ص:161)

ہر انسان کی زندگی کے حوالے سے مختلف توقعات وترجیحات ہوتی ہیں لیکن ہر کسی کی زیست امیدوں پر پوری نہیں اترتی۔ کچھ لوگوں کی حیات ان کی آرزوؤں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ جب کہ کچھ لوگوں کا جیون ان کی خواہشات کی ترجمانی نہیں کر پاتا اور یوں ہی گزر جاتا ہے۔اسی فکر کی ترجمانی انہوں نے کچھ یوں کی ہے۔

زندگی جیسے کوئی حسیں خواب تھی
زندگانی کے دن یوں بسر ہو گئے

(ص:162)

شاہدہ لطیف کا شعری بیانیہ لایعنیت اور عدم مقصدیت کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ وہ بے عملی کے سخت خلاف ہیں اور بے عمل طبقے کو سخت تنقید کا نشانہ بناتی ہیں۔ جب زندگی بے عمل طبقے کی موافقت نہیں کر پاتی پھر وہ خودکشی کا شوق پال لیتے ہیں۔ گویا شاعرہ ممدوحہ کے ہاں سماج کی اصلاح وفلاح کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

تمام عمر تمہیں خودکشی کا شوق رہا
ذرا سا کام تم لوگ کر نہیں گزرے

(ص:164)

وہ خلقِ خدا کے حوالے سے نرم گوشہ رکھتی ہیں اور ان سے نرمی کا معاملہ چاہتی ہیں۔ حتیٰ کہ پرندوں سے بھی انہیں شدید نوعیت کی موانست ہے۔ اس لیے وہ اشجار کے کٹاؤ کے سخت خلاف ہیں کیونکہ درختوں پر پرندوں کے گھونسلے ہوتے ہیں۔ شعر ھذا میں یہی فکر کارفرما ہے۔

پیڑ کو کاٹنے والو! ذرا ٹھہرو، سوچو
ان درختوں میں پرندوں کے بھی گھر ہوتے ہیں

(ص:165)

مظاہرِ فطرت کا فزوں تر استخدام ان کے کلام کے فطری رچاؤ کو آشکار کرتا ہے۔ یوں ان کا سخن سراپا آمد محسوس ہتا ہے۔ تصنع و تکلف جیسی آلائشیں گریزاں نظر آتی ہیں۔ مظاہرِ فطرت کو کسی غزل کی ردیف کے زمرے میں رکھنا یقیناً کارِ استادی بھی ہے کیونکہ غزل کی فکری مقتضیات کو پورا کرنے کا عمل خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔ جسے انہوں نے خوبصورت اور بھرپور انداز میں نبھایا ہے۔ اس امر کا اندازہ آپ خود ہی بخوبی لگا سکتے ہیں۔ غزل ملاحظہ کریں۔

گلشن کو پھیلا دیتے ہیں تتلی، بھنورے ، پھول
کتنے رنگ سجا دیتے ہیں تتلی، بھنورے، پھول
گلشن گلشن شعلوں جیسے گل کے لاکھوں روپ
آتش سی بھڑکا دیتے ہیں تتلی، بھنورے ، پھول
پلک جھپک میں بدل سے جاتے ہیں منظر سارے
نظروں کو دھوکہ دیتے ہیں تتلی، بھنورے، پھول
آنکھوں میں تصویریں جم جاتی ہیں منظر کی
قوس قزح لہرا دیتے ہیں تتلی، بھنورے، پھول
صحنِ گلستاں کا کوئی گوشہ ہو یا کنج
پلکیں تک ٹھہرا دیتے ہیں تتلی، بھنورے، پھول
کبھی کبھی جو سیرِ چمن کو شاہدہؔ جاتی ہوں
قدم قدم چونکا دیتے ہیں تتلی، بھنورے، پھول

(ص:167)

شاہدہؔ لطیف نے مختصر، متوسط اور طویل ردیفوں کا استخدام بہ حسن و خوبی کیا ہے جس کے باعث ان کی قادرالکلامی قابلِ داد ہے۔ البتہ ان کے ہاں غیر مردف غزلیات معدوم ہیں۔ کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی آشنا ہیں کہ غیر مردف غزل میں تغزل کی روح مجروح ہوتی ہے لیکن تحقیقی و

تنقیدی اور تجزیاتی پہلو کے اعتبار سے ایک سخن ور کے ہاں ہر نوع کے تجارب کا ہونا ناگزیر ہے۔

ان کے ہاں تلخ حقیقت پسندی بھی نمو پذیر ہوتی ہے۔خصوصاً وہ نئی نسل سے مطمئن نظر نہیں آتیں کیونکہ نسلِ نو لایعنیت اور عدم مقصدیت کا شکار ہے جس کا انہیں شدید قلق ہے۔جس کا اظہار انہوں نے کچھ یوں کیا ہے۔درج ذیل شعر بحر ہزج مثمن مقبوض میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن'' ہے۔واضح رہے کہ ''مفاعلن'' مفاعیلن کی مقبوضی حالت ہے۔

عجب عجب کہاوتوں کے ڈھیر لا کے رکھ دیے
ہماری نسلیں ہم کو اعتبار دے نہیں سکتیں

(ص:169)

جب وہ رشتوں اور رفاقتوں سے مایوس ہو جاتی ہیں تو ان سے بے نیاز دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی ان کا پندارِ انا اور مضبوط و مستحکم نوعیت کا حصارِ ضبط مکمل طور پر مستعد ہو جاتا ہے۔پھر ان کے ہاں حیرت و استعجاب کے تلازمات نمودار ہوتے ہیں۔یوں استفہامیہ اشارات میں وہ سماج کو ہدفِ تنقید بھی بناتی ہیں۔بحر رمل مثمن محذوف میں ان کی غزل کا مطلع اور ایک شعر اسی تناظر میں قابلِ غور ہے جن کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔واضح رہے کہ ''فاعلن'' فاعلاتن کی محذوفی حالت ہے۔

کوئی رشتہ بھی نہیں، کوئی رفاقت بھی نہیں
اب مجھے حرفِ تسلی کی ضرورت بھی نہیں
کس عجب حال میں زندہ ہیں یہ سادہ بندے؟
سکھ کی صورت میں نہیں، حالتِ وحشت بھی نہیں

(ص:170)

شاہدہ لطیف کے ہاں مضبوط حصارِ ضبط کی عکاسی ہوتی ہے جہاں حقیقی صورتِ حال کی غمازی بھی ہوتی ہے۔اس کیفیت کی ترجمانی انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے ہوتی ہے مگر اس

حوالے سے انفرادی تناظر زیادہ وسعت آمیز ہے کیونکہ اس کے بغیر اجتماعی پس منظر کا توانا ہونا ممکن ہی نظر نہیں آتا۔

خود اپنی آگ میں جلنا بھی، صبر بھی کرنا
اب اس سے بڑھ کے جہاں میں کوئی عذاب نہیں
خدا کی رحمتِ بے حد کے منتظر ہیں لوگ
اب انتظار کی خلقت میں تاب نہیں

(ص:171)

اسی فکری تسلسل کی ترجمان ان کی ایک اور غزل کا یہ شعر بھی ہے۔

شہرت بکھیر دیتی ہے ضبطِ وجود کو
رہنا حصارِ عمر میں گم نام چاہیے

(ص:173)

وہ ابنائے ملک وملت کو عزیز از دل وجاں سمجھتی ہیں اور ان کے تحفظ و پاسداری کو ناگزیر خیال کرتی ہیں۔ان کا موقف یہ ہے کہ اگر انسان کو قدر ومنزلت میسر ہو تو اسے غرور وتکبر کی بجائے اسے عجز وانکسار کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔وہ گوشہ نشین لوگ جو بالیدہ فکری کے حامل ہیں،ان سے ربط وضبط اور مشاورت انتہائی ضروری ہے۔

آوارگانِ شہر بھی ماؤں کے لعل ہیں
مٹی سے موتیوں کو اٹھا لینا چاہیے
دستار میں لگا ہوا طرہ بھی خوب ہے
عزت ملے تو سر کو جھکا لینا چاہیے
گوشہ نشیں جو واقفِ رازِ حیات ہیں
ان سے بھی ربط و ضبط بڑھا لینا چاہیے

(ص:174)

شاہدہ لطیف کے افکار میں مشرقی عورت کے مصائب و آلام کی داستاں سوز و گداز کی حاشیہ آرائی میں ملتی ہے۔ یوں ان کا شعری کینوس حزنیہ رنگ اختیار کر جاتا ہے۔ وہ دخترِ مشرق کے غم و الم اور سماجی جکڑ بندیوں کی شکایت بھی کرتی ہیں۔ مغربی عورت کی بے لگام آزادی اور بے راہ روی کے خلاف ہیں۔ گویا ان کی فکر میں توازن کا پہلو بھی کارفرما ہے جس میں کسی نوع کی افراط و تفریط کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بحر رمل مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا مطلع قابلِ توجہ ہے جس کے عروضی ارکان ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہیں۔

مشرقی لڑکی کا ٹوٹا خواب ہوں
یعنی جو گہنا گیا، مہتاب ہوں

(ص:177)

تمام تر سماجی جکڑ بندیوں کے باوجود وہ اپنے افکار و محسوسات، جذبات و مشاہدات، کردار و شخصیت اور اپنے مزاج کے حوالے سے کسی نوع کے سمجھوتے کی روادار نہیں ہیں۔ یہی امر ان کی بالیدہ فکری کی مبینہ دلیل ہے اور انہیں دیگر سخن ورانِ عصر سے ممتاز و منفرد بھی کرتی ہے۔

مجھ کو رہنے دیا تھا زیرِ زمیں
پھر بھی سونے کی کان بن کے رہی
میں نے قائم رکھا وقار اپنا
عمر بھر عالی شان بن کے رہی

(ص:178)

وہ سماج سے ملنے والے خراجِ تحسین اور حوصلہ افزائی سے مطمئن و قانع نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں مقامِ اعتبار حاصل ہے اور اہلِ عصر انہیں ادبی حوالے سے نگاہِ استحسان سے دیکھتے ہیں۔ ان کا دماغ مسلسل محوِ سفر رہتا ہے اور یہی ان کا روبہ ارتقا ہونے کا راز بھی ہے۔ یہی ان کی تمنا بھی ہے۔

یہی بہت کہ مجھے آبرو کے حرف ملے

نگاہِ عصر ، تری چشمِ معتبر میں رہوں
دماغ میرا مسلسل سفر میں رہتا ہے
مسافتوں میں رہوں یا میں اپنے گھر میں رہوں

(ص:189)

شاہدہ لطیف کی فکریات میں ادبی حوالے سے کلاسیکیت کی روح کارفرما ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کلاسیکی ادب سے اکتسابِ فیض و ہنر کیا ہے۔ ان کے ہاں حقیقت پسندی کے تلازمات تجزیاتی انداز میں ملتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ رفتگاں کے بعد نہ ادب کا کوئی وقار اور بھرم رہا نہ ہی فن کی کوئی قدر و قیمت رہی۔ اس نوع کے اظہار سے وہ ادبی حوالے سے کلاسیکی اقدار کا احیا چاہتی ہیں جو ان کے تخلیقی ارتقا کی مبینہ علامت ہے اور معاصر ادب کی لایعنیت و عدم مقصدیت کا اظہار بھی ہے جو ان کے تحقیقی و تنقیدی شعور کی توضیح و تصریح ہے۔ اس نوع کا طرزِ احساس معاصر شاعرات میں شاذ ہی ملتا ہے۔

جب سے وہ رفتگاں گئے بزمِ سخن کو چھوڑ کے
اہلِ ہنر بھی کم ہوئے، ہو گئی قدرِ فن بھی کم

(ص:179)

ان کا شعری اظہار بے لاگ نوعیت کا ہے جسے ان کی اظہاری جسارت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو دیگر شاعرات میں فقدان کا شکار ہے۔ اس حوالے سے شاعرہ موصوفہ لائقِ تحسین ہیں کیونکہ ان کے ہاں عصری رویے کسی لگی لپٹی کے بغیر ملتے ہیں۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں ان کی غزل کا یہ شعر اسی حوالے سے ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

خلوصِ دل سے حالاتِ جہاں پر
کیے ہیں تبصرے بے لاگ میں نے

(ص:180)

ان کی فکر کی گہرائی و گیرائی کا یہ عالم ہے کہ وہ منطق کی مقصدیت کی تو قائل ہیں لیکن منطق

کی لایعنیت و عدم مقصدیت کی مذمت کرتی ہیں۔ اس حوالے سے وہ باخبر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

یہ منطقیں ہمیں گمراہ بھی کر سکتی ہیں
ہے دن تو دن ہی رہے اس کو رات مت کیجئے

(ص:184)

شاہدؔہ لطیف کے ہاں تخلص کے استعمال کی عمدگی پائی جاتی ہے۔ یوں وہ اسمِ بامسمیٰ دکھائی دیتی ہیں۔ بہت ہی کم اہلِ سخن اپنے تخلص کا صحیح استعمال کر پاتے ہیں مگر انہیں اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے تخلص کو قرینہ کاری سے برتا ہے۔

شاہدؔہ نام کی ہے شاہدہ، ایسا نہ سمجھ
معترف ہوں میں زمانے تری فن کاری کی

(ص:186)

ان کے ہاں دنیا و عقبیٰ ہر حوالے سے افکار ملتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ہمہ جہت شاعرہ ہیں۔ ان کا شعری کینوس وسیع الموضوعات اور کثیر الجہات ہے۔ اس سے یہ انداز ہوتا ہے کہ مذہبی حوالے سے معاملاتِ آخرت سے بے خبر نہیں ہیں جبکہ دنیا سے وہ امن و آشتی کی توقع رکھتی ہیں۔ مثالی دنیا کا خواب دیکھتی ہیں۔ وہ جدید معاونات اور سائنسی ایجادات پر بھی یقین رکھتی ہیں۔

جب کہا جائے گا تسلیم کرو اپنی خطا
ایسے عالم میں زبانوں ہی پہ تالے ہوں گے
امن ایسا بھی کبھی آئے گا اس دنیا میں
جب کہیں تیر نہ شمشیر نہ بھالے ہوں گے
نت نئی سائنسی ایجادوں پہ تکیہ ہو گا
نہ کتب ہوں گی میسر نہ رسالے ہوں گے

(ص:187)

اب ہم ان کے تیسرے شعری مجموعہ ''معرکہء کشمیر'' مطبوعہ جولائی 2001ء کے توسط سے ان کے شعری بیانیہ کے نفسِ مضمون کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مجموعہ ھذا کی غزلیات کے منتخب اشعار بطور استشہادات برائے استخراجات شاملِ شذرہ ہوں گے۔ مجموعہ ھذا کشمیریات کے تناظر میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے جس میں جدوجہد آزادیء کشمیر اور جذبہء حریت کے پسِ منظر میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

دنیا کے مختلف خطوں میں امتِ مسلمہ جبر و جور کا شکار ہے اور بنیادی حقوق سلب ہیں۔ اس لیے ابنائے ملت محوِ اضطراب ہیں۔ خصوصاً فلسطین، بوسنیا اور کشمیر بدترین بربریت کے حصار میں ہیں۔ فطری اور عالمی اقدار و روایات کے مطابق ہر انسان کا بنیادی حق آزادی ہے جس سے وہ محروم ہیں کیونکہ طاغوتی طاقتوں نے مختلف علاقوں میں زبردستی اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ اسی حساسیت کا مظہر ان کی غزل کے یہ دو اشعار ہیں۔ یہ اشعار خالصتاً کشمیر کے تناظر میں ہیں۔

یہ ظلم و جور جتنا بھی سرحد کے پار ہے
کرتا ہمارے دل کے یہ ٹکڑے ہزار ہے
حساس ہے جو دل وہ تڑپتا ہے ظلم پر
جو آنکھ جبر دیکھتی ہے اشکبار ہے

(ص:30)

شاہدہ لطیف کا تخلیق کردہ ادب مقصدیت کا علمبردار ہے اور اس امر کا انہیں بخوبی ادراک بھی ہے جس پر وہ فاخر و نازاں بھی ہیں۔ ان کی ادبیات میں عدم مقصدیت اور لایعنیت کا وجود عنقا ہے۔ ان کے ہاں جمالیاتی اقدار و روایات کی پاسداری ملتی ہے۔

متاعِ حرف کو ارزاں نہیں کیا ہم نے
کوئی بھی حرف کبھی رائیگاں نہیں لائے
جہاں نہ پھول کھلیں اور نہ کہکشاں چمکے
خیال میں بھی ہم ایسا جہاں نہیں لائے

(ص:59)

وہ آزادیءِ کشمیر کے حوالے سے دعائیہ طرزِ کلام رکھتی ہیں کیونکہ آزادی ہی کشمیریوں کے مصائب و آلام کا مداوا ہے۔ وہ کسی قسم کی ثالثی، کونسل اور سمجھوتے کی قائل نہیں ہیں۔ بحر متقارب مثمن سالم میں ان کی ایک غزل کا ایک مطلع اور ایک شعر اس حوالے سے قابلِ ذکر ہے۔

یہ درد اے خدا، اب دوا چاہتے ہیں
کہ کشمیری اپنی بقا چاہتے ہیں
نہ ثالث، نہ کونسل، نہ سمجھوتہ کوئی
خدا کا لکھا فیصلہ چاہتے ہیں

(ص:75)

ہمارے قلب و خرد پر ظلمت اور تاریکیوں کا تسلط ہے۔ گویا ہماری نفسیات آسیب زدہ محسوس ہوتی ہیں۔ بیم و یاس ہمارے حواس پر حاوی ہے جس نے ہمارے رنگِ تمنا کو ماند کرنے کے بجائے معدوم کر دیا ہے۔ خدا جانے قسمت ہمیں کیسی سحر کی نوید سناتی ہے کیونکہ اہلِ درد گھائل بھی ہیں اور بے حد نڈھال بھی ہیں۔

سورج طلوع ہو بھی تو اکثر نہ جانے کیوں
ہوتا نہیں سحر کا مجھے احتمال بھی
اس تیرگی نے رنگِ تمنا چرا لیا
میں اوڑھ کر چلی ستاروں کی چال بھی
قسمت میں جانے کیسی سحر کی نوید ہو
گھائل بھی اہلِ درد ہیں بے حد نڈھال بھی

(ص:80)

شاہدہ لطیف کو اس امر کا افسوس ہے کہ ہم ابھی تک آزادیءِ کشمیر کے حوالے سے کوئی قابلِ ذکر کردار ادا نہیں کر پائے کیونکہ ہم امنِ عالم پر تو یقین رکھتے ہیں مگر ہماری تقریریں بے اثر ہوتی

ہیں جس کی بنیادی وجہ آزادیٔ کشمیر کے حوالے سے خلوص کا فقدان ہے۔

عالمی امن پہ رکھتے ہیں یقیں سب لیکن
بے اثر ہوتی ہیں بے وقت کی تقریریں بھی

(ص:95)

وہ کشمیر سے اپنے تعلق کو واضح کرنے کے لیے اساطیری تلمیحات کا سہارا لیتی ہیں جس سے ان کی رومانی اور روحانی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ خدائے سخن میر تقی میرؔ سے بھی وہ موانست رکھتی ہیں۔ انھیں عاجزی وانکساری مطلوب ہے۔ اعزاز وافتخار اور غرور وتکبر سے انھیں کوئی غرض نہیں ہے۔

جس طرح کہ رانجھے کا رہا ہیر سے رشتہ
اے میرے وطن تیرا ہے کشمیر سے رشتہ
ہوں نذر خدائے سخن، اعزاز ہے میرا
پروانے ہی کی طرح سہی میرؔ سے رشتہ
تکریم کی، دنیا سے طلب گار نہیں میں
رکھتی ہوں فقط اپنی ہی توقیر سے رشتہ

(ص:121)

وہ مفلوک الحال طبقے کی وکالت کرتی ہیں اور اہلِ ثروت کو بھرپور انداز میں ہدفِ تنقید بناتی ہیں۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر طالبِ التفات ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

خبر کیا خاک امیرِ شہر کو ہے
امیرِ شہر تو ستا رہا ہے

(ص:127)

انھیں فلسطینی بھائیوں کا احساس بھی ہے اور کشمیریوں کے حقوق کی فکر بھی ہے۔ وہ صرف

اپنی ذات کے حصار میں مقید نہیں ہیں بلکہ دکھی انسانیت کو بھی یاد رکھتی ہیں۔ بحر ہزج مثمن سالم میں ان کی ایک غزل کے دو اشعار جن میں مطلع بھی شامل ہے، اسی فکری تاثر کے حامل ہیں۔

فلسطینی مصائب کا ہر ایک غم یاد رکھتے ہیں
مگر کشمیر کے زخموں کو پیہم یاد رکھتے ہیں
نہیں ہم شادماں ہوتے فقط اپنی ہی خوشبو سے
دکھی مظلوم انسانوں کے بھی غم یاد رکھتے ہیں

(ص:130)

وہ دہشت گردی کو انسانیت کے لیے ایک بہت بڑا ناسور سمجھتی ہیں جس کے باعث محبت کے رشتوں کی بساط لپٹتی جا رہی ہے۔ اس عہدِ پر آشوب میں انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ ارتقا کا کیسا سفر ہے جس کے باعث ارض و سما پریشان و مضطرب ہیں۔ قتل و غارت کے اس ماحول میں انسان درندہ صفت ہو گیا ہے۔ بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ان کی غزل کے یہ تین اشعار اسی پس منظر کے حامل ہیں جن کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہیں۔

یہ دہشت ، یہ بارود کی بارشوں سے
محبت کے رشتے فنا ہو رہے ہیں
یہ کس سمت میں ہے سفر ارتقا کا؟
پریشان ارض و سما ہو رہے ہیں
لہو پی رہے ہیں جو اک دوسرے کا
یہ انساں درندہ نما ہو رہے ہیں

(ص:131)

شاہدہ لطیف زندگی کی میکانیت سے سخت نالاں ہیں کیونکہ اس نے انسانی احساسات کو پس پشت ڈال دیا ہے اور انسان ایک مشینی روبوٹ بن گیا ہے۔ ایسے ماحول میں تخلیقی سرگرمیاں کیسے جاری رکھی جا سکتی ہیں۔

لوگ احساس سے عاری ہیں مشینوں کی طرح
ایسے ماحول میں کیا شعر سنایا جائے ؟

(ص:136)

وہ آزادیء کشمیر کے تناظر میں عالمی ضمیر کو بیدار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ عالمی سوچ میں تغیرات وانقلابات لانا چاہتی ہیں۔ ان کا موقف یہی ہے کہ آزادی کشمیریوں کا بنیادی حق ہے اور ان کو اس بنیادی حق سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔

عالمی اقوام کو سوچیں بدلنا چاہئیں
جس کا ہے اس کو ہی اس کا حق دلانا چاہیے

(ص:161)

مقبوضہ کشمیر کی بدامنی و بدحالی کے باعث انہیں جمالیاتی اقدار کی زبوں حالی کا قلق ہے کیونکہ وہاں فصلِ گل کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہاں خزاں کا دائمی تسلط محسوس ہوتا ہے۔

خوشبو کا کوئی پل کوئی لمحہ نہیں ہوتا
وادی میں کوئی پھول شگفتہ نہیں ہوتا

(ص:173)

ان کے ہاں ایک مزاحمتی اور انقلابی فکر بھی کارفرما ہے جس کی وہ تواتر و تسلسل کے ساتھ آبیاری کررہی ہیں۔ ان کی شاعری میں عزم وحوصلے کی ایک نئی نوید ملتی ہے۔ ان کی شعریات میں مصائب وآلام اور سنگینیوں سے مانوسیت کا ایک سندیس ملتا ہے۔ بقول راقم:

جو طوفانوں میں پلتے ہیں
وہ دنیا کو بدلتے ہیں

اسی فکری تسلسل کا اظہار ان کے ہاں کچھ یوں پایا جاتا ہے۔

ان کو ساحل کی تمنا نہیں ہوتی ہرگز
زندگی جن کی گزر جاتی ہے طوفانوں میں

(ص:175)

شاہدہ لطیف خدمتِ خلق کو اپنا شعار سمجھتی ہیں اور مادیت پسندرویوں سے گریزاں ہیں۔ وہ اپنے دعائیہ طرزِ کلام میں بھی خدائے بزرگ و برتر سے گویا ہیں کہ میں تیری بارگاہ میں زر و مال کی طالب نہیں ہوں بلکہ میری استدعا ہے کہ اے میرے خدا مجھے اپنی مخلوق کی خدمت کے لائق بنا دے۔ بحر رمل مثمن محذوف میں ان کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ کریں جو مذکورہ تناظر میں ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

بارگہ سے تیری ، مال و زر کی میں طالب نہیں
خلق کی خدمت کے لائق اے خدا کر دے مجھے

(ص:179)

ان کی شعریات میں خوش آئند امر یہ ہے کہ ان کے ہاں آفاقیت کے حسین شواہد ملتے ہیں۔ جہاں وہ ہر نوع کی مذہبی ولسانی اور جغرافیائی حدود وقیود سے ماورا دکھائی دیتی ہیں۔

جی میں ہے شاہدہ اک عمر سے مقیم
دکھ ساری کائنات کے سہنے کی آرزو

(ص:191)

ان کے فحوائے بیاں کا معجزانہ پہلو یہ ہے کہ پاسِ وفا اور پاسِ انا کے تلازمات ایک ساتھ پائے جاتے ہیں جن کا ایک ساتھ عام طور پر ناممکن الوجود ہے اور صنعتِ تضاد کا درجہ بھی رکھتا ہے کیونکہ دونوں موضوعات کی نفسیات میں تضاد شامل ہے۔ یوں انہوں نے اظہار کی نادرہ کاری اور کرشمہ کاری کے باعث ناممکن کو ممکن کر دیا ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک مطلع ملاحظہ کریں جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

مجھے ہے شاہدہ پاسِ وفا بھی
انا کا بھی زیاں ہونے نہ دوں گی

(ص:196)

اب ہم ان کے چوتھے مجموعہءکلام ''برف کی شہزادی'' مطبوعہ جنوری 2004 ء کے حوالے سے ان کے شعری بیانیہ کے تناظر کو آگے بڑھاتے ہیں۔واضح رہے کہ مجموعہ ھذا ان کا پیرس کے حوالے سے منظوم سفرنامہ بھی ہے۔منظوم سفرنامہ کی صورت میں شعری مقتضیات سے عہدہ برآ ہونا یقیناً ایک دشوار عمل ہے جس سے شاہدؔہ لطیف بہ حسن وخوبی گزری ہیں۔

شاہدؔہ لطیف کے فکر وفن کا نقطہءعروج یہ ہے کہ ان کے ہاں معرفت ومجاز کے تلازمات مربوط محسوس ہوتے ہیں۔یعنی ان کے ہاں دیش بھگتی کے شواہد بھی اپنے پورے کروفر سے ملتے ہیں۔حب الوطنی نہ صرف ان کی سرشت میں ہے بلکہ اسی شعور کی ترسیل وہ اپنے قاری کے لیے بھی کرتی ہیں۔بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ان کی غزل کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں جن کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

میں کیسے بھلاتی تمہیں اپنے دل سے
تصور تمہارے مرے ہم قدم تھے
وطن کی جدائی کا غم تھا سبھی کو
کہ یادوں کے مارے مرے ہم قدم تھے

(ص:49)

ان کے ہاں فکری وفنی حوالے سے مختلف النوع تجارب پائے جاتے ہیں۔جس سے ان کی قادرالکلامی آشکار ہوتی ہے۔یوں ان کے سخن سے حیرت واستعجاب کی نمو ہوتی ہے۔تحیر ان کے کلام کا خصوصی حوالہ ہے۔ درج ذیل غزل کے تین اشعار دیکھیے جن میں انہوں نے حروفِ استفہام کا التزام کیے بغیر استفہامیہ اشارات کی فضا پیدا کی ہے۔یوں ان کے سخن کا فلسفیانہ اورنفسیاتی وحسیاتی گراف بلند ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔یوں ان کا شعری کینوس گہرائی و گیرائی سے ہم کنار ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کچھ ایسے بھی لمحے ہیں زنجیر نہیں ہوتے
کچھ تاج محل ہیں جو تعمیر نہیں ہوتے

کچھ باتیں ہیں اسی جو کہتے نہیں خود سے
کچھ درد ہیں جو ہم سے تحریر نہیں ہوتے
کچھ ایسے منظر ہیں جو میرے سفر میں تھے
جو آنکھوں نے دیکھے تصویر نہیں ہوتی

(ص:54)

شاہدہ لطیف کی فکریات میں وقت کی اہمیت کا احساس بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ وقت ایک ایسا مرہم ہے جو اپنے زخم خود ہی بھرتا ہے۔ مگر کچھ یادیں ضرور رہ جاتی ہیں اور یہی یادیں ہی سرمایہ قرار پاتی ہیں۔ بحرِ اوفر مربع سالم میں ان کی غزل کے دو اشعار اسی نسبت سے طالبِ التفات ہیں جن کے عروضی ارکان ''مفعولاتن مفعولاتن'' ہیں۔

اک اک لمحہ مر جاتا ہے
کیسے وقت گزر جاتا ہے ؟
بس یادیں ہی رہ جاتی ہیں
گھاؤ تو سارا بھر جاتا ہے

(ص:55)

ان کے شعری بیانیے میں ان کا پندارِ انا ایک تندرست و توانا موضوع ہے جس سے ان کی مضبوط قوتِ ارادی اور مستقل مزاجی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں خود اعتمادی بھی ہے اور خود انحصاری بھی ہے۔ مذکورہ بالا بحر و وزن میں ان کی غزل کا ایک شعر زینتِ قرطاس ہے۔

ایک انا کے زور پہ ہم نے
کتنے دریا روک رکھے ہیں؟

(ص:60)

وہ زیست اور اس کی مقتضیات سے بخوبی آشنا ہیں اور ان کے ہاں ایک ایک احساسِ ذمہ داری اجاگر ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کو زندگی اور وقت کی سبک رفتاری کا بھی ادراک ہے۔ ان

کی ایک غزل کا مقطع اسی نسبت سے قابلِ توجہ ہے جو بحر متقارب مثمن سالم میں ہے جس کا عروضی وزن ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہے۔

ابھی شاہدہ کام کتنے پڑے ہیں؟
مگر زندگی بھاگتی جا رہی ہے

(ص:62)

شاہدہ لطیف کے افکار میں اپنی مٹی کی بو باس رچی بسی ہوئی ہے۔ وہ اپنی تہذیب وثقافت سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ وہ اپنے دیس کے الطاف واکرام کو ہمیشہ سراہتی ہیں۔ بحر رجز مربع سالم میں ان کا یہ شعر دیکھیے جس کے عروضی ارکان ''مستفعلن مستفعلن'' ہیں۔

مرے دیس تیری محبتیں
تیرا رنگ و بو مرے ساتھ ہے

(ص:85)

اسی فکری تسلسل اور روایت کا حامل ان کی غزل کا یہ مقطع بھی ہے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہے۔

وطن کی ایسی بیٹی ہے شاہدہ
کہ پیرس میں بھی عزت ہو رہی ہے

وہ حصولِ مقصد کے حوالے سے قربانیاں دینے کی قائل ہیں کیونکہ ایثار وقربانی کے بغیر کسی بھی شعبۂ حیات میں ارتقا کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اسی کیفیت کی خوبصورت پیشکش ان کے ہاں کچھ یوں ہے۔

ایسا سفر قبول نہیں راہِ شوق میں
جو دل میں درد پاؤں میں چھالے نہ دے مجھے

(ص:93)

ان کے ہاں عروضی تلازمات کا استخدام فنی چابکدستی کے پیرائے میں ملتا ہے۔ انہوں نے

مفرد و مرکب بحور میں انتہائی عمدگی سے سخن سنجی کی ہے۔ انہوں نے مفرد، مربع، مسدس اور مثمن ارکان کے حامل اوزان کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک مقطع جو خود میں سہلِ ممتنع کا رنگ لیے ہوئے ہے، مفرد رکن ''مفاعلاتن'' میں کہا گیا ہے۔ مفرد وزن میں شعر کہنا کمالِ فن کی علامت ہے کیونکہ ایک رکن میں تمام تر شعری مقتضیات سے عہدہ برآ ہونا یقیناً کارِ استادی ہے اور ان کی مشاقی کی دلیل ہے۔ یہ مقطع فکری و فنی دونوں لحاظ سے لائقِ تحسین ہے۔ یہ وزن بحر رجز سے یا بحر کامل سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہ شاہدہ تو
انا کا گھر ہے

(ص:101)

شاہدہ لطیف زندگی کے تمام تر شعبوں کے حوالے سے مسائل کا ادراک رکھتی ہیں چاہے ان کی نوعیت داخلی ہو یا خارجی۔ ان کی نگاہِ ژرف بیں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ جذبۂ رومان کے تناظر میں ہوس پرستی کی مذمت کرتی ہیں۔ ان کے رومانوی افکار سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ لوگرو ہوں اور وہ اپنے قارئین کو محبت کرنے کے اسرار و رموز سے آشنا کرتی ہوں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ آپ کا طرزِ عمل ایسا ہونا چاہیے کہ آپ کو کسی سے محبت کرنے کی بجائے لوگ بذاتِ خود آپ سے محبت کریں۔ شعر ھذا میں ان کی عمیق نوعیت کی حساسیت کارفرما ہے جس سے ان کی فکری گہرائی و گیرائی کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ یوں ان کے سخن کا فلسفیانہ اور نفسیاتی گراف رفعتوں سے آشنا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

محبتوں میں شکاری نہیں، رفیق بنو
مجھے نظر میں نہ رکھو، مری نظر میں رہو

(ص:111)

ان کی بالیدہ فکری انہیں حصارِ بیم و یاس میں مقید نہیں ہونے دیتی بلکہ وسیع تر رجائی امکانات ان کے لیے آغوش کشا نظر آتے ہیں۔ وہ پت جھڑ میں بھی فصلِ گل کی امید رکھتی ہیں۔

ان کے شعری کینوس میں بسیط و عریض بہاریہ تلازمات پائے جاتے ہیں جو کلاسیکی شاعری کی یاد تازہ کر جاتے ہیں۔ یوں ان کے جمالیاتی احساس کی نمو ہوتی ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر قابلِ غور ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہیں۔

خزاں کو کیسے عنوانِ غزل بے مدعا لکھوں؟
مری امید پھولوں سے، مرا رشتہ بہاروں سے

(ص:116)

ان کے نزدیک اشک گنجِ رائیگاں نہیں ہوتے بلکہ ان کی قدر و قیمت ہوتی ہے کیونکہ وہ کتھارسز کا ذریعہ ہوتے ہیں اور کتھارسز کی اہمیت وہی ہے جو زندہ رہنے کے لیے سانس کی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اشکوں کے بہتر استعمال کا آدرش دیتی ہیں۔ ان کی اہمیت جاننے کی دعوت و تحریک دی گئی ہے اور ان کے ضیاع سے روکا گیا ہے۔

ان موتیوں کی قدر نہیں جانتا کوئی
ذکرِ جفا پہ اشک بہانا بھی چھوڑ دے

(ص:120)

شاہدہ لطیف خود اعتمادی اور خود انحصاری کی قائل ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں ایک درسِ انا کارگر نظر آتا ہے۔ ان کا پیغام یہی ہے کہ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔ خلوص و وفا اور مروت ان کے نزدیک ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے جو مشیت کی طرف سے ہر کسی کو ودیعت نہیں کی جاتی۔ عصری مقتضیات کی جانکاری ان کے ادراکات کا حصہ ہے۔

تجھ کو خود کاٹنے ہوں گے یہ مسافت کے عذاب
وقت سونے کا نوالہ نہیں دے گا تجھ کو
گر نہ کی قدرِ وفا تو نے تو یہ وقتِ عزیز
پھر کوئی چاہنے والا نہیں دے گا تجھ کو

(ص:121)

وہ دورِ جدید اور اس کے تقاضوں سے بخوبی آشنا ہیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور زمانہ شناس شخصیت ہیں۔ ان کا مزاج فکری بالیدگی کا مظہر ہے لیکن وہ پرانی اقدار کی حمایت وستائش بہ حسن و خوبی کرتی ہیں۔

یہ دورِ نو ہے اس کے تقاضے بھی ہیں نئے
لیکن وفا کا ساتھ پرانا بھی ٹھیک ہے

(ص:122)

ان کے احساسات میں عصری بے حسی، خودغرضی اور مفاد پرستی کے فزوں تر امکانات ملتے ہیں اور یہ امکانات ان کے تجربات ومشاہدات کا حاصل ہیں کیونکہ وہ زمانہ شناسی کے وصف سے متصف ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ عصرِ حاضر میں خلوص ومروت کی بساط لپیٹ دی گئی ہے۔ بحر رجز مربع سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر بھی شاملِ استشہادات ہے جس کا عروضی وزن "مستفعلن مستفعلن" ہے۔

یہاں چاہو جتنی وفا کرو
کسی بے وفا سے صلہ نہیں

(ص:123)

شاہدہ لطیف کے تخیلات میں عزم وحوصلے کی شکتی کارگر نظر آتی ہے۔ وہ خدائے بزرگ وبرتر کے علاوہ کسی کی ذات پر بھروسہ نہیں کرتیں اور یہی خصوصیت انہیں ابنائے عصر سے ممتاز ومنفرد کرتی ہے۔ وہ حیاتِ ناپائیدار کی سنگینیوں اور کٹھائیوں کو خاطر میں نہیں لاتیں اور کسی پر تکیہ کرنے کی خود کو روادار نہیں سمجھتیں بلکہ وہ راہِ وفا میں صبر وتحمل سے کام لینے کی خواہش مند ہیں۔ اختلاف کے خلاف اور اتحاد ویکجہتی کی خواہاں ہیں۔ اسی ادراک کی ترسیل وہ اپنے پیمانہ ہائے اشعار میں کرتی ہیں۔

مشکل گھڑی میں کوئی نہ کام آئے گا ترے

اب اے نظر کسی کے سہارے نہ کر تلاش
راہِ وفا میں صبر و تحمل سے کام لے
دریائے اختلاف کے دھارے نہ کر تلاش

(ص:132)

ان کی شعری آواز اس عہدِ بے حس میں ایک صدائے خاراشگاف ہے جو خود میں تاثیرات کی فزوں تر کیفیات سموئے ہوئے ہیں مگر انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس عصرِ کور چشمی میں وہ ایک دیدہ ور ہیں اور اس امر کو ایک یادگاری حیثیت حاصل ہے۔

اس کور چشم شہر نے ہر موڑ پر
ہم صاحبِ نظر تھے تمہیں یاد آئے گا

(ص:142)

بچپن کی حسیں یادیں انسان کا قیمتی اثاثہ ہوا کرتی ہیں۔ جب بچپن گزر جاتا ہے تو انسان اس کی بازیافت کی سعیِ لاحاصل کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جس کا شرمندۂ تعبیر ہونا ناممکنات کا حصہ ہے۔ اسی فکری کی آئینہ بندی شاہدہ لطیف نے کچھ یوں کی ہے۔

میں اپنے ہی بچپن کو کہیں ڈھونڈ نکالوں
پر ہاتھ میں اب تک وہ کھلونا نہیں آیا

(ص:146)

اب ہم ان کے پانچویں مجموعہءکلام ”محبت ہو نہ جائے“ مطبوعہ جون 2006ء کے توسط سے ان کے شعری بیانیے کے سفر کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مجموعہ ھذا میں حمد و نعت کے علاوہ غزلیات و نظمیات شامل ہیں۔ البتہ زیادہ تناسب غزلیات کا ہی ہے۔ نظمیات میں پابند نظموں کی نسبت آزاد نظمیات کا تناسب کچھ زیادہ ہے۔ کتابِ ھذا بھرپور رومانوی حوالے کی حامل بھی ہے۔

شاہدہ لطیف نے شدتِ احساس اور زورِ بیاں کی نسبت سے مظاہرِ فطرت کا فزوں تر استخدام کیا ہے۔ وہ اس حوالے سے کامیاب بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یوں ان کا سخن فطری رچاؤ سے

ہم آغوش ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس میں تصنع و تکلف کی آسائشیں گریزاں نظر آتی ہیں۔ بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر خصوصی طور پر قابلِ توجہ ہے جس کے عروضی ارکان ''مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن'' ہیں۔

یہ درد کا خورشید، یہ احساس کا شعلہ
چمکا ہے سرِ شام، ابھی تک تو نہیں تھا

(ص:19)

توکل واستغنا اور درویشی و قناعت فکری حوالے سے ان کے خصوصی موضوعات ہیں۔ وہ ہر نوع کے حرص و طمع اور لوبھ جیسے سماجی عوارض سے مبرا و ماورا ہیں۔ وہ کم پر قناعت کرنے کی قائل ہیں اور زیادہ کی خواہش نہیں رکھتیں۔

اس دل میں روشنی ہو، یہی آرزو رہی
کب یہ کہا کہ شمس و قمر چاہیے مجھے ؟

(ص:21)

ان کے شعری بیانیے میں فلاح واصلاح، خلوص و مروت اور نیکی و محبت کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں خیر کی دعوتِ عام کا ایک پہلو پایا جاتا ہے۔ وہ رفاقتوں میں نیک کام کرنے کی قائل ہیں اور وہ محبتوں کا احترام بھی چاہتی ہیں۔

رفاقتوں میں کوئی نیک کام بھی تو کرے
محبتوں کا ذرا احترام بھی تو کرے

(ص:41)

شاہدہ لطیف ہمیشہ نئی منزلوں کی متلاشی رہتی ہیں۔ دراصل یہی ان کا رازِ ارتقا بھی ہے۔ آگے بڑھنے کی خواہش انہیں محوِ تگ و تاز رکھتی ہے۔ ان کا عزم و حوصلہ رفعتوں سے ہم آغوش ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بحر متقارب مثمن سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر قابلِ توجہ ہے جس کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہیں۔

مسافر ہیں ہم تو نئی منزلوں کے
ہماری نظر میں جہاں اور بھی ہیں

(ص:45)

ان کی جرات وجسارت قابلِ داد ہے۔ناممکن کا لفظ ان کی لغت میں نہیں ہے۔اسی ہمت و حوصلے کا آدرش ان کا اپنے قارئین کے لیے بھی ہے۔بقول راقم:

گر چاہے صحرا میں انساں
کر آباد نگر سکتا ہے

انہوں نے اسی فکری روایت کو یوں نبھایا ہے۔

اگر ہمت ہے انساں میں تو سب کچھ عین ممکن ہے
جو ہر حد سے گزر جائے اسے دلدار کہتے ہیں

(ص:47)

وہ حرمتِ عدل کی قائل ہیں اور انصاف پر کسی نوع کے سمجھوتے کی روادار نہیں ہیں۔وہ اس امر سے بخوبی آشنا ہیں کہ انصاف ہی کی بدولت سماجی ناہمواریوں سے بطریقِ احسن بچا جا سکتا ہے۔

حرمتِ عدل پر نہ آنچ آئے
دل ترازو اُدھر نہ جھک جائے

ان کا فکری کینوس وسعت آمیز ہے جس سے ان کا پندارِانا واضح طور پر چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ایک خودی ہے،ایک خوداعتمادی ہے،ایک خودانحصاری ہے،جو بین الشعر کارفرما ہے۔یہی فکری کیفیت شعر ھذا میں بھی ہے۔جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے جس کا عروضی وزن ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' ہے۔

زمیں پر ہیں قدم جبکہ نگاہیں آسماں پر ہیں
ہمیشہ ہی نظر کی وسعتوں کے ساتھ رہنا ہے

(ص:55)

شاہدہ لطیف کی شعریات میں حقیقت، زندگی اور محبت کی فکری تثلیث کارگر ہے جو ذات و کائنات کے مرکزی تلازمات پر محیط ہے۔ ان عناصرِ ثلاثہ کو ان کے شعری بیانیے میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس حوالے سے ان کے افکار ان کی شاعری کو مقبول و ہر دلعزیز بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

کبھی سوچا ہے یہ تم نے کہ حقیقت کیا ہے؟
زیست کہتے ہیں کسے حرفِ محبت کیا ہے؟

(ص:77)

ان کے ہاں بیم و یاس کی کیفیات معدوم ہیں۔ ہاں البتہ حزنیہ افکار ضرور پائے جاتے ہیں جو زیست کی مقتضیات سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک احساسِ طرب ہے جو بین الشعر کارفرما ہے۔ ایک خوشگواری اور لطافت کا احساس ان کے کلام کی قرات کے دوران واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ زیست کے مصائب و آلام کو خاطر میں نہیں لاتی۔

دیں اپنے حوصلوں کو کچھ ایسی لطافتیں
رنج و غمِ حیات بھلاتے چلے گئے

(ص:79)

ناہموار سماجی رویوں کا انہیں شدید قلق ہوتا ہے۔ وہ ناجائز طریقہ ہائے کار سے مقام و مرتبے کو حاصل کرنے کی قائل نہیں ہیں کیونکہ اس سے ناانصافی جنم لیتی ہے۔ پھر معاشرہ تباہی و بربادی کے دہانے پر جا پہنچتا ہے۔ ایسی تہذیبیں نیست و نابود ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ جہاں ان کی فکری حساسیت ہے۔ وہاں وہ ایسے موضوعات کو مس کرنے کا ملکہ بھی رکھتی ہیں۔

انہیں نصیب ہوئیں پھر بھی منزلیں کیا کیا ؟
رہے سفر میں نہ شامل وہ کارواں میں رہے

(ص:93)

ان کی شاعری میں آفاقیت کا عنصر انہیں ہمہ گیری عطا کرتا ہے جہاں کسی نوع کا لسانی، جغرافیائی اور مذہبی و نسلی تعصب روا نہیں ہے۔ ان کے ہاں محبتوں کی حوصلہ افزائی اور نفرت و کدورت کی مذمت کا پہلو بڑے خوب صورت پیرائے میں ملتا ہے۔

گر ہو سکے تو جیتیے دل سارے شہر کے
لیکن کبھی کسی سے عداوت نہ کیجئے

(ص:103)

وہ ایک ارتقائی سوچ کی حامل ہیں۔ ان میں آگے بڑھنے کی خو ہے جو انہیں محوِ تگ و تاز رکھتی ہے کیونکہ وہ جتنا کچھ حاصل کرتی ہیں۔ اتنی ہی خواہش کرتی ہیں۔ وہ ستاروں سے بھی بلند پرواز رکھتی ہیں اور دنیائے رنگ و بو پر قناعت کرنا ان کا شیوہ نہیں ہے۔

پرواز شاہدؔہ ستاروں سے بھی بلند
دنیائے رنگ و بو پہ قناعت نہ کیجئے

(ص:103)

شاہدؔہ لطیف کے ہاں اچھوتے اور نادر الغظیر موضوعات پائے جاتے ہیں۔ فکری حوالے سے وہ بنی بنائی ڈگر پر چلنے کی روادار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کا تخیل نئی منزلوں کا متلاشی رہتا ہے۔ ان کی غزل کا یہ مطلع اسی نوعیت کا غماز ہے جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے۔

اب ہم ان کے چھٹے شعری مجموعہ ''اف یہ برطانیہ'' مطبوعہ فروری 2009ء کے توسط سے شذرہ ھذا کے نفسِ مضمون کو سوئے منزل لیے چلتے ہیں۔ واضح رہے کہ مجموعہ ھذا ان کا برطانیہ کا منظوم سفر نامہ ہے جس میں غزلیات و نظمیات شامل ہیں۔ نظمیات کے شعبے میں مختلف ہیئتی تجارب جلوہ نما نظر آتے ہیں جو ان کے فن پر دسترس ہونے کی دلیل بھی ہے۔

اگر ہم مسئلہ جبر و قدر کے حوالے سے بات کریں تو کچھ بے جا نہ ہو گا۔ شاہدؔہ لطیف کے فحوائے شعری میں جبری عناصر کی بجائے قدری عوامل کی فزوں تر عملداری ملتی ہے۔ اس نوعیت کا کلام قاری کے لیے حوصلہ افزا ہوا کرتا ہے کیونکہ یہ موضوع نظریہ ادب برائے زندگی کی ترجمانی

سے مربوط ہے جو قاری کو ایک نیا عزم و حوصلہ اور زندگی کی نئی شکتی دیتا ہے۔ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں جو بحر متقارب مثمن سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان ''فعولن فعولن فعولن فعولن'' ہیں۔

زمان و مکان دسترس میں ہیں گویا
ہتھیلی پہ سب کچھ عیاں دیکھتے ہیں

(ص:14)

ان کے ادراکات میں ایک وضع داری، تہذیبی رکھ رکھاؤ، پندارِ انا اور مضبوط نوعیت کا حصارِ ضبط محسوس ہوتا ہے جو ان کی تمام تر کامیابیوں پر محیط ہے جس میں راز داری کا پہلو بھی ہے۔

سفر سے پہلے کہیں بادباں نہیں کھلتے
ہم اتنی جلدی مرے مہرباں نہیں کھلتے

(ص:15)

شاہدہ لطیف انسانی نفسیات کا عمیق ادراک رکھتی ہیں۔وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ بیرونِ ملک جانے کا شوق اکثر لوگوں کو ہوتا ہے۔ان کا موقف یہ ہے کہ انسان میں حب الوطنی بھی ناگزیر ہے کیونکہ دیش بھگتی ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کی شخصیت کی نمو میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

بیرونِ ملک جانے کے شوقین ہیں سبھی
لیکن دلوں میں دیس کی الفت بھی چاہیے

(ص:30)

ان کا طرزِ سخن منفرد نوعیت کا ہے اور یہ انفرادیت فکری وفنی اور لسانی ہر لحاظ سے ہے۔ان کی فکر واسلوب میں کلاسیکیت کے خصائص نمایاں ہیں اور وہ اس امر کا بخوبی ادراک رکھتی ہیں۔بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ مطلع اس تناظر کی ترجمانی سے مربوط ہے جس کا عروضی وزن ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'' ہے۔

ہے مرا رنگِ سخن رنگِ بیاں کچھ مختلف
یہ نشاطِ دلبری ، طرزِ فغاں کچھ مختلف

(ص:73)

انہوں نے اپنی زندگی ادب کے لیے وقف کی ہوئی ہے اور ادب کی خدمت کو شوقِ سفر سے تعبیر کرتی ہیں جس کا ثمر انہیں ادب سے مقبولیت و پذیرائی کی صورت میں ملا ہے۔ وہ ادب کی خدمت کو روح کی ریاضت کا درجہ دیتی ہیں۔ اسی سیلِ شوق ہی کی بدولت ان کا تخلیقی ارتقا ہے جسے اہلِ عصر نگاہِ رشک سے دیکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی ایک غزل کا مطلع ہے جو بحر ہزج مثمن محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

ہمیشہ فکرِ ہنر کو دیکھتے ہیں
ہم اپنی راہ میں شوقِ سفر کو دیکھتے ہیں

(ص:74)

ان کی حب الوطنی کا یہ عالم ہے کہ وہ بدیسی خوب صورتیوں اور مناظر سے زیادہ مرعوب نہیں ہوتیں۔ وطن کی یاد انہیں ایک تسلسل سے کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ ان کا جذبۂ حب الوطنی نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ بحرِ اوفر مثمن سالم میں کہی گئی ان کی یہ غزل اسی احساس کا مظہر ہے۔ اس کا عروضی وزن ''مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن مفعولاتن'' ہے۔

ہم کو دریا، جھیل، سمندر اور کنارے یاد آتے ہیں
دور دیس میں آ کے ہم کو اپنے پیارے یاد آتے ہیں
مانا یہ شفاف فضائیں اور ہوائیں تازہ دم
لیکن دیس کا چاند فلک اور جھلمل تارے یاد آتے ہیں
دریا اور سمندر سارے، سبزہ گاہیں اور یہ جلوے
خوب ہیں لیکن ہم کو اپنے دیس نظارے یاد آتے ہیں
گو کہ ٹیمز کنارے رنگ بہ رنگے پرندے بھی ہوتے ہیں

دریا راوی، جہلم، ستلج، سندھ کے دھارے یاد آتے ہیں
بے شک ہم وطنوں نے ہم کو عزت بہت زیادہ دی ہے
لیکن لمحہ لمحہ ہم کو اپنے سارے یاد آتے ہیں

(ص:76)

شاہدہ لطیف کے فحوائے بیان میں فکری وفنی اعتبار سے ایک تسلسل کے ساتھ ارتقا کا عمل پایا جاتا ہے۔عصری رویوں کا ادراک ان کی فکریات کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ عہدِ موجود کی مقتضیات سے بخوبی آشنا ہیں۔فکری حوالے سے ان کی گہرائی و گیرائی کے خصائص کارفرما ہیں۔ وہ اپنی تہذیب وثقافت سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ وہ خود کو مغربی تہذیبی یلغار سے محفوظ و مامون خیال کرتی ہیں۔اپنی اقدار وروایات انہیں عزیز از دل وجاں ہیں۔گویا اپنی دھرتی کی بو باس انہیں اپنی مکمل گرفت میں رکھتی ہے۔

شوقِ سفر میں تھے کہیں اک رہ گزر میں تھے
ہم تو فصیلِ وقت کے بابِ ہنر میں تھے
تھامے ہوئے تھے وقت کی نبضیں کہیں پہ ہم
لیکن کہیں پہ وقت کے دیوار و در میں تھے
گرچہ فلک کے اس طرف اپنی اڑان تھی
لیکن ہمارے سلسلے تو بحر و بر میں تھے
ہم پر طلسم کوئی نہ مغرب کا چل سکا
آخر ہم اپنی خاک کے گہرے اثر میں تھے
اے وقت تیرے ساتھ تھے ہر گام ہر گھڑی
کچھ لوگ تو فقط ترے شام و سحر میں تھے

(ص:93)

وہ عصری آشوب کی ہولناکیوں کے باعث محوِ حیرت و استعجاب ہیں اور وہ اپنے دور کی

پیچیدگیوں کا بخوبی ادراک رکھتی ہیں۔اہلِ زمانہ کا چلن ایسا ہے۔خیر وشر میں تمیز کرنا بھی ایک کارِ دشوار ہے۔وہ اپنے پیمانہءشعر میں اپنے قاری کو زیادہ سے زیادہ ترسیلِ شعور کرنا چاہتی ہیں۔وہ خود بھی باخبر اور اہلِ احتیاط ہیں اور قاری سے بھی یہی توقعات رکھتی ہیں۔بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ مقطع قابلِ غورہ جس کے عروضی ارکان ''مفاعیلن مفاعیلن فعولن'' ہیں۔

یہ کیسا دور آیا شاہدہ جی

ہے اب پہچان خیر و شر میں

(ص:99)

شاہدہ لطیف خدا کی ذاتِ بابرکات پر مکمل یقین رکھتی ہیں۔توکل باللہ ان کی فکر کا مرکزی نکتہ ہے۔ان کے ہاں تصوف ومعرفت کے وسیع تر امکانات موجود ہیں۔تصوف کے حوالے سے ان کے ہاں دونوں نظریات یعنی ''ہمہ اوست'' اور ''ہمہ از اوست'' کی پرچھائیاں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ان کے شعری بیانیے میں صنعتِ ایہام کا التزام بہ حسن وخوبی ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے فحوائے بیان میں معرفت ومجاز کے تلازمات باہم مربوط ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

مرا یقین مرا حرفِ معتبر تو ہے
وفا کی منزلِ آخر کی رہ گزر تو ہے
انا کی دھوپ ہے اور سر پہ سائباں بھی نہیں
میں اک مسافرِ تنہا ہوں، میرا گھر تو ہے
مسافتیں ہیں کٹھن پھر بھی اعتماد بہت
جہاں میں جاؤں مرے ساتھ ہم سفر تو ہے
اساس تجھ سے ہے بے شک نگارِ ہستی کی
مرا وجود عمارت ہے بام و در تو ہے
میں اک شکستہ سفینہ ہوں بحرِ ہستی میں

بچانے والی کوئی ذات سر بہ سر تو ہے
مری حیاتِ گزشتہ، مجھے تعجب ہے
کہ داستاں ہے مگر کتنی مختصر تو ہے
مری تلاش میں دنیا ہے ارد گرد مرے
تجھے خبر ہے کہاں ہوں، مری خبر تو ہے

(ص:122)

مذکورہ استشہادات واستخراجات اور تصریحات شاہد ہیں کہ شاہدہ لطیف کا شعری بیانیہ بے پناہ وسعتوں کا حامل ہے جس میں فکری وفنی اور لسانی ندرتیں کارفرما ہیں۔ انہوں نے حیات و کائنات کے بیشتر شعبوں کی انتہائی عمدگی سے نمائندگی کی ہے۔ انہوں نے اپنی شعریات میں سماج کے تمام طبقوں کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے سخن میں صنائع وبدائع اور رموز و وقائع کا التزام بہ حسن و خوبی پایا جاتا ہے۔ اسلوبیاتی حوالے سے ان کے ہاں مختلف النوع ندرتیں کارفرما ہیں۔ انہوں نے ہر ذہنی سطح کے قاری کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ ان کے ہاں ہیئتی تجارب کامیابی کے پیرائے میں ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں معروضیت ومعقولیت اور منطقیت و آفاقیت کے خصائص پائے جاتے ہیں جن کی بدولت وہ ملکی شعری منظرنامے پر نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا تخلیقی ارتقا تواتر سے جاری وساری ہے۔ فکروفن کے نئے اعماق و آفاق کے ابواب وا ہو رہے ہیں۔ ان کی تخلیقی مسافت خلوص، لگن اور ریاضت کے عناصرِ ثلاثہ سے مربوط ہے۔ مادیت پسندی کے اس دور میں شعروادب کی اس قدر خدمت یقیناً لائقِ تحسین وستائش ہے۔ اگر وہ میدانِ شعر میں اسی طرح اپنی کشیدِ جاں لٹاتی رہیں تو ہمیں یقین واعتماد کی فضا میں اس امر کے اظہار میں کوئی باک نہیں ہے کہ آنے والا دور یقیناً شاہدہ لطیف کا ہوگا۔

تمت بالخیر

شبیر ناقدؔ کی گراں قدر تخلیقی تصانیف

شاعری کی مطبوعہ کتب:

1-صلیبِ شعور (غزلیات ونظمیات)	2007ء
2-من دی مسجد (سرائیکی شاعری)	2010ء
3-آہنگِ خاطر (غزلیات ونظمیات، گیت، قطعات)	2011ء
4-جادۂ فکر (غزلیات ونظمیات)	2014ء
5-صبحِ کاوش (غزلیات، نظمیات)	2015ء
6-دل سے دور نہیں ہو تم (غزلیات ونظمیات)	2016ء
7-کتابِ وفا (مجموعہ غزل)	2016ء
8-گنجِ آگہی (مجموعۂ غزل)	2016ء
9-روح دی روہی (سرائیکی شاعری)	2016ء
10-جہانِ عقل وجنوں (اردو شاعری)	2017ء
11-زادِ سخن (اردو شاعری)	2017ء
12-حسنِ خیال (اردو شاعری)	2018ء

13۔رتجگوں کا سفر (اردو شاعری) 2018ء

14۔طرزِ بیاں (اردو شاعری) 2018ء

15۔عکاسِ احساس (اردو شاعری) 2018ء

16۔نقدِ فکر و نظر (غزل و نظم) 2019ء

17۔ریاضِ دانش (مجموعۂ غزل) 2019ء

18۔ضیافتِ اطفال (بچوں کیلیئے شاعری) 2019ء

19۔شہرِ سخن (مجموعۂ کلام) 2019ء

20۔نوائے شوق (مجموعۂ کلام) 2021ء

21۔سک داسیک (سرائیکی مجموعۂ کلام) 2022ء

گراں قدر تحقیقی و تنقیدی مطبوعہ کتب:

1-ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیف غزل (شخصیت اور فن) 2013ء

2-شاعراتِ ارض پاک (حصہ اول) تنقیدی مضامین و منتخب کلام 2013ء

3-شاعراتِ ارض پاک حصہ دوم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام 2013ء

4-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ سوم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام 2013ء

5-نقدِ فن (تنقیدی مضامین) 2014ء

6-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ چہارم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام 2014ء

7-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ پنجم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام 2015ء

8-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ ششم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام 2015ء

9۔شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ ہفتم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام 2016ء

10۔تلمیحاتِ فضا اعظمی (تنقید و تحقیق) 2016ء

11-شاعراتِ ارضِ پاک جامع ایڈیشن (حصہ اول) 2016ء

12۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منشورِ نظم (نظمیاتی تجزیہ) 2016ء

13-میزان تنقید (تنقیدی مضامین) 2017ء

14-تنقیدات (تنقیدی مضامین) 2018ء

15۔سفرنامہ نگاری کے انتقادی امکانات (حصہ اول) 2018ء

16۔شاعراتِ ارضِ پاک (جامع ایڈیشن) جلد دوم 2018ء

17۔فضا اعظمی کی شاعری (تلمیحات کے آئینے میں) اضافہ شدہ ایڈیشن 2019ء

18۔تناظرات (تحقیق و تنقید) 2022ء

19۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا آئینۂ فکر و فن (تحقیق و تنقید) 2022ء

20۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے تخلیقی خدوخال (تحقیق و تنقید) 2022ء

21۔شاہدہ لطیف کا تخلیقی ارتقا (تحقیقی و تنقیدی تجزیاتی مطالعہ) 2023ء